افادات مہدی

جنابہ مہدی بیگم صاحبہ

:- ملنے کا پتہ :-

سلطان بک ڈپو کالی کمان حیدرآباد

قیمت 12/- 1975ء

افادات مہدی

یعنی

نامور انشاپرداز ایم مہدی حسن مرحوم "افادی الاقتصادی" کا

مجموعۂ مضامین

مع مقدمہ و سوانح مصنف و ضمیمہ جات

مرتبہ

مہدی بیگم

الیاس بکڈپو شاہ علی بنڈہ حیدرآباد

فہرست مضامین

دیباچہ

از

(مولانا عبدالماجد صاحب بی۔اے)

حضرت مہدیؔ کی شخصیت و مرتبہ انشا پردازی پر جو جو کچھ عرض کرنا تھا اُسے اس تعزیت نامہ میں عرض کر چکا ہوں، جو انکی وفات پر اخبار "ہمدم" لکھنؤ میں شائع ہوا تھا اور جس کی نقل اس مجموعے کے آخر میں شامل کر دی گئی ہے، یہاں اس مجموعے سے متعلق مختصراً چند اُمور گزارش کرتے ہیں۔

۱۔ یہ مجموعۂ اوراق کوئی مرتب کتاب نہیں، متفرق مضامین یکجا کر دیئے گئے ہیں، اس لئے قدرتاً اس میں ترتیب و تالیف کے وہ خصوصیات مفقود ہیں، جن کی توقع ہر مرتب کتاب سے ہو سکتی ہے، تکرار عبارت کی متعدد مثالیں ملیں گی۔ ایسے مسائل بکثرت ملیں گے جن کی اہمیت ہنگامی اور شہرت وقتی تھی، وقس علیٰ ہٰذا،

۲۔ تحریر مضامین کا رقبۂ مدت بیس[۲] سال تک وسیع ہے، یعنی ۱۸۹۹ء سے ۱۹۱۹ء تک۔ اس طویل مدت میں انقلابات دہر کے ساتھ خود صاحب مضامین کے خیالات و طرزِ ادا میں انقلاب ہونا ناگزیر تھا، چنانچہ اہلِ نظر کو اس کے شواہد ملیں گے اور یہ خصوصیت تو بہت نمایاں ہے کہ آخری مضامین صحتِ زبان، لطافتِ خیال، پختگی ترکیب، متانتِ بیان، شوخی ادا، ہر حیثیت سے مضامین سابق

سے ممتاز ہیں۔

۳ ۔ مضامین عموماً اپنے راقم کے اصلی نام کے ساتھ شائع ہوئے تھے، لیکن اس مجموعہ میں چار ایسے مضامین بھی شامل کر دیئے گئے ہیں جو فرضی ناموں کے ساتھ نکلے تھے۔

۴ ۔ بعض مضامین کی شوخیاں سنجیدگیِ ادب کے حدود سے متجاوز نظر آئیں گی، اس کا کھلا ہوا جواب یہ ہے کہ حضرت مہدیؔ معلمِ اخلاق نہ تھے۔ ادیب و انشاپرداز تھے، اور جب شاعر کے لئے "برہنہ رقاصی" کا جواز بڑے بڑے ثقاوت نے تسلیم کر لیا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس نثر کے شاعریہ "انشائے عریاں" حرام رہے۔

۵ ۔ مرحوم کے ادبی بلوغ کا زمانہ انیسویں صدی عیسوی کا ربعِ آخر اور بیسویں صدی کا عشرۂ اوّل تھا، جو ہندی مسلمانوں کے دل و دماغ پر مغربیت کے غلبہ و تسلط کا خاص زمانہ تھا اور "اقبال سرکار" "برکات تمدن" "برکات علوم جدیدہ" وغیرہ کا جو صور سر سید احمد خاں مرحوم اور ان کے رفقا پھونک گئے تھے، اس کی غشی تقریباً سارے اسلام ہند پر طاری تھی۔ اس مرعوبیت کے نمونے اوراق آئندہ میں جا بجا ملیں گے۔ افسوس ہے کہ مہدی مرحوم کی عمر نے وفا نہ کی۔ اگر چند سال اور وہ زندہ رہ جاتے تو مجھے یقین کامل ہے کہ ان گمراہیوں کا کفّارہ وہ خود اپنے قلم سے کر جاتے ان کے مزاج میں ضد بالکل نہ تھی، جب کسی مسئلہ کی معقولیت ان پر ثابت کر دی جاتی تو اپنی سابق رائے سے رجوع کر لیتے اور جدید عقیدہ کے اختیار کر لینے میں انھیں مطلق تامّل نہ ہوتا۔

۶ ۔ مرحوم کی سب سے نمایاں خصوصیتِ اخلاقی ان کی فراخدلی تھی۔ خاندانِ ادب میں اپنے بزرگوں کی تعظیم و تکریم تو وہ اپنا فرض سمجھتے ہی تھے، بعض اوقات اپنے

خود اُن پر اس افراط و فیاضی کے ساتھ عنایت و شفقت کرنے لگتے تھے کہ انھیں محجوب ہونا پڑتا تھا، اس مجموعہ میں کثرت سے ایسے موقعے آتے ہیں جہاں انھوں نے اپنے بعض نومشق و نوآموز معاصرین کا استقبال نہایت گرم جوشی سے کیا ہے۔ یہ وصف اربابِ ادب میں عموماً اس قدر عنقا ہو گیا ہے کہ راقم سطور کے علم میں دورِ حاضرہ کے کسی دوسرے اہلِ قلم کو اس حیثیت سے ہندی کا ہمسر نہیں بتایا جاسکتا۔

۷۔ غلطیاں اور لغزشیں لازمۂ بشریت ہیں، یہ کہنا کہ اوراق آئندہ زبان و انشا کی غلطیوں سے پاک ہیں، ایک بے مزہ غلط بیانی کرنا ہے تاہم اِنَّ الحَسَنَاتِ یذْھِبْنَ السَّیِّئَات کے خدائی قانون کے مطابق انسان کی عظمت کا معیار اس کے محاسن و فضائل کی کثرت ہے اور اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اس مجموعہ کے مولف کو اُردو زبان کا ایک قابلِ قدر خدمت گزار اور انشا پرداز ماننے پر مجبور ہونا پڑے گا۔ "آدھ گھنٹہ علامہ شبلی کے ساتھ" "غیر ستایشی جنبشِ لب" اس قسم کی کثیر التعداد انگریزی ترکیبوں کو اُردو خواں طبقہ کے لئے مانوس بنا دینا انہی کا کام تھا ذیل کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں، حسنِ بیان ان پر ناز کرتا ہے اور لطفِ انشا، ان پر جھومتا ہے،

"غالب زندہ ہوتے تو شبلی کو اپنی "اُردوے" خاصہ کی داد ملتی جس نے ایک نوخیز بازاری یعنی کل کی چھوکری کو جس پر انگلیاں اٹھتی تھیں آج اس لائق کر دیا کہ وہ اپنی بڑی بوڑھیوں اور ثقہ بہنوں یعنی دنیا کی علمی زبانوں سے آنکھیں ملا سکتی ہے جو اینوں پہ آئی ہوئی بجلی نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ مدتوں شعرا سے گاڑھا اتحاد رہا سن بڑی طرح کھل کھیلی، ہاتھ پاؤں نکالے، اور بہتیرے بنائے بگاڑے، کیونکہ

ایک زمانہ شیدائی تھا، لیکن یہ باتوں ہی باتوں میں سب کو ٹالتی رہی، بعض جگہ بے آبرو ی کے ساماں ہو ہو کر رہ گئے اور بال بال بچی، آخر آخر میں ملک کے منچلے یعنی ناول تو یہاں تک ہاتھ دھو کر پیچھے پڑے کہ اس کی پردہ دری میں کچھ اٹھا نہیں رکھا تھا، کبھی کبھی دبی زبان سے اسے یہ کہتے سنا،

"اری اُٹھ جاؤں گی میں صحنک سے"

لیکن دفعتاً اس کی حالت نے پلٹا کھایا، کثرتِ خواہش باعثِ سنجیدگی ہوگئی، اچھے دن آتے ہیں تو بگڑی بن جاتی ہے، اب وہ مقدس علمار کی کنیزوں میں داخل ہے، لیکن سنا گیا ہے کہ خوش اوصاف شبلی سے زیادہ مانوس ہے، اور قریب قریب ان ہی کے تصرف میں رہتی ہے، "الندوہ" اسی کا ایک ثمر بیش رس ہے۔" (ص ۷۹ تا ۸۰)

"علمِ کلام کو عباسی دور کے دماغی ترقیات کے لحاظ سے "یادِ ایام" سمجھئے جو عقائدِ اسلام اور فلسفۂ قدیم کے گزشتہ اختلاط کی ادبی تاریخ ہے، لیکن اس زمانہ میں اسلام کو صرف فلسفہ یعنی ایک حد تک محض اصولِ فطری سے سابقہ تھا۔ اس لئے جس طرح لحاف کی تیاری میں کچھ استر سے لیا اور کچھ ابرہ سے اور دونوں کا جھول جھال لیکر برابر کر دیا دونوں حریف جو چھری کٹاری ہو رہے تھے گلے ملوا دیئے گئے، لیکن آج مذہب اپنے دشمنِ ازلی یعنی سائنس کا مقابلہ کرتا ہے جو قوی تر حریف ہے اور جو اپنے سوا دنیا میں کسی کو دیکھنا نہیں چاہتا، مذہب کے اولیات کا انحصار کلیتہً امورِ غیر مادی یعنی ایسی چیزوں پر ہے جو سرے سے مدرکاتِ انسانی سے باہر ہیں، یعنی ہمارے قوائے فطری اِن کے سمجھنے بوجھنے سے عاری ہیں، اور سائنس صرف مادیت سے غرض نہیں رکھتا بلکہ اس کا دعوٰی ہے کہ عالم غیر کا خیر سے وجود ہی نہیں جس پر ہم آپ اس قدر مٹے ہوئے

ہیں۔ بہرحال فلسفہ پھر بھی اتنا برا نہیں کہ "سنی سنائی" بھی کبھی مان لیتا ہے، لیکن سائنس اتنا کٹر ہے کہ جب تک "آنکھوں دیکھی نہ ہو ہزار کہیئے، کتنے ہی بڑے بڑے جبہ و دستار پیش کیجیے، مذہب کی دہائی دیجیے، ایک نہیں سنتا، ظاہر ہے کہ اتنا بڑا کفر بر خود غلط کسی شریعت سہلہ" کی گرفت میں کہاں تک آسکتا ہے؟ (ص ۱۷۹ تا ۱۸۰)

"جس طرح تاریخ میں فلسفہ کا رنگ سب سے پہلے شبلی نے چمکایا ہے، اُردو کو انشاپردازی کے درجے پر جس نے پہنچایا وہ آزاد اور صرف آزاد ہیں، اور گو اس مسئلے پر بھی کافی توجہ نہیں کی گئی ہے، لیکن آزاد کی ادبی فتوحات تاریخ لٹریچر کا ایک واقعہ ہے، جس کا فیصلہ خود فلسفۂ ادب کے ہاتھوں ہوگا، جن حضرات کی نگاہیں دلّی، لکھنو کے اختلافات تک محدود ہیں، یا جن کی ظاہر النظری میرے اس خیال کی تائید کی مانع ہو وہ مجھے معاف فرمائیں گے اگر میں بلاخوفِ تردید یہ عرض کروں کہ پروفیسر آزاد کا درجہ بہ حیثیت ادیب جو کچھ ہے اس کا سمجھنا دوم درجہ کی خلقت کے لئے جو فلسفہ لٹریچر سے قطعاً بیگانہ ہے۔ آسان نہیں ہے، اس لئے کئی اختلافی بحث کا یہ چھیڑنا "گول خانہ میں چوکھنٹی چیز" سے بھی زیادہ گیا گزرا ہوگا۔

"سرسید" سے معقولات، الگ کر لیجئے تو کچھ نہیں رہتے، "نذیر احمد" بغیر مذہب کے لقمہ نہیں توڑ سکتے، "شبلی" سے "تاریخ" لے لیجئے تو قریب قریب کورے رہ جائیں گے "حالی" بھی جہاں تک "نثر" کا تعلق ہے سوانح نگاری کے ساتھ چل سکتے ہیں۔ لیکن "آقائے اُردو" یعنی پروفیسر آزاد صرف انشاپرداز ہیں جن کو کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں، اسی لئے واقعات بھی انھوں نے جس قدر لکھے ہیں "قصص" یعنی ٹیلز کی حیثیت رکھتے ہیں، جنھیں "افسانۂ یارانِ کہن" سمجھئے۔ (ص ۲۲۷)

"سچ کہئے عذرا، واقعی بہت حسین ہے؟ حسین تو ایک معمولی اور سرسری لفظ ہے، عورتیں تو سبھی اپنی اپنی جگہ حسین ہوتی ہیں لیکن میں اپنے تخیل میں اوروں سے اسقدر مختلف ہوں کہ صرف گوشت پوست سے کام نہیں چلتا، عذرا میری عذرا! تو نظم زندگی یعنی پوری شاعری ہے، اس کی آواز کامل موسیقی، اس کا تبسّم میرا عنصر حیات ہے، وہ قطعاً توبہ شکن ہے۔ توبہ شکن اور کافر ایمان! ناممکن ہے کہ نظر پڑتے ہی اس پر قابو حاصل کرنے کو جی نہ چاہے۔ جہاں آنکھیں ملیں، بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمام جسم میں بجلی دوڑ گئی مدّت ہوئی جب میں پہلی نظر میں شہید ہوا۔ دل سے آواز آئی" خدایا خیر!" جس کا نتیجہ آج تک بھگت رہا ہوں، مجھ پر اتنا سخت وار کبھی نہیں ہوا، کچھ تو ہے جس کی وجہ سے مٹا ہوا ہوں، میری آنکھوں سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ لیکن خود مجھے نہیں معلوم کس ادائے خاص کا دلدادہ ہوں، پچھلی دفعہ بہت اتری ہوئی حالت میں دیکھا، پھر بھی ایک بات تھی۔ آج تک عالم تصویر آنکھوں میں پھر رہا ہے!" کیا عذرا آپ کے دل کا راز جانتی ہے؟ ہاں ہاں خوب جانتی ہے کہ میں اس پر مٹا ہوا ہوں۔ لیکن تم کو ہندستانی سوسائٹی کی حالت معلوم ہے! ہمارے ہاں جائز عشق کا پتہ نہیں، نہ جذبات قوت سے فعل میں آسکتے ہیں۔ یہ بات مہذب اقوام میں ہے کہ عقد سے پہلے بیگانگی نہیں رہتی، اس کا افسوس ہے کہ میں نے عذرا کے لئے ایک نئی خلش پیدا کردی، اور ایک ایسی فضائے بسیط پیش نظر کردی جس میں کانٹے ہی کانٹے ہیں برسوں کے فتنۂ خوابیدہ کو چھینٹے دے دے کر جگانا صریحی ظلم تھا۔ حصول آرزو جسے شعراء اپنی اصطلاح میں "وصل" کہتے ہیں ایک طرح کی خود غرضی ہے۔ انتظار و ناکامی میں ایک لذّتِ خاص ہے اور چونکہ مجھ کو عذرا کے ساتھ خالص روحانی تعلق ہے اس لئے گو وہ مجھے گلے کا ہار نہ بنا سکے

تاہم میں اس کی پرستش سے جیتے جی کبھی دست بردار نہ ہو سکوں گا، وقت گزر جائے گا، قصے رہ جائیں گے۔" (صفحہ ۱۵۸ تا ۱۵۹)

اگر یہ عبارتیں حسنِ انشا کا بہترین نمونہ نہیں تو مجھے نہیں معلوم انشاپردازی کا اطلاق کس شئے پر ہوگا۔

۸۔ انسان کے بننے اور بگڑنے میں بہت بڑا دخل گردوپیش کے اِن حالات وواقعات کا ہوتا ہے جنھیں عموماً "تقدیر" ہی کہا جاتا ہے، مہدی مرحوم کو شروع سے آخر تک حالات ناالف وناساعد سے سابقہ رہا۔ سرکاری ملازمت کے قیود، انتظامی عہدوں کی ذمہ داریاں علمی مرکزوں سے بعد مسافت، علمی صحبتوں کا قحط، یکسوئی واطمینان کا فقدان، ان تمام حالات نے کبھی اس کا موقع نہ دیا کہ وہ اپنے فطری جوہر کو پوری جلا دے سکیں، ورنہ کون کہہ سکتا ہے کہ اُردو کے لئے "آزاد" ثانی پیدا ہونا ناممکن تھا؟

۹۔ مجموعۂ ہذا کی نظرِ ثانی تو الگ رہی، اس کا تو مصنف کی موت نے امکان ہی نہیں باقی رکھا تھا۔ ترتیب، کتابت وغیرہ سے متعلق بھی افسوس ہے کہ متعدد نقائص باقی رہ گئے ہیں، جنھیں مصنف مرحوم کی نفاست پسندی ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں برداشت کر سکتی تھی۔ لیکن اس علم کے بعد کہ یہ سارا کام ایک غمزدہ پردہ نشین خاتون نے انجام دیا ہے کسی قسم کی نکتہ چینی کی ہمت نہیں باقی رہ جاتی، بلکہ سچ یہ ہے کہ اپنی ہمتِ مردانہ سے اتنا بھی جو انہوں نے کیا توقعات سے بہت زائد کیا ہے۔

۱۰۔ آخر میں بشری کمزوریوں سے واقفیت رکھنے والے خدائے کریم سے دعا ہے کہ وہ اپنی رحمت کاملہ کے سایہ میں مرحوم کو جگہ دے اور اُنکے نام کو بھلائی کے ساتھ روشن رکھے،

عبدالماجد، بی۔ اے
(مصنف فلسفۂ جذبات)

۸۔ جون ۱۹۲۳ء دریاباد بارہ بنکی

اِن کی یاد

جو انیس ہے تری یاد ہے جو شفیق ہے دِل زار ہے

آہ! کیا معلوم تھا کہ ایک روز یہ روح فرسا اور دلخراش فرض میں اپنے قلم سے ادا کروں گی۔

یادش بخیر اب سے ۸، ۹ مہینے پہلے میں اُن خوش نصیب بیویوں میں تھی جن کا وجود دُنیا میں بہت کم ہے۔ ہم دونوں کی صاف ستھری زندگی اور خاص طرح کی نفاست سے ایک جھونپڑا شش محل معلوم ہوتا تھا جس کے اندر ۲۴ گھنٹے شریفانہ مشاغل مجھے مصروف رکھتے تھے۔

اِن کی نفاست پسندی کا ساتھ دینا آسان نہ تھا، لیکن میں اُن کے اس خیال کی دِل سے عزت اور قدر کرتی تھی۔ اس لئے ان کی کتابوں اور خاص فرنیچر کی صفائی اپنے ہاتھوں سے کرنی، اپنا فخر سمجھتی تھی، اور اپنی تمام تر کوشش ان ہی باتوں پر صرف کرتی رہتی تھی۔ یہاں تک اہتمام رکھتی تھی کہ کم سے کم انکی موجودگی میں تمام گھر میں یعنی صحن میں بھی ایک تنکا کہیں نظر نہ آئے۔ (اور ماشاءاللہ چھوٹے

بچوں کے ہوتے ا ہر چیز قاعدے سے اپنی اپنی جگہ مقررہ پر رکھ دی تھی، چائے بھی
اپنے لوازم کے ساتھ پہلے ہی سے ایک چھوٹی میز پر لگا دی جاتی تھی، کیونکہ "وہ"
مجھے کاموں میں زیادہ مصروف دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے، اس لئے شام کے چار
بجتے بجتے، اِن سب سے فارغ ہو کر بس اِن کے ساتھ چائے میں شریک ہونے
کے لئے تیار ہو جاتی تھی۔

کچہری سے واپسی کے بعد گھر میں قدم رکھتے ہی کِھل جاتے تھے، اور وہ نہایت
قیمتی اور معنی خیز تبسّم میری تمام جسمانی اور دماغی محنتوں کا بہترین صلہ تھا، جو
ایک مہذب اور فدائی شوہر سے ایک شریف جاں نثار بیوی کو مِل سکتا تھا۔

اِس راز کو ہم دونوں اپنی اپنی جگہ سمجھتے تھے، میں یہ جانتی تھی کہ میں دُنیا
سے محروم ہو جاتی اگر مجھ کو اِن کی ہم خیالی اور ان کی با اصول شائستگی سے فائدہ
اُٹھانے کا موقع نہ ملتا۔ یہ ضرور ہے کہ مجھ میں فطری مادّہ موجود تھا لیکن جب
میدانِ عمل نہ ہو تو اچھّی سے اچھّی صفت بھی قوت سے فعل میں نہیں آسکتی ہیں
خوش تھی کہ میری زندگی کا مقصد صرف اِس لائقِ پرستش ہستی کی خواہشات
کا پورا کرنا ہے، اور جہاں میں اِن کی زندگی کے تمام صیغوں میں حصّہ لیتی رہتی تھی
میں ان کی توقعات بھی پوری کر سکی، جو بہ حیثیت ایک وفادار بیوی کے میرا بہترین
سرٹیفکٹ تھا اور "وہ" بھی خوب سمجھتے تھے کہ مجھے کس حد تک اُن کے
صرف حقوق ہی کی نہیں بلکہ ان کی نفاستوں اور نزاکتوں کی رعایت بھی مدّ نظر تھی۔

آہ! مجھے اس کھوئی ہوئی زندگی کی ایک برقی رو کہاں سے کہاں لے جا رہی
ہے ؎ "خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا"

آہ! اس لائق رشک زندگی کی تمام دلچسپیاں، اور وہ میری اصلی خوشیاں جس ذات سے وابستہ تھیں، اس دم کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئیں۔ اور اب خدا کی بھری دنیا میں میرے حصّے کا کچھ نہیں۔

آہ! اس قدر جلد موت کے ظالم ہاتھ نے ہم دونوں کو جدا کر دیا۔

لیکن روح کی طرح محبت بھی غیر فانی ہے، اس لئے اب بھی اس غیر فانی روح کی دائمی پرستش، جیتے جی میرا بہترین مشغلۂ ہستی ہے۔

لیکن جن کے خمیر میں فطرت نے جذبات کے احساس کا مادّہ سرے سے رکھا ہی نہیں، وہ اس دردِ دل کو کیا سمجھ سکتے ہیں۔

اب میں اِن کے منتشر مضامین کا مجموعہ شائع کرانا چاہتی ہوں، اسی کے ساتھ اِن کی ایک مختصر سوانح عمری لکھ کر اپنی چند سطریں بھی ان کے قیمتی لٹریچر میں شریک کرنا چاہتی ہوں۔ تاکہ مرنے کے بعد بھی اس حیثیت سے ایک باہمی یادگار دُنیا میں باقی رہ جائے۔

گو بزرگوں میں اب کوئی باقی نہیں رہا۔ اس لئے اِن کی پیدائش کا صحیح سنہ و سال یا بچپن کے زیادہ تر حالات معلوم نہیں ہو سکتے، تاہم جو کچھ وقتاً فوقتاً ان کی زبانی سنا، یا کبھی کی بڑوں سے سُنی سنائی باتیں جہاں تک ذہن میں محفوظ ہیں، اور اپنی حالتِ موجودہ کے لحاظ سے جو کچھ ممکن ہے لکھوں گی۔

وطن اور خاندان "وہ" خاص گورکھپور کے ایک اچھے شریف خاندان سے تھے، اُن کے والد شیخ حاجی علی حسن صاحب مرحوم، کورٹ انسپکٹر تھے، نہایت دیانتدار اور ایک معزز با اثر شخصیت رکھتے تھے۔ انگریز حکام میں آپ کو بہت کچھ رسوخ تھا،

پڑھنا، لکھنا، کھانا، ناشتہ، غسل، تفریح وغیرہ وغیرہ، ان سب میں وقت مقررہ کی پابندی کا بہت خیال رکھتے تھے،

شادی اور ملازمت جب وہ کوئی ۱۸ - ۱۹ سال کے تھے، اس وقت وطن ہی میں ایک خاندان سادات کی لڑکی سے شادی ہوئی۔

شادی کے کچھ ہی دنوں بعد ملازمت کا سلسلہ ۱۸۹۶ء میں شروع ہوا، یہ کچھ دنوں عاملانہ عہدوں پر چنار اور مرزاپور وغیرہ میں رہے، اس کے بعد نائب تحصیلداری کے عہدہ پر مقرر ہو کر بنارس آگئے۔

بیوی کی وفات اور بچوں کی پرورش مرحومہ نے ۲۰ - اپریل ۱۹۰۴ء کو وفات پائی اور تین اولادیں چھوڑیں، دو لڑکیاں۔ اور ایک لڑکا، بڑی لڑکی چھ برس کی تھی، اور دوسری ۴ برس کی، لڑکا احمد دو برس کا تھا۔

یہ حادثہ ان کے لئے کوئی معمولی نہیں تھا، اس پر ننھی جانوں کی پرورش، لیکن جس جاں نثاری اور وفاداری سے انھوں نے یادگاران رفیق کی پرورش اور اعلیٰ تربیت کی، اس کی نظیر اپنے وطن میں کیا، دس پانچ شہروں میں بھی شاہد ہی ملے ان کی اس صنف زندگی کے محاسن کو لفظوں میں ادا کرنا مشکل ہی نہیں، ناممکن ہے۔

اس واقعہ کے بعد ۱۹۰۷ء میں بنارس سے تبدیل ہو کر الہ آباد آئے اور پانچ چھ برس تک برابر صدر تحصیل میں رہے۔

تحصیلداری کا سلسلہ اور الہ آباد کی بڑی نمائش ۱۹۰۹ء میں تحصیلداری کی قائم مقامیوں کا سلسلہ شروع ہوا، اور الہ آباد کی بڑی نمائش کے زمانہ میں

چھ مہینے تک مسلسل صدر تحصیلدار رہے۔ اس زمانے میں گورنمنٹ کے بڑے بڑے مہمان آئے گئے اور انتظام کا جس قدر حصہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ اسے نہایت خوش سلیقگی اور عمدگی سے انہوں نے انجام دیا۔

اسی زمانے میں ولی عہد جرمنی بھی آئے تھے، اسی سلسلہ میں انہوں نے اپنے حسنِ خدمات کے صلہ میں شاہزادہ جرمنی سے ایک طلائی تمغہ بھی پایا تھا۔

تعلقاتِ احباب

ان کو بالطبع غیر شریفانہ مشاغل سے دلچسپی نہیں تھی، اس لئے عام لوگوں سے علیحدگی رہتی ہے۔

وہ صرف ایسے شخص سے دوستی رکھ سکتے تھے جو اصولاً، اخلاقاً، عقلاً، اس قابل ہوتا، اسی کے ساتھ اس کا علم دوست ہونا ضروری تھا۔ اسی وجہ سے وطن میں بھی ان کا دائرۂ احباب وسیع نہیں تھا، تاہم کافی تھا" وہ "اپنے دوستوں کے ساتھ ہمیشہ خاص طرح کا خلوص۔ وضعداری اور یک رنگی رکھتے تھے، جسے آخر وقت تک نبھاہا۔

علمی اور پاکیزہ لٹریچر سے خاص اُنس

انگریزی کے ساتھ عربی اور فارسی کے بھی بڑے شائق تھے اسلامی لٹریچر اور متعلقات پر یورپ میں جو تصانیف انگریزی یا کسی مشرقی زبان میں شائع ہوتی تھیں وہ خصوصیت کے ساتھ ان کے پیشِ نظر رہتی تھیں،

آج ان کی لائبریری بہترین لٹریچروں کا مجموعہ ہے۔ اس کے ہمیشہ متلاشی رہتے تھے کہ کون کون سی کتابیں نئی چھپنے والی ہیں۔

اِس کا بہت اہتمام رہتا کہ نئی تصانیف سب سے پہلے ان کے پاس پہنچیں۔ جس کے لئے بڑی بڑی دکانوں اور بک ایجنسیوں میں ان کا آرڈر پہلے ہی سے رہا کرتا

تھا۔ کوئی مہینہ ایسا نہیں گزرتا تھا، کہ ان کی تنخواہ کا ایک معقول حصہ کتابوں کی خریداری اور اس کی جلد بندی وغیرہ میں صرف نہ ہوتا ہو، بقول بھائی عبدالماجد صاحب کے "ان معاملات میں مرحوم وہ اہتمام کرتے تھے، جو خود مصنف سے بھی نہ بن پڑتا"

نائب تحصیلداری کے زمانے میں بھی انھوں نے اپنے اس شوق کو خوبی کے ساتھ نباہا۔

اُردو لٹریچر کا نہایت لطیف اور صحیح مذاق رکھتے تھے، اور انشا پردازی تو گویا ان کا حصہ تھی۔

کتب بینی / کتب بینی ان کے لئے شرطِ حیات تھی۔ معمولاً شب کے چند گھنٹے پڑھنے میں ضرور صرف کرتے، اور اُسے تمام دن کی دماغی محنتوں کا بہترین معاوضہ سمجھتے تھے۔ جس روز کوئی نئی کتاب نہ ہوتی تو پرانی ہی کتابوں کو دیکھتے۔

ان کی لائبریری میں جتنی کتابیں ہیں وہ سب بارہا انکی نگاہ سے گذر چکی ہیں تواترِ مطالعہ سے کتابوں کے خاص خاص حصے ان کو حفظ ہو گئے تھے۔

پڑھنے کی رفتار بہت تیز تھی، ضخیم سے ضخیم کتاب دو نشست میں ختم کر دیتے تھے۔ کتابیں اس قدر ان کو عزیز تھیں کہ زمانہ علالت میں بھی وہ ان سے قطع نظر نہیں کر سکتے تھے۔

لکھنؤ میں جیسے ہی طبیعت ذرا سنبھلی۔ انہوں نے پہلی درخواست جو اسیر احسن صاحب سے کی، وہ یہ تھی "کیا اب میں کتابیں پڑھ سکتا ہوں"۔ اس پر صاحب بے اختیار ہنس پڑے، اور جواب ان کی خواہش کے مطابق دیا، جس سے اُنکو خاص مسرت ہوئی۔

اس حالت میں بھی وہ ایک بکس منتخب کتابوں کا ڈیرا پور سے اپنے ساتھ

لائے تھے، لیکن وہ یہیں چھوڑ دی گئی تھیں۔

اجازت ملتے ہی انہوں نے دوسرے ہی روز ایک خاص آدمی وطن بھیج کر اس بکس کو منگوا لیا۔

وارڈ کے کمرے میں اُن کے پلنگ کے قریب ایک الماری بہ قاعدہ سے وہ کتابیں رکھوا دی گئیں، دونوں وقت حسبِ دستور صاف کی جاتیں، اسی کے ساتھ وہ برابر ان کی ترتیب بھی بدلواتے تھے، اور اُنھیں دیکھ دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے۔

روزانہ صبح کو ایک ملازم کو امین آباد پارک اخباروں کی خریداری کیلئے بھیجتے تھے اور اس کی واپسی کا ان کو بے چینی کے ساتھ انتظار رہا کرتا تھا۔

چونکہ زیادہ پڑھنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس لئے صرف خاص خاص حصّے خود دیکھتے، باقی احمد سے یا مجھ سے پڑھا کر سنتے تھے۔

انشاپردازی کا شوق اور مشاہیر مصنفین کے ساتھ خاص ارتباط

جہاں تک پتہ چلتا ہے، ان کے مضامین کی پہلی قسط "تمدنِ عرب پر ایک کھلی چھٹی" کے عنوان سے فروری ۱۸۹۹ء میں "ریاض الاخبار" گورکھپور میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد وقتاً فوقتاً مختلف رسالوں اور اخباروں میں ان کے مضامین شائع ہوتے رہے۔

اسی سلسلہ مولانا نذیر احمد صاحب، مولانا محمد حسین صاحب آزادؔ، مولانا حالیؔ صاحب، مولانا شبلیؔ صاحب مرحوم سے خط و کتابت شروع ہوئی۔ سر سیّدؔ مرحوم سے بھی تھی۔ مگر کم۔

لیکن مولانا شبلیؔ مرحوم کے ساتھ باہمی تعلقات خاص طور پر گہرے تھے۔ ۱۸۹۰ء سے مولانا شبلیؔ مرحوم سے یہ سلسلہ شروع ہوا۔ اور تعلقات کی تدریجی رفتار کے ساتھ

تحریر کا لب و لہجہ بدلتا گیا۔ مولانا فرط خلوص سے ان سے کوئی راز نہیں رکھتے تھے۔

مولانا مرحوم اپنے ایک خط میں اُن کے دو مضامین کی داد یوں دیتے ہیں۔

"البشیر میں ایک مضمون دیکھا جس کے نیچے تمہارے نام کے دستخط تھے، حیرت ہوئی کہ یہ وہی مرزا پوری دوست ہیں یا نذیر احمد و آزاد کی روحوں نے ایک قالب اختیار کیا ہے۔ کئی دن تک دیکھتا اور احباب کو دکھاتا رہا۔ دو ہی تین ہفتے ہوئے تھے کہ ایک برق اور افق پر چمکی، یہ اس سے بھی زیادہ ہوش ربا اور خیرہ کن تھی۔"

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں۔ کاش شعر العجم کے مصنف کو ایسے دو فقرے لکھنے بھی نصیب ہوتے، دائرہ ادبیہ کا لکھنے والا شبلی کا معتقد ہو یقین کرنے کی بات نہیں۔"

جب وہ الہ آباد تبدیل ہو کر آئے تو مولانا بہت خوش ہوئے اور لکھا کہ آپ کے الہ آباد آجانے نے مجھ کو الہ آباد کے سفر پر فوراً آمادہ کر دیا، اب میرے سفر کی تعداد میں ضرور اضافہ ہو جائے گا۔

جب مولانا شبلی مرحوم الہ آباد تشریف لاتے تھے، تو اپنے زمانۂ قیام میں ایک دن بھی بغیر ان کے دیکھے مولانا کو چین نہیں آتا تھا۔ اور مولانا کی مانگ ہر طرف کثرت سے رہتی تھی۔ میرے یہاں ایک روز سے زیادہ مہمان نہیں رہنے پاتے تھے۔ تاہم جہاں مولانا ہوتے تھے، وہ روزانہ ان سے ملنے کے لئے جاتے تھے۔

الہ آباد میں بھی رفتہ رفتہ اعلیٰ طبقہ کے احباب کی ایک اچھی خاصی پارٹی ان کی تیار ہو گئی تھی جس میں زیادہ تر تعداد ذی علم اصحاب کی تھی۔

موجودہ ارباب قلم کے ساتھ ان کے مراسم

مولانا شبلی مرحوم کے بعد آپ کے لائق فخر شاگردوں سے بھی ان کے تعلقات کچھ کم نہ تھے۔ ان ندوی احباب

میں مولانا سید سلیمان صاحب، مولوی عبدالباری صاحب، مولوی عبدالسلام صاحب
کے ساتھ خاص خلوص اور دلچسپی تھی۔ نسبتہً سید سلیمان صاحب سے زیادہ، جیسا کہ
سید سلیمان صاحب نے خود تعزیت نامہ میں تحریر فرمایا ہے کہ "میں نے ان کا رابطۂ محبت
اپنے استاد مولانا شبلی مرحوم سے وراثتہً پایا تھا"
وفات سے دو ایک سال قبل مولوی عبدالباری صاحب ندوی سے بھی تعلقات
(بذریعہ تحریر) بہت زیادہ قائم ہو گئے تھے۔
وہ ان اصحاب کے علمی مذاق کے بہت گرویدہ تھے، دل سے قدر اور محبت
کرتے تھے اور اس ارتباط کو انھوں نے آخری وقت تک بنا ہا۔
اپنے موجودہ ادبی احباب میں جن کی لٹریری اور علمی قابلیت کے وہ دلدادہ
تھے، مولانا عبدالماجد صاحب بی۔ اے کا نام نامی سرفہرست درج ہونے کے لائق ہے
آپ کے ساتھ انھیں سچا خلوص اور دلی تعلق تھا۔
آپ کے خطوں کا ان کو بے چینی کے ساتھ انتظار رہا کرتا تھا جس روز ڈاک
میں آپ کا خط ہوتا، انھیں بے حد مسرت ہوتی تھی، خدا جانے کتنی مرتبہ اُسے
پڑھتے تھے اور سیری نہیں ہوتی تھی، کبھی جوش میں کھڑے ہو جاتے اور ٹہل ٹہل کر
خط کو پڑھتے تھے۔
اکثر آپ کی نسبت فرطِ خلوص اور محبت سے کہا کرتے تھے کہ "ایک دن یہ
موجودہ زمانہ ہند کا آفتابِ علم ہو کر رہے گا۔
جناب مولانا عبدالماجد صاحب نے ان کی وفات پر جو تعزیت نامہ ہمدم میں شائع
کرایا تھا اس کا ایک ایک حرف بجائے خود باہمی خلوص اور سچی محبت کا بہترین ثبوت ہے۔

سید ناصر علی صاحب (ایڈیٹر صلائے عام) مولوی عبد الرزاق صاحب کانپوری (مصنف البرامکہ) مولانا ابوالکلام صاحب آزاد، مولانا محمد علی صاحب آکسن، شاہ دلگیر صاحب اکبرآبادی، ان سے بھی خاص مراسم تھے۔

الہ آباد میں کبھی کبھی مولانا شبلی مرحوم کے ساتھ مولانا ابوالکلام صاحب آزاد بھی میرے ہاں مہمان ہوا کرتے تھے۔

لیکن اِدھر مدت سے آپ لوگوں کے ساتھ بوجوہ ان کا سلسلۂ مراسلت قریب قریب منقطع تھا۔

خط و کتابت چونکہ زندگی بحیثیت مجموعی بہت با اصول تھی۔ یہ صیغہ بھی باقاعدگی سے خالی نہ تھا، بلکہ مراسلت ان کی زندگی کا ایک نہایت ضروری جزو تھی۔

ڈاک کا ان کو روزانہ سخت انتظار رہا کرتا تھا، ڈاک عموماً زیادہ ہوا کرتی تھی اخبار، رسالے، دوستوں اور عزیزانِ خاندان کے خطوط، دکانوں کی فہرستیں برابر آتی رہتی تھیں۔

جس روز اُردو کا کوئی نیا رسالہ (خصوصاً معارف) ہوتا، اس روز انھیں روحانی مسرت ہوتی، یا جب ان کی لٹریری دوستوں میں سے کسی کا خط آجاتا، تو بہت خوش ہوتے اور اس خط کو بار بار پڑھتے۔

خود خط لکھنے، اور دوستوں کے خطوں کا جواب دینے میں بہت باقاعدہ تھے، خط کا جواب نہ دینا، ان کے خیال میں ایک اخلاقی جرم تھا، جس کے وہ کبھی مرتکب نہیں ہوئے۔ خط خواہ کسی کا ہوتا، جواباً ضرور اسکو لکھتے تھے۔

یہاں تک کہ زمانۂ علالت میں بھی مراسلت کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔ آپ

نہیں لکھ سکتے تھے، تو احمد سے لکھواتے رہتے تھے، اور خود بولتے جاتے تھے۔

عیادت کے خطوط جو روزانہ آتے رہتے تھے، ان کا جواب جب تک نہ جاتا

ان کو بے چینی رہا کرتی تھی۔

آہ! اخیر وقت تک افسوس اس کا بہت خیال تھا کہ ان سے کوئی جواب خط نہ پانے

کا شاکی ہو،

عین وفات کے روز بھی کوئی دو بجے دن کو انہوں نے کئی خط لکھوا کر بھیجے،

احمد اس وقت اپنے کسی کام سے باہر جانا چاہتے تھے، اس لئے خط کو ٹالنا چاہا۔

کہا کہ "ابا جان! اب کل لکھیں گے" اس پر انہوں نے آبدیدہ ہو کر کہا کہ "نہیں

بیٹا! آج ہی لکھو، جب میں دنیا میں نہیں ہوں گا، اس وقت یہ باتیں تم لوگوں

کو بہت یاد آئیں گی کہ تمہارے باپ کی باقاعدگی نے آخری سانس سے پہلے ان

کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ ان کے خطوں میں ایک خاص ادا ہوتی تھی، عبارت حشو و زوائد سے

بری ہوتی تھی اور طرزِ انشا میں وہ اپنا ایک جداگانہ رنگ رکھتے تھے۔ یعنی کسی

کے مقلد نہیں تھے بلکہ خود درجۂ اجتہاد رکھتے تھے۔

خطوط روزمرہ کی بول چال میں نہایت بے تکلف اور بیساختہ ہوا کرتے

تھے ان کے مکتوبات کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اگر کوئی تحریر گمنام بھی ہو، ناممکن

ہے کہ دو سطریں پڑھنے کے بعد پڑھنے والا سمجھنے میں غلطی کرے، اسی کے ساتھ

شانِ خط نہایت صاف اور دلفریب، یہ دونوں باتیں بہت کم لوگوں کے حصہ

میں آتی ہیں۔ ان کے اہلِ قلم احباب، ان کے خطوط کی بڑی قدر کرتے تھے، جس کا

ثبوت یہ ہے کہ ان کے ہر ملنے والے کے پاس، ان کے خطوں کی ایک معقول تعداد

بقول مولانا سید سلیمان صاحب ندوی "تعویذ ادب بن کر حرز جان کی حیثیت سے محفوظ ہیں"
میرا ارادہ مکاتیب کے بھی شائع کرانے کا ہے، جس سے اُردو لٹریچر میں ایک
قیمتی اضافہ ہو گا۔

ظرافت میں اختصار ایک مرتبہ سید عبدالروف صاحب بیرسٹر ایٹ لا، الہ آباد،
جو، اب پنجاب ہائی کورٹ کے جج ہیں، ان کے ہاں مولانا شبلی مرحوم کی دعوت تھی۔ اسی
سلسلہ میں اور بھی بہت اصحاب شریک تھے، عبدالروف صاحب ان کے علمی اور
سنجیدہ مذاق کی بہت قدر کرتے تھے۔ خاص کر ایسے موقعوں پر بیرسٹر صاحب اِن کو ضرور
پکڑتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ "بھائی بغیر آپ کے میز پر لطف نہیں آتا" اس دعوت
میں باہر کے ایک رئیس صاحب بھی شریک تھے۔ آپ نے جو ایک نائب تحصیلدار کو اس
قدر با قاعدہ کپڑوں میں دیکھا اور اس پر مولانا اور بیرسٹر صاحب کی خاص توجہ، تو آپ
کی طبیعت نے نچلے نہ بیٹھنے دیا۔

رئیس صاحب نے اِن کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا، کیا آپ براہِ مہربانی مجھے
یہ بتا سکتے ہیں کہ انسان جنٹلمین کس طرح بنتا ہے، وہ سُنکر ٹال گئے۔

دوبارہ پھر یہی سوال کیا، اب بھی وہ خاموش رہے۔ لیکن جب تیسری مرتبہ رئیس
صاحب نے اس کا اعادہ کیا، تب انہوں نے نہایت سنجیدگی سے بغیر ان کی طرف
دیکھے ہوئے جواب دیا "معاف کیجئے گا جنٹلمین بنتے نہیں، ہوتے ہیں"۔ ان کا یہ کہنا
تھا کہ ہر طرف کے قہقہوں کی آواز سے ہال گونج اٹھا، اور بیچارے رئیس صاحب جھینپ
گئے، عبدالروف صاحب سے ضبط نہ ہو سکا، جوش میں فوراً اٹھے اور ان سے لپٹ گئے،
اس قسم کے اور بھی بہتیرے واقعات ہیں۔

اخلاقی جرأت | وہ اپنی رائے کے اظہار میں کبھی کسی کا خیال نہیں کرتے تھے، جس طرح اپنے گھر میں پانچ کے دوستوں میں آزاد تھے، اسی طرح بڑی سے بڑی پارٹی اور جلسے میں بھی بے باکانہ اظہار خیال کرتے تھے۔

قوت فیصلہ | کسی سے صرف ایک بار ملنے کے بعد قیافہ سے اس کی نسبت نہایت صحیح اور بہت جلد رائے قائم کر لیتے تھے جو اکثر بالکل ٹھیک ہوتی تھی، اس پر دوسروں کو حیرت ہوتی تھی۔

خودداری | وہ جہاں خلیق تھے، وہاں خوددار بھی حد درجہ کے تھے، وہ اپنے سے کم رتبہ سے ملنے اور بازدید کے لئے اس کے گھر بے تکلف جاتے تھے لیکن کسی کے ہاں وہ گئے اور وہ بازدید کو نہ آئے، چاہے کتنا ذی مرتبہ کیوں نہ ہو پھر دوبارہ اس سے ملنے نہیں جاتے تھے۔

صداقت اور صاف دلی | وہ نہایت نیک نیت تھے، اور صداقت انکی طبیعت کا ایک زبردست جزو تھی، خصوصاً دل تو سینہ میں ایک شفاف آئینہ تھا، ناممکن تھا کہ اپنے متعلقین میں کسی کی طرف سے ہو، اور کسی حیثیت سے ہو، ذرا سا میل اس پر آجاتا تو وہ اسے برداشت کر سکتے، طبیعت میں ایک ایسی بے چینی پیدا ہو جاتی تھی، جس سے رات کو چین سے سو بھی نہیں سکتے تھے، جب تک کہ اس سے صفائی نہ کر لیتے اور جس کے ساتھ جتنا ہی گہرا تعلق تھا، اتنا ہی زیادہ اس کا اثر بھی قبول کرتے تھے۔

عقل اور جذبات کا صحیح استعمال | وہ مجسم جذبات تھے، لیکن اسی کے ساتھ ان کا ہر فعل نہایت عاقلانہ اور با اصول ہوا کرتا تھا، جہاں جذبات کا موقع ہوتا

تھا۔ عقل ایک حد تک مغلوب ہو جاتی تھی۔ اور جہاں عقل کی ضرورت ہوتی تھی، وہاں جذبات کا کوسوں پتہ بھی نہیں ہوتا تھا، اور کبھی کبھی یہ دونوں حالتیں ان پر ایک ہی وقت خاص میں اور ایک سکنڈ کے اندر طاری ہو جاتی تھیں۔

لباس میں خاص تصرفات

وہ جتنا اچھے کپڑوں کے شائق تھے، اتنا ہی اس کی تیاری میں بھی اہتمام رکھتے تھے۔

اچھّی سے اچھّی انگریزی دکان پر بہتر سے بہتر سینے والوں کو بھی اپنے کپڑے اس وقت تک سینے کے لئے نہ دیتے تھے جب تک کہ ان کو اس کی تراش میں شریک ہونے کا موقع نہ ملے، خاص خاص خود بتاتے تھے، کان پور کے ایک مشہور درزی سے ضبط نہ ہو سکا۔ اور اس نے ایک موقع پر کہا کہ "حضور! مجھے بڑے بڑے صاحبوں کے کپڑے سینے کا اتفاق ہوا، اور اسی میں عمر گزر گئی، لیکن ایسی ایسی باریکیاں حضور کی بدولت معلوم ہوئیں۔ کہ تابعدار زندگی بھر بھول نہیں سکتا"۔ اسی طرح ہر چیز کی تکمیل کا بہت خیال رہتا تھا، ایک جوڑی جوتا بھی ہیکسٹن ایسے، بغیر ان کی خاص ہدایت کے، ان کی مرضی کے لائق تیار نہیں کر سکتے تھے۔

سگریٹ اور حقّہ

سگرٹوں کے بہت شائق تھے۔ اور اعلیٰ سے اعلیٰ پیتے تھے۔ علی گڑھ کلب کی سگریٹ خصوصیت سے منگواتے تھے، اس خیال سے کہ اس میں ترکی کا تمباکو ہوتا تھا، لیکن ادھر کچھ دنوں سے وطن کے اعلیٰ تمباکو نے حقّے کا شوق پیدا کر دیا تھا حقّہ بھی نہایت تکلفی ہوتا تھا۔ خاص طرح کے نیچے فرمائشی بنوائے جاتے تھے، اور ایک کو پندرہ روز سے زیادہ استعمال نہیں کرتے تھے، مہنال عنبری ہوتی تھی، جب تک مردانہ میں کام کرتے رہتے، ہر پندرہ بیس منٹ کے بعد چلم بدلی جاتی تھی اسی کے

ساتھ ساتھ برابر تازہ بھی کیا جاتا، اور فرشی کپڑے سے خشک کر کے چمکائی جاتی تھی۔

غذا مقدار بہت کم ہوتی تھی، لیکن جہاں تک ممکن تھا بہتر سے بہتر اور لطیف، ثقیل چیزوں سے پرہیز کرتے تھے، ترکاری زیادہ کھاتے تھے، اور وہ خاص طرح پر پکائی جاتی تھی، یعنی اس کا جوہر فنا نہ ہونے پائے اور مچھلی بہت ہی پسند تھی۔ اور انڈوں سے بے حد شوق تھا، خاص کر صبح کی چائے پر لازماً ہوتے تھے،

ہر اچھے اور لطیف پھل سے شوق تھا، نسبتہً آموں سے زیادہ، خاص کر لنگڑے آموں سے۔ خشک میوے یوں پسند نہیں تھے۔ صرف ان کی لوزیات کھاتے تھے۔

صحت کا خیال اور وقت کی پابندی جاڑوں میں سات بجے اور گرمیوں میں ساڑھے چھ بجے صبح کو چائے اپنے لوازم کے ساتھ سامنے آجاتی تھی، اور سات بجتے بجتے وہ اپنے دفتر کے کمرے میں جا کر بیٹھ جاتے تھے، پھر ساڑھے دس بجے غسل اور گیارہ بجے کھانا۔ اس کے بعد دو گھنٹے آرام، لیکن دن میں سوتے کم تھے۔ ایک بجے سے ڈاک دیکھنی شروع کرتے پہلے نج کی خاص خاص پھر سرکاری تحصیلے کی دیکھ بھال کے بعد دو بجے تازہ غسل کے بعد کچہری جاتے، اور ۴ بجے واپسی پر چائے سے فارغ ہو کر باہر صحن میں جا کر بیٹھتے اور ڈیڑھ دو گھنٹے ملنے جلنے والوں کا سلسلہ رہتا پھر کچھ دیر ادھر اُدھر ٹہلتے، ۸ بجے شب کو کھانے پر بیٹھ جاتے، اس کے بعد صاف ستھرے لیمپ کی تیز روشنی کے سامنے اس روز کے آئے ہوئے نئے اخبار اور رسالوں کو کچھ دیر دیکھتے، ۱۱ بجے سو رہتے، پھر وہی صبح جس کا خاکہ شروع میں کھینچ چکی ہوں۔

بڑے تو خیر، چھوٹے بچوں کے بھی سال میں ایک یا زیادہ سے زیادہ دو مرتبہ زکام تو البتہ ہو جاتا تھا، ورنہ برسوں خدا کے فضل سے حرارت بھی نہیں آتی تھی اور یہ

صرف اسی باقاعدہ زندگی کا ثمر پیش رس تھا۔

خلاصہ زندگی نہایت صاف ستھری تھی اور جتنے صیغے تھے، سب میں متوازی ترقی کی کوشش رہتی تھی۔

سچ یہ ہے کہ انسان کی غایت ہستی ظاہر احسنِ معاشرت کے سوا کچھ معلوم نہیں ہوتی، اور جدید طرزِ معاشرت میں اوّل درجے کا معیارِ زندگی کچھ ناگزیر سا تھا جس سے ان کی سی طبیعت کا انسان قطع نظر نہیں کر سکتا تھا،

اصلی جذبۂ ہمدردی اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہ کچہری میں بیٹھے مقدمہ کر رہے ہیں۔ اور بڑے بڑے وکیل اجلاس میں موجود ہیں، سارا کٹہرا گواہوں سے بھرا ہوا ہے، اور وہ نہایت مصروفیت سے اپنے فرائضِ منصبی کو انجام دے رہے ہیں کہ اتنے میں ایک فقیر کی آواز کانوں میں آئی، اور انہوں نے دیکھا کہ اجلاس کے سامنے میدان میں وہ کھڑا ہے اسی وقت ان کا قلم رک جاتا۔ اور اردلی کی طرف دیکھتے، چونکہ اردلی ان کی اس حالت سے واقف رہتا تھا، فوراً وہاں سے روانہ ہوتا لیکن جب تک وہ دروازے پر آکر اطلاع کرتا، اور پھر یہاں سے واپس جاتا اور فقیر کو دے کر رخصت نہ کر لیتا اس وقت تک اپنا کام نہیں کر سکتے تھے۔ یا کبھی ایسا ہوتا کہ گھر پر انکی موجودگی میں فقیر نے صدا دی اور اس کی پہلی یا دوسری آواز پر فوراً بھیک نہ دی گئی تو اتنی سی تاخیر ان کو ناگوار ہوتی تھی۔

اور یہ تو ان کے ہاں سخت جرم تھا کہ کسی کام کیلئے بیگار پکڑ آئے اور پھر بغیر کچھ اُجرت پائے وہ چلا جائے اس کی بہت نگرانی رکھتے تھے۔

اگر اتفاق سے کبھی اردلیوں کی غفلت سے ایسا ہو جاتا تو وہ سب تقصیریں معاف

کر سکتے تھے لیکن نہیں معاف کرتے تھے تو اس قصور کو۔

خدا کے ساتھ سچی عقیدت مندی

وہ نماز پابندی سے تو نہیں پڑھتے تھے، لیکن اکثر تازہ غسل کے بعد جب ان کا دل چاہتا تھا پڑھ لیتے تھے، اور مفصل کی تحصیلوں میں عید بقرعید کی نماز بھی اکثر گھر ہی میں پڑھتے تھے، لیکن جس وقت قاعدے سے نماز کے لئے کھڑے ہوتے تھے، اس وقت وہ صحیح معنی میں مجسم تصویر عبودیت ہوتے تھے، جس خلوص اور عاجزی کے ساتھ ارکانِ نماز ادا کرتے تھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اسوقت وہ اپنے معبودِ حقیقی کو نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں، اور بعد نماز دعا کا انداز تو ایسا تھا کہ جتنے ان کے شریکِ نماز ہوتے تھے ناممکن تھا کہ سب کی گھگھی نہ بندھ جاتی۔

موت کا خیال پیش نظر

کوئی ہفتہ ایسا نہیں گزرتا تھا کہ جس میں وہ موت کا ذکر تفصیل کے ساتھ نہ کرتے رہے ہوں۔ اور اگر اس وقت کوئی اتنا بھی کہدیتا کہ اب اس ذکر کو جانے دیجئے تو فوراً بگڑ جاتے تھے اور کہتے تھے کہ "دوسرے یہ جاننے کے بعد بھی کہ وہ کبھی نہ کبھی ضرور پیش آکر رہے گی، پھر بھی اپنے نفس کو دھوکا دینے کیلئے اس خیال کو ٹالتے رہتے ہیں۔ لیکن میں اوروں کی طرح بنا ہوا آدمی نہیں ہوں اسلئے سمجھتا ہوں کہ زندگی غیر اختیاری اور اتفاقی ہے لیکن موت لازمی اور قطعی ہے"۔

اولادیں اور آپس کے تعلقات

دونوں لڑکیوں کی شادی ان کی حیات ہی میں ہو چکی تھی اور اپنے اپنے گھر سے خوش ہیں۔

بڑا لڑکا احمد حسن علی گڑھ میں بی۔ اے کے پہلے درجے میں پڑھ رہا ہے اور ۲ لڑکے مجھ سے ہیں، بڑا شاہد حسن ۹ برس کا اور چھوٹا نافذ حسن ۷ برس کا جب کبھی ہم سب پردیس میں یا وطن میں ایک جا ہوتے تھے، تو کچھ عجیب لطف

رہتا تھا، آپس میں خاص طرح کے تعلقات باہمی خلوص یک رنگی اور ہم خیالی کے ساتھ کی وہ معصوم خوشیاں اور اس میں بالتخصیص ان کی شرکت۔

تحریر کی طرح ان کی تقریر بھی نہایت جامع اور ملنع ہوتی تھی، اس پر وہ ان کی خاص طرح کی ظرافت۔

بعض وقت یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا ہم سب اس دُنیا سے تعلق نہیں رکھتے، اور یہ وہ راز تھا جس کو ہم چند ہستیوں کے سوا دوسرے سمجھ بھی نہیں سکتے تھے، حیرت ہوتی ہے، کیا ہم سب وہی ہیں؟ بے شک! لیکن اب وہ روح باقی نہیں رہی، آہ! وہ فخر خاندان، رونق خاندان، بلکہ اقبالِ خاندان دُنیا سے رخصت ہو گیا۔

آخری علالت کا سلسلہ اگست ۱۹۲۱ء میں ڈیرا پور میں (کانپور کی ایک تحصیل) ان کی طبیعت کچھ خراب ہوئی، وہیں تحصیل کے ڈاکٹر کا علاج ہوتا رہا، جب کچھ فائدہ نظر نہ آیا تو پھر کانپور کے ڈاکٹر سے مل کر ان کا علاج شروع کیا۔ لیکن اس میں بھی کچھ کامیابی نہیں ہوئی۔ تب وطن کا خیال آیا۔ اور یہاں پہنچتے ہی اسسٹنٹ سرجن جو نہایت ہوشیار اور قابل ڈاکٹر ہیں فوراً بلائے گئے اور باقاعدہ علاج شروع ہوا لیکن یہاں بھی بجائے ترقی کے حالت اور بگڑتی ہی گئی، پھر ڈاکٹر کے مشورے سے لکھنؤ لیکر گئی اور میڈیکل کالج میں دو مہینے مسلسل کرنل اسپراسن صاحب کے زیر علاج رہے۔

وہاں پہنچنے کے تھوڑے دنوں بعد ان کی طبیعت سنبھلنی شروع ہوئی۔ اور رفتہ رفتہ اتنے اچھے ہو گئے کہ غذا بھی کافی ہونے لگی اور اچھی طرح سب سے باتیں بھی کرنے لگے، کچھ دیر اخبار یا کوئی کتاب بھی ڈاکٹر کی اجازت سے دیکھنے لگے۔

ظاہرا بیماری کی بہت سی علامتیں بھی دور ہو چکی تھیں، اسپراسن صاحب بہت

خوش تھے اور کہا کرتے تھے کہ "آپ نے بہت جلد ترقی کی"۔ لیکن اِس درمیان میں
اسپراسن صاحب خود علیل ہو گئے، گو دوسرے ڈاکٹر دو وقتہ آتے تھے، مگر صاحب پھر
اِن کی زندگی میں اسپتال نہیں آسکے۔

اسی دوران میں ۱۹۔ نومبر کو اِن کی طبیعت پھر کچھ خراب ہوئی لیکن ایسی نہیں کہ
جس سے خطرہ کا احتمال ہوتا، اِسس دوبارہ خرابی طبیعت کے ساتھ اِشتہا میں پھر
کمی ہو گئی۔

۲۱ نومبر کو ۸ بجے شب میں صرف دو نیم برشت انڈے اور تھوڑا شوربہ
کبوتر کا یہی غذا ہوئی، اس کے بعد حسبِ معمول مجھ سے کچھ باتیں کر رہے تھے کہ دفعۃً ایک
گھبراہٹ کے ساتھ سر کو تکیہ پر رکھ دیا۔ اور ایک سکنڈ میں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے
بس وہ کیسا منظر تھا؟ اور کیا گزر گئی؟

آہ! ظالم اور بے رحم موت! تو نے ایک کو ہمیشہ ہمیشہ کی نیند سُلا دیا، اور دوسرے
کو نیم بسمل، زندگی بھر تڑپنے کے لئے چھوڑ گئی۔

وفات اور سببِ موت فوراً ڈاکٹر نے آکر دیکھا اور کہا حرکت قلب رُک گئی، اور
افسوس کے ساتھ اظہار حیرت کی کہ اس مرض میں سے ۰۰ ایں دو چار بدنصیبوں
کو یہ صورت پیش آتی ہے۔" افسوس کہ آپ اِن ہی میں سے ایک تھے۔
عمر کو ۴۶، ۴۷ کے قریب تھی، لیکن اتنی بھی ان کی صورت یا ان کے کسی
انداز سے معلوم نہیں ہوتی تھی، وہ فطرتاً خاص طرح کے زندہ دِل، شگفتہ مزاج اور
خوش مذاق آدمی تھے۔

ضبط اور استقلال اتنے طویل زمانہ علالت میں بھی اتنا ہی ضبط اور استقلال کا ثبوت

انھوں نے دیا۔ جتنا کہ ایک کمزور انسان دے سکتا ہے۔

اگر کوئی کچھ تسکین کا فقرہ کہتا تھا تو وہ شگفتہ نہیں ہوتے تھے بلکہ بعض اوقات ہنس دیتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ تم لوگوں کے یہ امید افزا خیالات صرف تمھارے دل کی تسکین کے لئے ہیں، لیکن جو ہونے والا ہے اسے میں خوب سمجھتا ہوں اور میری حالت خود غمازی کرتی ہے۔ اس خیال کے ساتھ بھی جب کوئی اِن سے ملنے آتا تھا تو وہ اپنی اسی پہلی شگفتگی کے ساتھ اس سے ملتے تھے۔

اِن کی وفات سے چھ روز پیشتر جناب عبدالماجد صاحب بی۔ اے انکی عیادت کے لئے آئے تھے۔ اِن سے وہ نہایت خندہ پیشانی سے ملے، اور اسی زندہ دلی کے ساتھ دیر تک مختلف مسائل پر گفتگو کرتے رہے۔ خاص کر دار المصنفین کے متعلق ایک ایک کے حالات دریافت کرتے رہے۔

اور خاص اِسی دِن اور مشکل سے کوئی آدھ گھنٹہ پہلے عبدالقادر خاں صاحب ڈپٹی کلکٹر اِن سے ملنے کے لئے آئے۔ اور وہ ڈپٹی صاحب سے بھی اسی طرح ملے اور ایک ایک کی خیریت تفصیل کے ساتھ دریافت کی۔

تجہیز و تکفین حادثہ لکھنؤ میں ہو چکا تھا لیکن پردیس میں چھوڑنے کو کسی طرح دل نے گوارا نہیں کیا، اس لئے وطن لائی اور خود بھی تمام شب ال گاڑی میں پلنگ سے لگی بیٹھی رہی۔

آہ! جس وقت ۱۰ بجے صبح کو وطن کے اسٹیشن پر گاڑی رکی ہے، وطن کے کوئی ڈیڑھ دو سو معززین، شرفا، اور روسا سے تمام پلیٹ فارم بھرا ہوا تھا علاوہ عزیزانِ خاندان کے۔

دِل سے آواز آئی: "کاش! وہ زندگی اور تندرستی کے ساتھ آئے ہوتے اور یہ اصحاب اِن کے خیر مقدم کے لئے جمع ہوئے ہوتے۔

اِس وقت کی اپنے دِل کی دھڑکن اور بیقراری کا قلم سے ادا کرنا کس قدر ناممکن ہے آہ! اس وقت جو چیخ میرے دِل سے نکلنا چاہتی تھی، وہ قطعاً ایک بار عرش کو بھی ہلا دیتی، لیکن جو کچھ دِل پر گزر گئی، اُسے رفیقِ زندگی کے پاسِ عزت نے لب تک نہیں آنے دیا۔

آہ! اس خیال سے اور بھی دِل کے ہزاروں ٹکڑے ہوئے جاتے تھے کہ یہ جسم بے جان، جو مجھے اب بھی اپنی جان سے کہیں زیادہ عزیز ہے اور جس کو اس حالت میں بھی میں نے ۲۴ گھنٹے اپنے سے سوا آخری غسل، اور آخری لباس پہنانے کے ایک منٹ بھی جدا نہیں کیا۔ اسے اب یہ لوگ مجھ سے جدا کرنے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میری نگاہوں سے پنہاں کرنے کے لئے آئے ہیں۔

غرض یہاں اِن کے مردانہ کے صحن میں جہاں ایک رات پیشتر ہی سے ان کے لئے گھر بنا تیار تھا، اسی میں وہ جسمِ خاکی سپردِ خاک کر دیا گیا۔

اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون ط

ماحصل فانی اِنسان میں، جہاں بہت سی خوبیاں ہوتی ہیں، وہاں اسمیں چند کمزوریاں بھی رہتی ہیں لیکن ایک اِنسان کی بہت سی اچھائیاں اس کے عیبوں کو ڈھانک لیتی ہیں۔

بے شک! وہ بھی فرشتہ نہیں تھے، مگر فرشتہ صفت ضرور تھے۔

بہر حال اِس کا تعلق جہاں تک نفس الامر سے ہے لائق عزت واحترام ہے لیکن جہاں تک میرے قلم سے ہے، ان چند ناچیز سطروں کو اس دعا پر ختم کرتی ہوں۔

"اوخدا! انسانی کمزوریوں کا صدقہ، ہر شریف اور پاکدامن بیوہ کی حفاظت کیجیو، دنیا بڑی جگہ ہے لیکن تو اس کے اخلاق و خصائل کو اس قدر مستحکم کر سکتا ہے کہ وہ اپنے رفیق زندگی کے بعد بھی اس کی لائق پرستش عزت پر قربان ہو سکے، اور اُسکی آنکھیں اس غیر فانی روح سے اور تجھ سے کبھی نیچی نہ ہوں، اور جب وقت آجائے وہ سرخروئی کے ساتھ تیری حضوری کا شرف حاصل کر سکے، بس

یہ سینہ میں تا زندگانی رہے گا
ترا داغ دل میں نشانی رہے گا

بسنت پور، گورکھپور

جون ۲۲ ۱۹ء (سوگوار) مہدی بیگم

حکمائے یونان پر ایک سرسری نظر

نمبر (۱)

"سقراط"

(یہ مضمون فرضی نام سے شائع ہوا تھا)

یونان کے مشہور اور نامور حکماء سے تھا، ایتھنس میں پیدا ہوا، یہ شہر کسی وقت میں یونان کا دار السلطنت تھا، اس میں یونیورسٹی بھی تھی۔ سقراط کا باپ ایک بت تراش تھا۔ آبائی پیشہ کی رعایت سے اس وحیدِ عصر نے بھی سنگ تراشی میں مشق بہم پہنچائی، مگر آخر میں اسے فلسفہ کی تحصیل کا شوق ہوا۔ چونکہ طبیعت میں قدرتی طور پر اعلیٰ درجے کی صلاحیت موجود تھی اس نے نہایت تیزی کے ساتھ فلسفہ کا اثر قبول کیا۔

اوائل عمر میں باقتضائے آئینِ ملکی اسے فوج میں داخل ہونا پڑا، کئی لڑائیوں میں اس نے بڑے بڑے کارِ نمایاں کئے۔ ذلون اور ایلسی بایڈیز سے لائق شخصوں کی جان اس نے بچائی، اسی وجہ سے ان دونوں کو بھی اس کے ساتھ بہت محبت تھی، ذلونن فوج کا ایک سردار ہونے کے سوا صاحبِ تصنیف بھی تھا۔ اس کی تصنیفات خاص پایہ کی ہیں ایلسی بایڈیز ایک امیر باپ کا بیٹا تھا اور بہت ہی حسین تھا، ایتھنس کی نوخیز لیڈیاں چاہتی تھیں کہ اپنے صاف شفاف سینہ کو اس کا بستر بنائیں، مگر ایلسی بایڈیز ان کا فراداؤں کی طرف جن کے سینے کا ابھار محض اس کے خیر مقدم کے لئے تھا بالکل متوجہ نہیں ہوتا تھا۔

بادۂ شباب سے بھرے ہوئے وہ قدرتی کٹورے جو آنکھوں آنکھوں میں پی جانے کی چیز تھے اس کے لئے بالکل بے اثر تھے۔ وہ جذب مقناطیسی کچھ کام نہ دے سکتا تھا۔ وہ امنگیں جنکو شباب ایک نئے سہرے پیرائے میں کسی کے چھپے ہوئے لباس سے نمایاں کرتا ہے اور جو ہلکے باریک دوپٹہ کی اوٹ میں بمشکل حسن عریانی چھوڑ سکتی ہیں، ایلسی بایڈیز کے ہاتھوں سے اِن کا خون ہوتا رہتا تھا۔ اس کی بے پروائی کو دیکھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ تمام زمانہ کے عشاق کا عوض صرف مہوشانِ ایتھنس سے لینا چاہتا ہے جو اس پر ہزار جان سے عاشق تھیں اور چاہتی تھیں کہ خود کو نذرِ شباب کر دیں۔ کیونکہ ان کے خیال میں ایلسی بایڈیز کے حسن کا یہ ایک ادنیٰ ٹیکس تھا۔ لیکن ایلسی بایڈیز کے سچے اخلاق اس کو معصیت سے ہمیشہ علیحدہ رکھتے تھے، ہر قسم کے اوصاف اس میں کوٹ کوٹ کر بھرے تھے۔ حسن صورت کے ساتھ اعلیٰ حسنِ سیرت سونے میں سہاگے کا رتبہ رکھتا تھا۔ اس کا جادو سقراط پر بھی چل گیا اور وہ اسے پیار کرنے لگا۔

لڑائی سے فراغت کے بعد سقراط نے اپنی پہلی وضع تبدیل کر دی، کھانے کپڑے میں سادگی برتی، فلسفیانہ تحریریں شائع کیں، ہموطنوں کو پابندئ مذہب کی تاکید کی، رفتہ رفتہ حکیموں کی ایک کثیر جماعت اس کے خیالات سے فائدہ اٹھانے لگی، پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ جاری ہوا، مختلف باغوں اور دریا کے کنارے پر یہ اپنے شاگردوں کو حکمت و فلسفہ کے نازک مسئلے کو سمجھایا کرتا۔ یہ طبیعت کا بہت آزاد تھا۔ اور انتہا درجہ کا خوش تقریر بھی اس کی فلسفیانہ نکتہ سنجیاں آخر میں اس کے ہم وطنوں کے لئے رشک و حسد کا باعث ہوئیں ایک شاعر نے اس کی ہجو لکھی جس کا منشا یہ تھا کہ سقراط نوجوانانِ ایتھنس کے اخلاق کو خراب کرتا ہے اور لڑکیوں کو سکھلاتا ہے کہ اپنے والدین کی اطاعت سے انحراف کریں۔ عدالت نے

اسی بنا پر سقراط کو مجرم ٹھہرایا۔ تحقیقات کی گئی، نتیجہ اُس کو صرف گردن زدنی ثابت کرتا تھا۔ یہ حراست میں لیا گیا، اور اس کے احباب نے رہائی کی بہتیری صورتیں نکالیں خود داروغہ جیل اس کے بھاگ جانے پر راضی ہوا، مگر سقراط کو جس وقت اس ارادے کی خبر دی گئی اس نے اختلاف کیا اور نہایت استقلال سے یہ بات کہی کہ میں موت سے بھاگنا نہیں چاہتا۔ جیل میں اسے زہر کا پیالہ دیا گیا، اس نے بے تکلف اپنے ہونٹوں سے لگالیا اور اپنی جان دی۔

سقراط کے خونِ ناحق سے اہلِ ایتھنس کو بعد میں سخت پشیمانی ہوئی اور اُس کے دشمنوں کو نہایت ذلت کے ساتھ اپنی نالائقی کے خمیازے کھینچنے پڑے، سقراط کی سوانح عمری زنوفن اور افلاطون نامی اس کے شاگردوں نے لکھی ہے، اِن دونوں نے اِس کے اقوال کی علیحدہ علیحدہ ترتیب دی ہے، جو واقعی دیکھنے کے لائق ہے۔

سقراط نے شادی بھی کی تھی، اس کی بیوی بہت ہی بدمزاج تھی، سقراط کے ساتھ اِس کے برتاؤ سخت تھے لیکن ہمیشہ اس سے نرمی کے ساتھ پیش آتا تھا، اس نے اپنی بیوی کی بدمزاجی سے فائدہ اٹھایا، اس کی کچی پکی سہہ لینے سے یہ انتہا درجہ کی برداشت کا خوگر ہوگیا، ۴۶۸ برس پیشتر حضرت عیسیٰؑ کے پیدا ہوا، اور ۳۹۹ برس قبل وفات پائی۔

سقراط کی رائے میں موجودہ وقت کو کسی آنے والے دن کی اُمید پر رائیگاں دینا بڑی غلطی ہے۔ وہ کسی چیز کا پس انداز کرنا اسی لئے ایک سرے سے فضول سمجھتا ہے اکتساب علم کے لئے اس کے خیال میں کسی وقت خاص کی قید نہیں، عمر کا ہر حصہ انسان کی معلومات کو ترقی دے سکتا ہے، اس کی رائے میں کتب بینی ہی ایک عیش ہے جو ہر شخص کا اختیاری امر ہے، وہ ایک جاہل کو واجب الرحم سمجھتا ہے۔ مگر اس سے بھی زیادہ اس شخص کی ہمدردی

کرتا ہے جس کا مربی کوئی بد تہذیب اور تاریک خیال کا آدمی ہو، وہ کہتا ہے عالی ظرف کی
پہچان یہ ہے کہ دشمن کے ساتھ بھی معزز برتاؤ ہوں، زیادہ سے زیادہ کوششیں اسکی یہیں
تک محدود ہوں کہ دشمن کی تکلیف دینے سے محفوظ رہ سکے، غیبت کرنے والوں یا ایسے
لوگوں کو جن کو دوسرے کی برائی میں دلچسپی ہوتی ہے۔ وہ شریف نہیں سمجھتا، ان کے
ساتھ انتہائی رعایت یہ ہے کہ ان کو کمینہ کہا جائے، آخر میں وہ ہر شخص کو اپنی کانشنس
کی پیروی کی تاکید کرتا ہے، اس نے زور دے کر یہ بات بتائی ہے کہ صرف اصلیت
پر نظر ہونی چاہیئے، اس سے غرض نہیں دوسرے کیا سمجھتے ہیں، وہ عام مقبولیت کی خواہش
کو ایک طرح کا جنون سمجھتا ہے۔

ایک مقام پر اس نے بہت ہی چبھتی ہوئی بات لکھی ہے، کہتا ہے کہ "میں نہیں سمجھتا
کیونکر لوگ عقل کی مخالفت کو جائز رکھتے ہیں، کسی بات کی صحت پر اُن کو یقین کامل ہوتا
ہے۔ تاہم وہ اس پر کاربند نہیں ہوتے، شاید کوئی خارجی اثر وجہ مزاحمت ہو مگر میں
تو سمجھتا ہوں، ان کے ارادہ ہی کا یہ فیض ہے، مجھے آج تک کوئی بات ایسی نہ ملی جسکی
سچائی کا یقین ہوا اور نہ کر گزرا ہوں، لوگ کچھ ہی سمجھا کریں مجھے ان کی مخالفت کی قطعی
پروا نہیں، اس لئے میں ان کو داخلِ جمادات سمجھتا ہوں۔"

تمدن عرب پر

ایک کھلی چٹھی

میرے پیارے ریاض! اگور کھپور کے ایک دوست کے خط میں میں نے افسوس کے ساتھ دیکھا کہ ریاض الاخبار میں "تمدنِ عرب" کی نسبت جو نوٹ لکھا گیا تھا اس سے وہاں کے لوگ بدظن ہو گئے ہیں، وہ استصواباً مجھ سے دریافت کرتے ہیں کہ "ریاض کا ریمارک کہاں تک صحیح ہے"۔

مجھ کو نہایت افسوس ہے کہ آپ کا نوٹ اس وقت میرے پیشِ نظر نہیں ہے لیکن جہانتک یاد آتا ہے آپ نے کسی اخبار کے حوالے سے جو لکھا تھا اسکی تفصیل غالباً یہ ہے (۱) شمس العلماء مسٹر سید علی بلگرامی نے تمدنِ عرب میں حیدر آباد کی پالٹیکس پر حملہ کیا اور یہ امر اس تعلق کے لحاظ سے جو ممدوح کو ریاست سے ہے کسی قدر ناموزوں تھا۔ (۲) اسی ضمن میں ترجمہ یا ترجمہ کی زبان کی شکایت تھی۔ جو آپ نے کسی ہمعصر کے حوالے سے لکھی تھی۔

تمدن عرب کے صفحے میرے سامنے ہیں، اور میں حیرت میں ہوں کہ باوصف کوشش الزام اول کا کوئی ماخذ اس وقت تک نہ مل سکا۔ مجھے خوف ہے آپ نے جو کچھ لکھنا محض ایمان بالغیب کی حیثیت سے تھا، کیونکہ باوصف اس اعزاز کے جس کے آپ مستحق ہیں میں مجبوراً اس خیال کی طرف مائل ہوں کہ آپ نے بہ نفسِ نفیس کتاب کے

کسی حصے کو دیکھنے کی تکلیف نہ اٹھائی ہوگی، اس لئے آپ کی طرف سے کسی رائے کا اظہار محض کسی غیر وقیع ہمعصر کی لغزشِ خیال کی پیروی تھی جو آپ کے لئے "ہوسِ بس است" سے زیادہ گئی گزری ثابت ہوئی۔

جس امر کا الزامی حیثیت سے ابتدًا کسی پرچے نے نوٹس لیا اور باتباعِ سنت آپ نے بھی اظہارِ خیال کی ٹھہرا دی، وہ اس سے زیادہ نہیں ہے کہ مترجم نے دیباچہ میں جہاں ترجمہ کی مشکلات کا ذکر کیا ہے، کسی فرو گزاشت کیلئے اس بناپر چشم پوشی کی خواہش کی ہے کہ ایک دیسی ریاست کے ملازموں کے لئے جہاں آئے دن کی درباری داریوں اور انقلابات سے فرصت نہیں ملتی، اپنے فرائض منصبی کے علاوہ بہت مشکل ہے کہ وہ اتنی بڑی ضخیم تالیف کے بارے میں تھوڑی سی مدت میں بوجہ احسن سبکدوش ہو سکے یہ ہے اصلیت اس الزام کی جس کو میں زیادہ سے زیادہ صرف "مولفانہ گریز" کہوں گا۔

زبان کی نسبت آپ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا کہ اُردو اس ابتدائی حالت میں نہیں ہے۔ جب شعراء کا ایک خاص فرقہ (جن کو میں نہیں جانتا ناظم کہہ سکتا ہوں یا نہیں) جس کے دل و دماغ کے نتائج انتہائی پروازِ فکر کے ساتھ بھی صرف دو مصرعوں کی صنعت تک محدود ہوتے تھے، خود کو اُردو کا مربی سمجھتا تھا، ایک شکمی زبان کے لئے جو کوئی مستقل حیثیت نہ رکھتی ہو، جس کا رسمِ خط آج تک ٹھیک نہ ہو۔ بدنصیبی سے جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ زبان کے ساتھ خط کوئی مناسبت طبعی نہیں ہے۔ ، یعنی زبان میں فطرتاً جو اصوات ہیں ان کو یہ بخوبی ادا نہیں کر سکتا، بالفاظ دیگر ہر لکھا ہوا لفظ ایک خاص خیال کی تصویر ہے جس کی آواز کو اس کے اجزائے ترکیبی سے چنداں تعلق نہیں ہے۔ یعنی حرکات بالحروف کی جگہ صرف چند اختراعی علامات کی وجہ سے جو سمیا طیقی زبان

…خاص میں سے ہے ہم اُردو کو جو آرین خاندان سے ہے صحیح نہیں پڑھ سکتے اور اس لئے
لازم سا ہے کہ کسی لفظ کے پڑھنے سے پہلے ہم اس کے مفہوم سے واقف ہوں ما ورنہ
بے علمی میں صحیح تلفظ ناممکن ہو گا، غرض یہ کہ ایسی زبان کے لئے جس کا املا تک صحیح نہ ہو،
متقدمین کی کوششیں کسی حیثیت سے ہوں، ہر طرح لائق ادب ہیں لیکن زمانہ کا ہر قدم
آگے ہے۔ ہم کو بڑی تنگ بندیوں کے سوا کچھ اور بھی کرنا ہوگا۔

میرا خیال ہے کسی مفتوح قوم کے لئے اپنی قومی زبان کو ترقی دینا صرف اِس
اصول پر ممکن ہے کہ زمانہ کی روز افزوں ترقی کے لحاظ سے اس میں وہ وسعت پیدا کی
جائے جو قوم فاتح کے لٹریچر اور اس کی مختلف شاخوں سے مل سکتی ہے یعنی زبان کو
علوم فطری اور فلسفہ کے اکثر نہیں تو بعض اجزا سے مانوس کیا جائے اور گو یہ ممکن نہیں
کہ ابتداً علم کی اکثر شاخ میں متوازی ترقی ممکن ہو۔ تاہم بعض اجزا جن سے قوم کے
قوم اکثر افراد کو فطرتاً یا اکتساباً مناسبت ہو اس قابل ہیں کہ وہ ہمارے ملکی لٹریچر
میں جذب کر لئے جائیں، جس سے اُردو زبان بھی علمی حیثیت سے یورپ کی زبانوں
سے ہم ردیف ہو، اس لئے ہماری کوششوں کا رجحان طبعی جہاں ہم علوم جدیدہ کو
اصلی زبانوں سے حاصل کر سکتے ہیں، ملک کے عام فوائد کے لحاظ سے یہ بھی ہونا چاہیے
کہ یورپ کے فلسفہ کی کسی شاخ کو جو ترتیباً ہمارے لئے موزوں اور مفید ہو اپنی زبان میں
وقتاً فوقتاً منتقل کرتے رہیں، لیکن میں پہلے دیکھوں گا، آیا ہم میں اتنی صلاحیت موجود ہے کہ
ترجمہ کی حیثیت سے ہماری پیش دستیاں طفلانہ کوششوں سے کچھ زیادہ وقیع ہوں۔

ترجمہ، اگر میں غلطی نہیں کرتا تو بعض حالتوں میں کسی مستقل تصنیف سے زیادہ مشکل
ہے، جس کی غایت اصلی یہ ہوتی ہے کہ مصنف نے اپنی زبان میں جس طرح اظہارِ خیال

کیا ہے، مترجم بجنسہ ان خیالات کے سایہ میں اپنے الفاظ سے کام لے، لیکن زورِ بیان ہاتھ سے نہ جائے، اس پابندی اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ آپ دیکھیں گے کہ ہر زبان کے خصائص نوعی مختلف ہیں۔ جس طرح ایک روزمرہ یا محاورہ استعارہ یا تلمیح میں ایک خیال کو ادا کر سکتے ہیں، یہ ضرور نہیں کہ دوسری زبان میں بھی اسی قبیل کے الفاظ موجود ہوں، اس سے بھی زیادہ مشکل اصطلاحات کی ہے، صرف ایشیائی یا یورپین زبانوں سے اگر ایک کا ترجمہ دوسری زبان میں ہو تو بہتیری اصطلاحات بجنسہ یا کسی قدر تصرف کے ساتھ کار آمد ہو سکتی ہیں، اور اکثر ایسی مشترک خصوصیات ملیں گی جن سے ترجمہ میں نہایت آسانی ہوگی لیکن یورپ کے فلسفہ کو اگر ہم ایشیائی زبان میں لینا چاہیں تو ہماری دشواریوں کی کوئی حد نہیں رہتی، خاص کر اردو جو بجائے خود مستقل زبان نہیں ہے تاوقتیکہ عربی مصطلحات سے مدد نہ لی جائے، علمی حیثیت سے کسی ترجمہ کی کفیل نہیں ہو سکتی، یعنی ایک مترجم کے لئے اس کی ضرورت ہوگی کہ جہاں وہ مغربی زبانوں اور علوم جدیدہ میں کافی دستگاہ رکھتا ہے، صرف اردو کا ادیب ہو بلکہ اس کے اصلی ماخذ یعنی مشرقی علوم، بالتخصیص سنسکرت اور عربی کا پورا عالم ہو، اس کے ساتھ علم اللسان کی موشگافیوں سے پورا مذاق رکھتا ہو، مختلف زبانوں میں اصطلاحات یا الفاظ مرادف کے اشتقاق، انکے استخراج اور خواصِ طبعی سے واقف ہو، اس جامعیت کے ساتھ میں آپ سے دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ ملک کے علم دوست حضرات کے لئے کسی علمی ترجمہ کا کفیل ہندستان میں باستحقاق سید علی بلگرامی کے سوا کون ہو سکتا ہے جو یورپ و ایشیا کی متعدد السنہ کے اکثر خاندانوں کا زبردست واضل ہے۔

ان مسلمات کے بعد جو تمہیداً بیان کئے گئے ہیں، میں تمدنِ عرب کو پیش کرنا چاہتا

ہوں جو میرے خیال میں تاریخ فلسفہ کا بہترین نمونہ ہے، اور میں اپنی اس رائے میں غالباً
منفرد نہیں ہوں کہ ترجمہ کے لحاظ سے لائق سے لائق شخص کا انتہائی تخیل جو کچھ ہو سکتا ہے
کتاب اس کی پوری تصویر مرئی ہے، افسوس ہے کہ میں اپنی مصروفیت سے اس قدر وقت
نہیں پاتا کہ اپنے دعویٰ کی دلیل میں اقتباسات کو پیش کر سکوں، یہ فرض ریویو نگار کا ہے
جس کو غالباً مولوی وحید الدین سلیم، معارف میں تفصیل کے ساتھ ادا کر چکے ہیں، میری
غائت صرف یہ ہوگی کہ واقعی اوصاف کے ساتھ اس تالیف کی تقریب پبلک میں اس
حیثیت سے کی جائے جس سے کسی غلط فہمی کا اگر قبل از وقت پیدا ہو گئی ہو استیصال ممکن ہو۔
بہر حال میرا دعویٰ یہ ہے کہ ترجمہ شستہ، رفتہ، صاف اور اس قدر لطیف ہے کہ
مستقل کتاب کا دھوکا ہوتا ہے، یعنی اصل مصنف کے خیالات یا مسائل تاریخی اس طرح
مترجم کے دماغ میں پیوست معلوم ہوتے ہیں کہ وہ مجدداً اپنی زبان اور اپنے الفاظ میں
ان کو بے ساختہ ادا کرتا ہے۔ اور یہی وہ امتیازی حیثیت ہے جو لائق مترجم کو مولفین کی عام
رفتار سے بہت آگے ڈال دیتی ہے۔ لطف یہ ہے کہ ساری کتاب میں کہیں سے پیچیدگی
نہیں، تعقید نہیں۔ نازک سے نازک فلسفیانہ بحثیں معمولی روزمرہ جہاں تک ساتھ دے
سکتا تھا۔ اس برجستگی کے ساتھ اردو قالب میں ڈھالی گئی ہیں کہ دماغ پر زور ڈالنے کی ضرورت
نہیں ہوتی۔ نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والے کو کچھ اہتمام کرنا پڑا، غرض دقیق سے دقیق مطالب
بھی اجنبیت یا غرابتِ الفاظ کے تابع نہیں ہیں۔ مختصر یہ کہ تاریخی لٹریچر کیلئے جس اسٹائل
یعنی خاص طرز تحریر کی ضرورت ہے، وہ ضرورت کامل احتیاط کے ساتھ پوری کی گئی ہے
اور سخت چھان بین کے ساتھ بھی کوئی رکیک امر ایسا نہیں ملتا جو متانت تالیف سے گرا ہوا
ہو، میں نہیں جانتا اس سے زیادہ ہماری توقعات کیا ہو سکتی ہیں۔

میں امید کرتا ہوں کہ میرے مخاطب صحیح : وہ لوگ نہیں ہیں جو تمدن عرب میں وہ زبان ڈھونڈتے ہیں جو شوقؔ یا قلقؔ کی مثنویوں میں لکھی گئی ہے، یہ جاہلانہ گروہ سرے سے لائق التفات ہی نہیں ہے۔ سچ یہ ہے کہ تاریخی فلسفہ کے لئے جس طرز تحریر کی ضرورت ہے۔ وہ خود ایک مستقل اسٹائل ہے جس کی اولیت کا فخر شبلیؔ اور سید علیؔ کے حصے میں رہے گا، جو حضرات اپنی لکیر پیٹے جاتے ہیں، ان کو یاد رکھنا چاہیئے کہ " عمارت کی ترمیم ہوگی، یا عمارت خود نہ ہوگی۔

مختصر یہ کہ میری رائے کا میلان طبعی یہ ہے کہ اردو زبان میں ایک قیمتی اضافہ کی حیثیت سے یہ کتاب مفروضہ نقائص کے ساتھ بھی اس لائق ہے کہ انیسویں صدی کے معظمات الامور میں محسوب ہو، بالتخصیص نفس مضمون کے لحاظ سے جو نہایت اہم اور قابل غور ہے، لیکن کم سے کم نصف صدی کے بعد شاید یہ مذاق پیدا ہوگا کہ ہم اس قسم کی تالیف سے مانوس ہوسکیں، جو میرے خیال میں بہیئت مجموعی اس قدر دقت نظر چاہتی ہے کہ میں مایوس ہوں۔ آیا ایک کم سواد شخص جس کا سرمایۂ ناز صرف اردو کی زبان دانی ہو، اس کی نگاہ ان فلسفیانہ نکات تک پہنچ سکتی ہے جو ترجمہ کے اجزائے کیمیائی ہیں۔

ان جزئیات کی تفصیل کے سلسلے میں غالباً میں اس لائق ہوگیا ہوں کہ اختلافی مسئلہ میں ایک کافی حد تک آپ ہم سے اتفاق رائے کے لئے آمادہ ہوجائیں یعنی جس طرح ترجمہ کی ذمہ داریاں نہایت سخت ہیں، آپ کو تسلیم کرنا ہوگا کہ صرف سید علی ہی اپنے عالمانہ اوصاف کے ساتھ ایسے ضخیم ترجمہ کا کفیل ہوسکتا تھا، اور اس لئے یہ سخت ناشکری ہوگی کہ اس کی قابل قدر کوششوں کا فیاضانہ اعتراف نہ کیا جائے۔

میرا خیال ہے کہ آپ نے بے پروائی سے ایک غلط رائے کی پیروی کی، لائق مترجم

کی حق تلفی کے سوا یہ ایک شرمناک لغزش تھی کہ ایک ذمہ دار ایڈیٹر کا قلم ذاتی تحقیق سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتا، جس سے پبلک کو غالباً اخلاقی نقصان پہنچنے کا احتمال ہو سکتا ہے میں نے آپ کی ذمہ داریوں کے لحاظ سے کسی قدر سختی سے آپ کو ٹوکا ہے مگر یہ پیرایہ خود آپ کے اعزاز کی تائید میں ہے، جس کے لئے میں امید کرتا ہوں کہ آپ مجھے معاف فرمائیں گے۔

میں نے قصداً ایسے امور نظر انداز کر دیئے ہیں جن سے انسانی تصنیف خالی نہیں ہو سکتی کسی آئندہ موقع پر "تصویر کا رخ بتر گوں" بھی دکھلاؤں گا۔ سردست میں نے صرف کتاب کی تقریب پر قناعت کی ہے۔ کیونکہ میرا خیال ہے کہ بحیثیت مجموعی یہ ترجمہ ایک نہایت عظیم الشان کوشش ہے۔

اگر آپ پسند فرمائیں گے تو میں اپنی دوسری چٹھی میں تاریخی فلسفہ یا اس کے موضوع اور اس کی ضرورت سے بحث کروں گا اور دکھاؤں گا کہ یورپ کے تمام سرمایۂ تاریخی میں جو اقوام دنیا سے متعلق ہیں، اصل تصنیف (یعنی ماخذ تمدن عرب) کس پایہ کی ہے جس سے میرے احباب اندازہ کر سکیں گے کہ تاریخ عالم کے سلسلے میں مسلمان فلسفیانہ اور تمدنی حیثیت سے نسبتاً کس درجے پر ہیں، ایشیا کیلئے یہ بالکل ایک جدید بحث ہے جس کے لئے ہم کو یورپ کا بہت ممنون ہونا چاہیئے۔

تمدن عرب

اور

پروفیسر شبلی

فاضل پروفیسر نے اپنی ایک جدید تالیف تہذیب کی حیثیت سے سلسلۂ آصفیہ کی فہرست میں داخل کی ہے۔ اور سلسلۂ آصفیہ کی تقریب ان الفاظ میں کی ہے۔

"ہمارے معزز و محترم دوست شمس العلماء مولانا سید علی بلگرامی بجمیع القابہ" کو تمام ہندوستان جانتا ہے، وہ جس طرح بہت بڑے مصنف، بہت بڑے مترجم، بہت بڑے زبان دان ہیں، اسی طرح بہت بڑے علم دوست اور اشاعت علوم و فنون کے بہت بڑے مربی و سرپرست ہیں، اس دوسرے وصف نے ان کو اس بات پر آمادہ کیا کہ انھوں نے نواب سر وقار الامرا بہادر کی خدمت میں یہ درخواست کی کہ "ہز ہائینس نظام کے سایۂ عاطفت میں علمی تراجم و تصنیفات کا ایک مستقل سلسلہ قائم کیا جائے جو سلسلۂ آصفیہ کے لقب سے ملقب ہو، اور وابستگان دولت آصفیہ کی جو تصنیفات خلعت قبول پائیں وہ اس سلسلہ میں داخل کی جائیں" وقار الامراء کو علوم و فنون کی ترویج و اشاعت میں جو التفات و توجہ رہی، اور جس کی بہت سی محسوس یادگاریں اس وقت موجود ہیں، اس کے لحاظ سے جناب ممدوح نے اس درخواست کو نہایت خوشی سے منظور کیا، چنانچہ کئی برس سے یہ مبارک سلسلہ قائم ہے اور ہمارے شمس العلماء

کی کتاب "تمدنِ عرب" اسی سلک کا ایک بیش بہا گوہر ہے۔

تمدنِ عرب، اور اس کے مترجم کی نسبت یہ اس شخص کی رائے ہے جو با عتبار وسیع النظری، اور مذاقِ تالیف، یورپ کے کسی مورخ سے پیچھے نہیں ہے، اور ملک میں مؤرخانہ عظمت کے لحاظ سے غالباً معلمِ اوّل سمجھا جاتا ہے۔

یہ حسنِ اتفاق ہے کہ گزشتہ اشاعت کے سلسلے میں تا ہنوز مجھ کو ایک زبردست رائے پیش کرنے کا موقع ملا جو بدیقینی اکثر شائقین کے تاریخی مذاق کو ابھارے گی یہ اقتباس اس حیثیت سے "عین وقت کی چیز ہے" کہ جو لوگ تمدنِ عرب سی کتاب کا (جس کے تاریخی اجزاء کم و بیش ہزار صفحوں پر قابض ہیں) بہ لحاظِ فن کوئی صحیح اندازہ کرنے سے معذور رہیں، کسی حد تک ان کے خیالات پر اس سے روشنی پڑے گی، اور وہ غیر طبعی سکون جو علمی دلچسپیوں کی طرف سے دیسی طبائع میں عموماً پایا جاتا ہے آئے دن کی چھیڑ چھاڑ سے غالباً تحریک میں آئے گا۔

اگر یہ ہوا تو میں سمجھوں گا کہ مجھ کو اپنی غایت میں امید سے زیادہ کامیابی ہوئی کیونکہ دراصل مقصود بالذات صرف یہی ہے، ورنہ کسی تالیف یا مؤلف کا کوئی ہو، نقیب بننا بنانا منظور نہیں، ملک کے اچھے لکھنے والے میرے آپ کے اعتراف سے، جو شاید تحسین ناسپاس، سے کچھ ہی بڑھ کر ہے، عموماً بے نیاز ہوتے ہیں، وقت اور مذاق صحیح آپ اُن کے نتائجِ افکار کی قدر کرائے گا۔

پروفیسر شبلی کی تالیف موعود (الفاروق) میں جس کا ذکر ضمناً آ گیا، اور جس پر ریاض الاخبار میں ایک نوٹ دیا گیا ہے، نہایت خوشی کی بات ہے کہ شائع ہو گئی، اور برسوں کے بعد حالت منتظرہ رفع ہوئی، یہ گوہرِ شب چراغ، اسی قیمتی سلک (سلسلہ آصفیہ)

کا ایک خوش آب ہوتی ہے جس میں تمدن عرب کے اجزا پروئے گئے ہیں غالباً عمروں کی کمائی ہے، بڑی کاوش و اہتمام سے سالہا سال کی مورخانہ تلاش اور تدقیق کے بعد ناموران اسلام کے سلسلہ میں خلیفہ دوم حضرت عمرؓ کی لائف پر یہ ضخیم تالیف تیار کی گئی ہے، مورخ نے محض تحقیق واقعات کے لئے ممالک غیر یعنی ٹرکی و مصر وغیرہ کے مصائب سفر برداشت کئے، سیکڑوں قدیم و نایاب تاریخوں کے ہزارہا ورق الٹنے پڑے، اور جہاں تک دسترس تھا، اصلی ماخذ کی چھان بین میں یورپ کا تاریخی سرمایہ بھی بچنے نہیں پایا۔

غرضکہ معلومات کا جو ذخیرہ جمع کیا گیا ہے وہ میرے خیال میں تاریخ فاروقی کے مہمات مسائل ہیں جن کی نسبت یہ عام دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ کسی زبان میں بقدر مواد یکجا نہیں مل سکتا،

ایسی بے نظیر تالیف چاہتی ہے کہ مستقلاً ایک تفصیلی نظر اس پر ڈالی جائے مگر یہ لائق لوگوں کا کام ہے اور جس طرح ایک جلتا ہوا شاعر اوروں کی طبع آزمائی کے بعد قلم اٹھانا پسند کرتا ہے، میری خواہش ہے ذرا بڑے لوگ کچھ لکھ لیں پھر دیکھوں گا مگر مشکل یہ ہے کہ آج جن کے قلم کا لوہا مانا جاتا ہے وہ ہمعصرانہ کوششوں کے اعتراف میں عموماً ممسک ہوتے ہیں، اور صرف اس لئے کھل کر کسی چیز کی داد نہیں دیتے کہ وہ ان کے دماغ کی پیداوار نہیں ہے، حالانکہ یہ قابل افسوس اخلاقی کمزوری ہے

یہ چند سطریں جہاں تک الفاروق کا تعلق ہے صرف اشتہاری حیثیت سے ہیں، امید ہے ملک عام طور پر دست شوق بڑھائے گا، محض شبلی کا نام کافی ضمانت ہے۔

میری پہلی نظر بوجوہ اپنے پیارے دوست ڈاکٹر ابوظفر پر پڑتی ہے جو غالباً
کتابی اوراق کو کرنسی نوٹ کے کاغذ سے قیمتی سمجھتے ہیں، کتاب بھی ایک مادی چیز
ہے مگر بہ تبدیل ہیئت۔

روشن خیال شیخ محمد کے ہوتے گورکھپور کی بدنصیبی ہوگی، اگر کیلنگ لائبریری
کے آغوش میں سلسلہ آصفیہ کے یہ قیمتی نمونے (تمدنِ عرب والفاروق) پیش
پیش نہ ہوئے۔

۵۱

علامہ نذیر احمد ایل ایل ڈی

اور

انسائیکلو پیڈیا آف اسلام

ملک کے اس فاضل اور نہایت زبردست ادیب کو ہم نے شروع شروع ان کی حیثیت سے جانا پہچانا کہ چند کتابیں عورتوں کے فوائد اور عام واقفیت کے لیے ان کے قلم کے سایہ میں نکلیں، رفتہ رفتہ یہ سوسائٹی کے نمایاں نقائص کی طرف متوجہ ہوئے، اور اور ایک سلسلہ مفیدتر تصنیفات کا شائع ہوتا رہا، جسے ملک نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ "رویائے صادقہ" جو اس سلسلہ کی سب سے پچھلی کتاب ہے، بالتخصیص لائق ذکر ہے۔

تاہم بحیثیت مجموعی اس درمیان میں یہ زیادہ سے زیادہ ناولسٹ رہے، لیکن جس زمانہ سے ان کے لیکچر شروع ہوئے، ان کی غیر معمولی قابلیت کے جوہر کھلنے لگے۔ ناولوں کی بنیاد چونکہ اسلامی اخلاق پر رکھی گئی تھی، اس لیے وہاں بھی سنجیدگی کی کمی نہیں تھی، مگر لیکچروں نے بتایا کہ ان کی متانت تصنیف سنجیدہ تر اغراض علمی کے لیے زیادہ تر موزوں تھی۔ اعلیٰ درجے کی عربیت کے ساتھ بے مثل قدرت بیان، وسیع ذخیرہ الفاظ اور وہ تصرفات جو جدت خیال اور ظریفانہ نکتہ سنجیوں کے لحاظ سے صرف اس شخص کا حصہ ہیں، لٹریچر کی جان ہیں، اس پر اضافہ کیجئے اردو اسی کم مایہ زبان کا ایسے شریفانہ قالب میں ڈھلنا، جس پر کلاسکس کا دھوکا ہو، ان کو

قارئاف اردو ما بینے سے پہلے تسلیم کرنا ہوگا کہ مشرقی (عربی، فارسی) ان کے لیے
زبان غیر نہیں، اور جب ماخذ پر اس قدر عبور ہے تو اردو صرف اپنی چیز ہے، لیکن
با وصف ان کے وسیع عالمانہ اوصاف کے جو ایک حد تک ان کے ہمعصروں کو مرعوب
کرنے والے ہیں، میں آج تک یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ ان کی فطری قابلیت اور اعلیٰ مذاق
سنجی کی آزمائش کا بہترین پیرایہ کیا ہو سکتا ہے، جس طرح یہ پرلنے نادلسٹ اور بینے
لکھ رہے ہیں، ممکن ہے کہ لٹریچر کی کسی صنف میں جو اس سے بھی زیادہ اہم ہو، یہ کوئی بڑا
کام کر سکیں۔

بے شک ترجمہ قرآن ایک مہتم بالشان کوشش ہے، جس کے لیے آئندہ نسلیں بھی
ان کی ممنون رہیں گی، تاہم میں نہیں جانتا اس سے کیا چاہتا ہوں، غالباً کوئی مستقل
سلسلہ تصنیف، جس میں گہرا، اعلیٰ اور فلسفیانہ رنگ ہو، تاریخ شبلی کے حصہ میں
رہی، بیاگرمی حالی لے بیٹھے، اور دونوں حضرات سچ یہ ہے کہ اپنا پوزیشن قائم
رکھنا خوب جانتے ہیں۔

یہ کچھ نہ کرتے، آنحضرت (صلعم) کی ضخیم لائف لکھ دیتے، تو زبان اور خیالات
دونوں کا حق ادا ہو جاتا، مگر اس شرط کے ساتھ کہ وہ طرزِ تحریر کے لحاظ سے بیسویں
صدی کی تالیف ہو، بعض لوگوں کو غالب کی طرح ان کی مشکل پسندی کا رونا ہے اور
وہ پیوندکاریاں، جو ان کی شستہ، رفتہ اور برجستہ اردو میں ہوتی رہتی ہیں، جس میں انگریزی
زیادہ بے محابا ہوتی ہے، عام خیال ہے کہ ثقیل سے خالی نہیں ہیں لیکن انصاف یہ ہے کہ
یہ سب ان کی جدت اور اختراع اور قوتِ اخذ کا زور ہے، آمد کی رو میں اضطراری
طور پر اپنے پیرائے کی تفریق نہیں ہو سکتی، اور یہی وجہ ہے کہ بعض حصے بہ لحاظ ترکیب

تحلیل اجزائے السنہ وغیرہ گنگا جمنی ہوتے ہیں، تاہم متانت اور حسن کلام سے کبھی علیحدہ نہیں
ہوتے جو ان کے کلاسیکل لٹریچر کا خاصۂ طبعی ہے، نہ ان کے اچھوتے اور مستقل اسٹائل
پر کوئی اثر پڑتا ہے، جو شاعریٔ عام سے بعید، اور آپ اپنی نظیر ہے جو باتیں اوروں کے
ہاں بے گانی ہیں، ان کی بے ساختگی اور برجستگی خیال کے ساتھ سلسلۂ بیان
میں اس طرح جذب ہو جاتی ہے کہ مغائرت یا اجنبیت کا احساس تک نہیں ہوتا،
پھر بھی جہاں تک اس حیثیت سے اعتراض کی گنجائش ہے، ادب چاہتا ہے کہ سبک
نکتہ چینیوں سے ان کا کمال ہمیشہ بے نیاز رہے گا۔

ہاں ان لیکچروں کے متعلق ایک بات کھٹکتی ہے، یہ مجموعہ جہاں تک اسلام اور
تعلیم کا تعلق ہے ایک زبردست سرمایۂ علمی ہے، اور اس لائق کہ قوم کے لکھے پڑھے
لوگ اسے پیش نظر رکھیں، اسلام کے اصلی مشن، یعنی توحید کو حشو و زوائد سے علیحدہ
کر کے اس کی اصلی وسعت میں اس خوبصورتی سے پیش کرنا جو فسانۂ دلچسپ کی
حیثیت رکھتا ہو، اور جس سے بہتر کوئی پیرایہ خیال میں نہیں آسکتا، لیکچرار کی معرکۃ الآرا
کامیابی ہے، مگر عموماً ان کے لیکچر کوئی مستقل عنوان نہیں رکھتے۔ جس سے یہ اندازہ کرنا
ممکن ہو کہ کہاں تک نفس مضمون کی حیثیت سے یہ خارج از موضوع یا حدود مقررہ
کے اندر ہے جس طرح پڑھنے والے کو کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ کسی خاص موضوع پر وہ
کچھ دیکھ رہا ہے، لکھنے والے کی بھی کوئی غایت حصر کچھ معلوم نہیں ہوتی۔ ایسی حالت
میں ان کا ہر لیکچر، اگر میں غلطی نہیں کرتا تو خود رو ریمارکس کا مجموعہ ہے جس میں مقصود
بالذات، صرف قوم کی حالت یا اس کی ضروری اغراض پر کچھ کہہ سن دینا ہوتا ہے۔
یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کی طبیعت میں استطاعت فطری، یعنی صلاحیت

نہیں ہے کہ خیالات کو کسی خاص عنوان کا پابند کر سکیں، ان کا مرتبہ انشاپردازی چاہتا ہے کہ ہم مان لیں کہ یہ قصور صرف طرز بیان کا ہے جو اظہار فصاحت میں کسی چیز کا محکوم نہیں ہوتا اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اکثر ٹو دی پوائنٹ نہیں ہوتے۔

اس خاصہ نے ان لکچروں کی وقعت کو کسی قدر نقصان پہنچایا ہے جو اپنے خصائص نوعی کے ساتھ بھی اتنے اہم ہیں کہ آج قوم کا خدلسۂ نثر لٹریری دنیا میں جہاں تک کہ پاکیزہ اور سلجھے ہوئے خیالات کے ساتھ بے مثل فصیح البیانی اور رفیع انشاپردازی کا تعلق ہے، اپنے معاصرین سے علانیہ ممتاز ہے۔ مگر یہ کمال جس کا حصۂ غالب اکتسابی نہیں، بلکہ وہبی ہے، ان کے دل و دماغ کے نتائج کو اور زیادہ ابھار کر دکھاتا، اگر متفرق عنوانوں کے تحت میں تمام ضروری اور وقتاً فوقتاً زیر بحث رہتے جن کا تعلق ہماری کو بوجوہ سخت ضرورت تھی، ایک ایک کر کے طے کر دیئے جاتے، جن میں من حیثیت الموضوع اتنی جامعیت ہوتی تھی کہ ہر مضمون ایک قول فیصل ہوتا۔

میری یہ توقعات مصنف کے درجہ کے لحاظ سے زائد از استحقاق نہیں ہیں، دیسی سوسائٹی کے نقائص اور فطرت انسانی کے وہ دقیق راز جو بہ سبب غایت ظہور کے عام نگاہوں سے پوشیدہ ہیں، فاضل ادیب کی نگاہ جیسی گہری ان پر پڑتی ہے تقلیداً بھی اوروں سے ممکن نہیں، ثبوت کے لئے دیکھئے "رویائے صادقہ" کا وہ حصہ جہاں دہلی کی سوسائٹی کا خاکہ کھینچا ہے، میرے خیال میں دو سطریں بھی اس سے بہتر نہیں لکھی جا سکتیں، یہ ایک سرسری نمونہ ہے ان قیمتی آثار کا جو قریب قریب ان کے ہر حصہ تصنیف میں، مل سکتے ہیں، بہرحال کثرت سے متعلق عنوانوں پر لکھنا ایک ضرورت ہے

جس کی رعایت اگر نہ کی گئی تو باوصف صنائع لفظی و معنوی اور فاضلانہ تراش خراش یعنی
غایت نکتہ سنجی کے جو بہیئت مجموعی لیکچروں کی روح رواں ہے۔ یہ مجموعہ من حیثیۃ الفن
لیکچرار کے مرتبۂ کمال کو دیکھتے گرا ہوا رہے گا، پچھلے لیکچروں کو دیکھیے، کثرت تعداد اور
ایک ہی قسم کے خیالات! خلافِ الفاظ ملیں گے، اور گو ظرافت اور طباعی ان مجموعہ
الفاظ میں ہمیشہ تصرف کرتی رہتی ہے، جو بار بار ایک ہی موضوع پر کیے گئے ہیں جس کا
نتیجہ یہ ہے کہ مشکل سے ان کی نثر کا کوئی حصہ بار ہوتا ہے۔ لیکن نرے الفاظ کتنے ہی
خوشگوار لباس میں ہوں، نفسِ مضمون کی سستی اور ہم طرحی کی کہاں تک تلافی کر سکیں گے۔

اس ضمن میں مجھ کو بالتخصیص ان سے جو شکایت ہے، یہ ہے کہ انگریزی گورنمنٹ کی
برکات یعنی ان فوائد کے ذیل میں جو ملک کو پہنچتے ہیں، یہ عادتاً قریب قریب ہر لیکچر میں جن
اہم چیزوں کا ذکر کرتے تھے، وہ سوئی، پیچک، دیا سلائی اور چاقو وغیرہ وغیرہ ہی سب
ہوتی ہیں جو ادنیٰ درجہ کے بساطیوں کے مقابلہ میں ان کے ہاں زیادہ سستی ہیں۔ یا تو ان چیزوں
سے اتنی مساوات ہو گئی ہے کہ انیسویں صدی کی ایجادات میں انھیں سر فہرست دیکھنے
کو جی نہیں چاہتا، واقعی یہ ہے کہ ان کی انشا پردازی ان چیزوں کے نام سے ہم سطح
نہیں ہو سکتی، بہر حال کثرتِ توارد گراں گذرتا ہے، نظر ثانی میں یہ حصہ نکال دیا جاتا تو
اچھا تھا۔

اس کا بھی افسوس ہے کہ ان کے لیکچر اب زیادہ سے زیادہ ترجمۂ قرآن کے
اشتہار ہوتے ہیں، پھیکے بے لطف، جن میں نسبتہً کوئی جدت نہیں، دلچسپی نہیں، خیال
کے ساتھ الفاظ کا ذخیرہ بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ختم ہو چلا تھا گویا کہ ہمارا آخری سہارا
یہی تھا کہ مختلف موقعوں پر جو کچھ ان کی زبان و قلم سے نکل جاتے ہمارے لیے پھر بھی اک

چیز ہوگا، میں نے نہایت غور سے یہ بات پیدا کی ہے کہ جس طرح ناولوں میں یہ رعایت فن بیانی
قادرالکلامی کی وجہ سے بے تکلف اظہارِ خیال کرسکتے ہیں، لٹریچر کے وہ اجزاء جن کا موضوع زیادہ
اہم اور سنجیدہ ہے (مثلاً تاریخ وغیرہ) جن میں وسعت نظر کے ساتھ تحقیق و تنقید، قوت استقراء،
تفریع مسائل، حسن ترتیب اور غیر انضباط خیال کی ضرورت ہے، یہ قصداً اس طرف
نہیں آتے، یہ وہی آزادی ہے جس کا اثر لیکچروں پر دکھایا گیا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ
ہم ان کی طرف سے کسی ضخیم تالیف کے فوائد سے جو ان کی مستثنیٰ قابلیت کے یکھتے ہوئے
ہمارا انتہائی تخیل ہوسکتی ہو آج تک محروم رہے۔

حدیث و سیر میں ان کی وسیع النظری جس کا لوہا مانا جاتا ہے، میں نہیں جانتا
اس وقت تک کہاں تک مدد ہوسکتی ہے، جب تک مذہبی تحقیقات کی بنیاد جدید علم کلام
یعنی انیسویں صدی کے سائنس پر نہ رکھی جائے، لیکن ان کے لائق رشک دل و
دماغ کا جو مصرف میں نے سوچا ہے، اس سے بہتر خیال میں نہیں آسکتا ... ان
کی موجودہ تصنیفات کو ان کے مرتبہ کمال کے مقابلہ میں اگر غیر کافی سمجھا ہے تو صرف اس وجہ
سے کہ آج جتنی عظمت ان کی میرے دل میں ہے، میں خود اس کے صحیح اندازہ سے قاصر ہوں
جب تک شمس العلمائی تھے خیر ایک بات تھی۔ اب ڈاکٹر ہوئے اور کسی طرح معمولی میں نہیں
آتے، تصنیفات میں بھی لازماً حکیمانہ رنگ ہونا چاہیے، اس لیے نہایت مناسب ہوگا
اگر یہ اردو میں "قاموس الاسلام" لکھ ڈالیں، میری مراد ایک ایسے مجموعۂ لغات سے ہے
جس میں تمام الفاظ و اصطلاحات جو اسلام سے مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی یعنی کسی
حیثیت سے کوئی تعلق رکھتے ہوں۔ بہ ترتیب حروف جمع کردیئے جائیں اور ہر لفظ کے
مقابلے میں داد تحقیق دی جائے، معمولی لغات میں ہم صرف مادہ الفاظ، لغوی اور اصطلاحی

مفہوم روزمرہ اور محاورہ یا اسی طرح کے اور سرسری امور سے غرض ہوتی ہے، مگر سائیکلوپیڈیا یں مصطلحات ایک مستقل حیثیت رکھتے ہیں۔ ہر لفظ کی گویا ایک مختصر سی تاریخ لکھی ہوگی اور اور بہ لحاظ نوعیت جس قسم کی معلومات درکار ہوں گی بحث کا کوئی پہلو چھوٹنے نہیں پائے گا۔

طرز تحقیق جہاں نری زباں دانی سے کام نہ چلے کہیں مورخانہ ہوگا، کہیں محدثانہ اور کہیں دونوں پہلوؤں سے الگ عالمانہ و مجتہدانہ روش ہوگی جو امور تاریخ سے متعلق ہیں ان یں وہ شہادتیں کافی ہوں گی جو عام مورخین کے نزدیک مسلم اور متفق علیہ ہیں جو مسئلہ محدثانہ پہلو رکھتا ہے اس میں زیادہ تر تدقیق کرنی ہوگی، اور تمام پرانے اصولوں سے کام لینا ہوگا جو محدثین نے اخبار و روایت کی تنقید کے لئے قرار دیئے ہیں، مگر تحقیقات کے سلسلے میں وہ الفاظ و اصطلاحات جن کے تحت میں روایات ضعیف و ردود لڑکا قصے قدیم تفسیروں میں بھرے ہوتے ہیں۔ ان کی تدقیق قطعًا اصول عقلی اور لا آف نیچر سے کرنی ہوگی، ورنہ یہ تالیف اپنی مخصوص صفحات کے ساتھ بھی ایک مجموعہ بے کیف یا تقویم پارینہ سے کچھ ہی بڑھ کر رہے گی، اور یہ منظور نہیں،

صائب الرائے مصنف کا اسلامی علام یعنی قرآن، حدیث، فقہ، معازی، مذاہب سلف، لغت، قیاس، وغیرہ میں زائدانہ کافی دستگاہ رکھنا ایک کھلا ہوا راز ہے جس پہ کچھ روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں، اس پہ ان کی غیر معمولی ذہانت بلکہ استخراج اور تدوین و استدلال کی وقعت کو بڑھائیے تو جامعیت کا دائرہ بوجہ احسن پورا ہو جاتا ہے، اس کے ساتھ میری خاطر سے مان لیجئے کہ منتشر معلومات کا ایک بہت بڑا حصہ ایسا ہوتا ہے جو کسی خاص سلسلہ میں مدون نہیں ہو سکتا اور عموماً بے کار ہو جاتا ہے، یہ ایک واقعہ ہے کہ میرے مخاطب صحیح کو ابتدائی درس و تدریس کے زمانے سے آج تک جب وہ ایک

گراں پایہ مصنف اور لیکچرار کا درجہ رکھتے ہیں، بہتیرے نہایت دلچسپ مواقع تحقیق پیش آتے ہوں گے
جن کے نتائج ان کے سینے میں کچھ مقفل ہیں، کچھ تلف ہو گئے، میرے خیال میں صرف پیش کردہ
تالیف میں یہ وسعت و استعداد ہے کہ وہ ان کے عمیق جذبات اور مخفی قابلیتوں کو
ہیجان میں لائے جس سے دفینہ غیر محسوس یعنی معلومات متفرق کا ہیولی مجموعی کتابی صورت
صورت پیدا کر سکے۔

مختصر یہ کہ اس تقریب سے ایک اور بیش بہا مجموعہ تیار ہو جائے گا، اور ایک ایسی
ضرورت رفع ہو جائے گی جس کی علامہ نذیر احمد کے ہوتے کسی اور سے امید کرنا ان
کی حق تلفی کرنی ہے، یہ لٹریچر کے گراں وزن حقوق سے سبکدوش ہو جاویں گے اور ملک و
قوم کو جو فائدہ پہنچے گا وہ متعدی اور متوارث ہوگا۔

قوم کے نوجوانوں کے لئے جہاں دماغی اور عقلی ترقیوں کی آج کل کوئی حد نہیں
ہے، مذہبی عنصر جو قومیت کی روح ہے قریب قریب فنا ہوتا جاتا ہے اور ایک وقت
آئے گا جب انتہائی مغربی خیالات کے ساتھ ہماری نئی پود معمولی مذہبی الفاظ سے
ناآشنا ہو گی، جو اسلام کی حق تلفی کا بدترین پیرایہ ہے،

اگر سویلیزیشن اور سائنٹیفک ترقیات کے ساتھ بھی بقائے مذہب کی ضرورت
ہے تو میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ سب سے پہلے جدید نسلوں کے ہاتھ میں ایک
ایسی تالیف دینی ہو گی جو جامع معقول و منقول ہو، اور جس میں اسلام کے اصول و فروع
پر حصول اطلاعات کا اتنا بڑا ذخیرہ موجود ہو جو انہیں آئندہ صدیوں میں واقفیت عامہ
کے لحاظ سے ہمارا بہترین رہنمائے مذہب ہو سکے، گو اس تالیف کی نسبت یہ دعوی نہیں
کیا جا سکتا کہ عام پسند ہو گی بالفاظ دیگر امید نہیں کہ مولف کو مالی حیثیت سے کوئی

معاوضہ مل جائے لیکن میرے خیال میں بہ لحاظ اس شریفانہ غایت کے جو تالیف کا مقصود ہے، اس حیثیت سے قطع نظر کر لینی چاہئے، اس کا خاص پسند ہونا بجائے خود ایک قیمتی صلہ ہے، جو اولوالعزم مولف کو اگر میں صحیح رائے قائم کرنے کے لائق ہوں مالی قدر دانی کی طرف سے قطعی بے نیاز کر دے گا۔

ایک انگلش پروفیسر نے انگریزی میں ایک ضخیم "ڈکشنری آف اسلام" لکھی ہے، جو کہ دو پونڈ دو شلنگ کو ملتی ہے، اس کا جدید ایڈیشن آجکل میرے مطالعہ میں ہے، مگر یہ ایک ایسے شخص کی تحقیقات کا نتیجہ ہے جس کو ظاہراً اسلام یا پیغمبر اسلام سے کوئی ہمدردی نہیں معلوم ہوتی، اور گو اس کی مرتب تحقیقات کا ماخذ اصلی تصنیفات یعنی عربی کتابیں ہیں۔ تاہم اکثر موقعوں پر وہ میور یا اور متعصب عیسائی عالموں کا ہم آواز ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو مہتم بالشان مسائل تھے ان ہی میں دانستہ ٹھوکریں کھائی ہیں، پھر بھی تحقیق اور وقتِ نظر کی حیثیت سے اس قابل قدر مجموعہ کے مولف کی کوششیں ہر طرح لائق اعتراف ہیں بہر حال ڈاکٹر نذیر احمد کی جامعیت پکار رہی ہے کہ "انسائیکلوپیڈیا" کی تکمیل کے لئے ان کو اپنے دائرہ معلومات کے نتائج جس حد تک وسیع کرنے ہوں گے ان کا کفیل دنیائے اسلام میں ان سے بہتر شاید کوئی نہیں ہو سکتا، صرف یورپ سے میٹریل فراہم کرنا ہوگا، اور یہ ان کی زائد ضرورت خوش حالی اور فرصت کو دیکھتے بڑی بات نہیں۔

مجھ کو اعادہ کرنا پڑتا ہے کہ تبحر علمی، فطری ذوق مناسبت، تحقیق کی کاوش اور وثوق کامیابی جو ان کے خصائص میں سے ہے، یہ وہ اسباب ہیں جن سے بہتر اس تالیف کے لئے خیال میں نہیں آسکتے اور جب یہ دیکھتے کہ تحقیق کا سلسلہ ہر لفظ کی ضروری تشریح کے ساتھ ختم ہو جاوے گا تو نسبتاً اس کے لئے آسانی کی کوئی حد نہیں

رہتی، میرا خیال ہے ملک کے اس رفیع المرتبت انشاپرداز کی یادگار جس سے آئندہ نسلیں کوئی صحیح اندازہ کمال کرسکیں "قاموس الاسلام" کے سوا اور کچھ نہیں ہے، جس طرح ملک آج ان کا لوہا مانتا ہے، یورپ میں بھی استفادۂ ان کی اریجنل تحقیقات اور تلاش کے ثمرے عزت کی نگاہ سے دیکھے جائیں گے، زمانہ کتنی ہی ترقی کرے، اس علم کے پتلے کو پیدا نہیں کرسکتا جس کا کوئی رونگٹا بے کار نہیں، جہاں تک لائق ادب مشرقیت کا تعلق ہے، قوم کی یہ آخری بہار تھی جس کے اجزا کچھ اٹھ گئے، کچھ باقی ہیں قدیم علوم کے نام لیوا دو چار سے زیادہ نہیں ہیں، جس مربی مرحوم عربی کو آج ہم بیسویں صدی میں ڈھونڈھتے ہیں، علامہ نذیر احمد کے ساتھ دفن ہوجائے گی، مگر میرے منھ میں خاک ان کا حصہ غیر فانی یعنی "انسائیکلو پیڈیا آف اسلام" مرنے والی چیز نہیں، وہ اپنی بقائے دائمی کی آپ ضامن ہے اور یہی انسان کا بڑے سے بڑا تخیل ہوسکتا ہے، جس کی طرف میں ان کو تھوڑی دیر کے لئے متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔

بیسویں صدی کا آغاز

اور

دماغی صحبت غیر قانیوں سے

ساٹھ صدیاں یعنی چھ ہزار برس گزرے کہ قدیم اہل بابل[1] نے پہلے پہل اپنے خیالات، اپنی قوم کی تاریخ اور دنیا کی نسبت جو خاص طرح کے تصورات وہ رکھتے تھے ان کی یادداشت کے لیے مٹی کی اینٹوں کا استعمال کیا، ان کے بعد مصریوں اور عبرانیوں کا زمانہ آیا، جو درخت کی چھال پر اپنے خیالات کا نقش جماتے رہے، پھر کلاسیکس کے دور زرین کا آغاز ہوا، یعنی رومیوں اور یونانیوں نے فرد جمی یہ اپنے نو ایجاد قلم کی روانی دکھائی، جس کی نقلیں تیز دست غلام تیار کرتے تھے اور جس کے بہترین حصے وسعت کے ساتھ ملک میں شائع کئے جاتے تھے، اس کے بعد عہد ظلمت نے عارضی تاریکی پھیلائی، جس کی تلافی مافات یادش بخیر نشاۃ الثانیہ[2] کے دور نے کی، جس کے ساتھ چھاپہ کی ایجاد آئی، اور ہماری موجودہ دنیا اور اس قدر

---

[1] بغداد سے جانب جنوب، وہ حصہ جس میں ہو کر دریائے فرات بہتا تھا، یہ کلدانیوں کا مشہور دارالسلطنت قدیم زمانے میں روئے ارض پر سب سے بڑا اور پر رونق شہر تھا، تیرہ لاکھ کی آبادی تھی تفصیلی حالات کے لیے "انسائیکلوپیڈیا انڈیکا" اور "المبشر" ۲۷ر جنوری ۱۹۰۲ء

[2] چودھویں اور پندرھویں صدی میں یورپ جہالت کی تاریکی سے باہر آیا، علوم و فنون، صنعت و حرفت کے چرچے شروع ہو گئے، یعنی یونان اور روم کا تمدن از سر نو تازہ ہوا

کثیر تعداد تک تصنیفات کی پیداوار پہنچ گئی ہے کہ آج دنیا کی بڑی لائبریریوں کی الماریوں میں جتنی کتابیں ہیں ان کا شمار لاکھوں تک پہنچ گیا ہے۔

کوئی چیز اس ذہانت اور ذکاوت سے بڑھ کر عجیب و غریب نہیں ہے جس نے موجودہ زمانے میں انسان کے لئے ایسے وسائل و ذرائع فراہم کر دیئے ہیں جو اس کی جسمانی آسائش اور دماغی ترقی کے بڑھانے والے ہیں، انیسویں صدی نے انسانی افعال کے لئے صرف نئے اصول ہی ایجاد نہیں کئے بلکہ اس نے پرانے اصول کو نئے ڈھنگ اور نئے اسلوب سے برتنے کے طریقے بھی بتائے جو اختراعات جدیدہ کے مقابلے میں کچھ کم ضروری نہیں ہیں، سائنس کے تعجب انگیز انکشافات نے مادی دنیا میں اس حد تک انقلابات کر دیئے ہیں جن سے کلیتہً ہمارے طرز زندگی اور رسل و رسائل کے وسائل کی ہیئت بدل گئی ہے، اسی طرح علوم و فنون کی دنیا میں نمایاں ترقی نے ہمارے لئے روز افزوں اور مختلف مواقع اخلاقی اور دماغی اصلاح کے پیدا کر دیئے ہیں، یعنی عملی زندگی شروع ہو گئی ہے۔

گزشتہ صدی کے مسلسل اختراعات و انکشافات کے مقابلے میں یہ ناممکن سا معلوم ہوتا ہے کہ بیسویں صدی کسی وقیع اضافہ سے بازی لے جائے، اس نے ہم کو جہاز دیئے، ریلوے دی، برّی اور بحری تار دیئے، فولاد بنانے کی ترکیب بتائی اخباروں کے چھاپنے کی کل، لکڑی سے کاغذ بنانے کا فن زراعتی آلات کی ایجاد جس نے کاشتکاروں کے کام کو بالکل بدل دیا ہے اور بے شمار صنعتی ایجادات ان اشیاء کی ساخت کے لئے جو کثیر النوع اور مختلف الاشکال ضروریات انسانی کے لئے لازمی ہیں، یہ سب مرحوم صدی کی یادگاریں ہیں، سائنس میں

ایسے ایسے امور دریافت کئے اور کیمسٹری میں وہ موشگافیاں کیں کہ آج مستقلاً جتنے علوم نکل پڑے ہیں اور جن کی بنا پر ہمارے حیرت انگیز تصرفات کی حد نہیں رہی، عارفان لاآف نیچر کے معجزات میں سے ہیں اسی کے ساتھ ہماری بہتری تحقیقاتیں ادھوری بھی ہیں جو امید ہے آئندہ حوائجِ انسانی کی کفالت کے لائق ہو سکیں گی۔

بہرحال انیسویں صدی خاص کر پچھلا نصف حصہ ایک عملی دور تھا، جس میں افادات جسمانی کی حیثیت سے دماغ نے زیادہ تم اپنی کوششوں کو ان امور کے لئے وقف رکھا، جو ہماری شاندار اور سائنٹیفک زندگی کی حوائج کی معین تھیں مگر سوال یہ ہے کہ علمی حیثیت سے ہم نے کیا کیا؟ قریب قریب کچھ نہیں! مثلاً اعلیٰ درجہ کے پاکیزہ لٹریچر کو لیجئے تو ہماری موجودہ مخلوقاتِ حرفی کہیں سے نسبتہً اس لائق نہیں ہے کہ وہ اساتذۂ قدیم کے دل و دماغ کے نتائج سے ٹکر کھا سکے، جو اپنی شہرت اور بقائے دائمی کے آپ ضامن ہیں۔ جہاں سائنس میں ہماری فتوحات حیرت انگیز ہیں، ہمارا لٹریچر لازماً مصنوعی اور تقلیدی ہے، تاہم دنیا میں کبھی اتنے لکھنے والے ہیں تھے، نہ کبھی اتنے شائع کرنے والے نہ اتنی کتابیں، نہ اتنے پڑھنے والے،

دنیا ہر وقت حرکت میں ہے، یہ ایک ایسا صاف مسئلہ ہے کہ بحث کی ضرورت نہیں، لیکن محض اس کی حرکت سے یہ تو نہیں ہو سکتا کہ ہم اپنے پیش روؤں سے اچھی کتابیں لکھتے ہیں، یا ہمارے شاعر عمدہ نظمیں، یا ناولسٹ بہتر قصے یا ہمارے فلسفی اخلاقی اور دماغی حیثیت سے کسی اونچی سطح پر ہیں، ہاں کہیں کہیں کوئی اچھا لکھنے والا نظر آجاتا ہے، مگر وہ زمرۂ عام میں سے اس طرح گم ہوتا ہے کہ پتہ نہیں ملتا البتہ ہمارے قدیم خلاقین سخن علمی دنیا میں ایسے سربرآوردہ ہیں کہ امتدادِ وقت

ان کے نتائج فکر کے آثار کو اس وقت تک زائل نہ ہو سکا۔

ایسے دو شخصوں میں جن میں سے ایک نے متقدمین کے دل و دماغ کے نتائج یعنی کلاسیکس کو غذائے علمی بنایا ہو اور دوسرے نے آج کل کی رائج الوقت آخور تصنیفات کو دیکھا بھالا ہو، مقابلہ کیجئے تو آپ پائیں گے کہ جس نے گبن، باسول جانسن، ملٹن، ایڈیسن اور اسٹیل، ڈیکونسی، اور کیٹس، بائرن، اسکاٹ ڈیکنس اور تھیکرے، کارلائل اور میکالے سے فائدہ اٹھایا ہے، اس میں ادائے سخن کی ایک خاص طرح کی سلاست اور نزاکتِ خیال، محاورات کی برجستگی اور زبان پر اقتدار کامل کا پتہ ملے گا۔ بمقابلہ سطحی اور مذبذب مذاقِ سخن اور کمی معلومات کے جو ان لوگوں کے خصائص میں سے ہے جن کا مبلغ علم صرف آجکل کی وقتی اور بالائی تصنیفات ہیں، جن کا حصہ غالب محض ایک طرح کا مجموعۂ لفظی ہے اور کچھ نہیں، جو شائع کرنے والوں کے مطابع سے علی الاتصال گویا برستی رہتی ہیں، سات ہزار یا نو سو کتابیں سالانہ گریٹ برٹن سے چوبیس ہزار جرمنی سے، تیرہ ہزار فرانس سے نو ہزار اٹلی سے، پانچ ہزار ممالک متحدہ (امریکہ) سے، زائد از ساٹھ ہزار کتابیں ہر سال،

۱۶ سو برس پیشتر چھاپہ کی ایجاد سے ایک موقع پر کہا گیا تھا کہ تصنیفات کی کوئی انتہا نہیں ہے، لیکن قائل اب کیا کہے گا اگر وہ آئے اور دیکھے کہ صرف برٹش میوزیم میں ۵۰ لاکھ جلدیں موجود ہیں اور ہر سال برطانیہ عظمی کا چھاپہ خانہ سات ہزار نئی جلدیں پیدا کرتا رہتا ہے اور کم و بیش اسی قدر امریکہ بھی، فرض کیجئے ایک شخص ۱۰۰ جلدیں سالانہ پڑھ سکتا ہے۔ گویہ ایک فیاضانہ اندازہ ہے، مرد یا عورت کے لئے جسے دنیا میں کچھ اور کرتا ہے، تو آج جتنی کتابیں برٹش میوزیم میں ہیں

انھیں پندرہ ہزار برس میں ختم کر سکے۔ اسی طرح ہر سال جو گزرے گا اس کی پیداوار کے
پڑھنے کے لئے ہر اضافی سو برس کی ضرورت ہو گی۔ مختصر یہ کہ علمائے یورپ اس خطرہ کو
محسوس کرنے لگے ہیں کہ دنیا کے اعلیٰ تر لٹریچر کتابوں کی عام طغیانی میں بہہ جائیں گے،
چنانچہ ربع صدی کے قریب ہوا کہ کتابوں کے ایک مشہور نباض "مسٹر ہریسن" نے
اپنے جامع و مانع خیالات کا اظہار یوں کیا تھا کہ "مجھ کو وقیع تصنیفات کے ناقابل
اندازہ عمدگی سے اختلاف نہیں ہے، مگر ہم لٹریچر کے روشن نظارہ کی دوسری سمت
کو اکثر بھول جاتے ہیں یعنی کتابوں کا استعمال بے جا یا بالفاظ غیر، ایسی کتابوں کا پڑھنا
جو اپنی بے غایتی انتشار اور جہلیت کے لحاظ سے ضائعاتِ زندگی میں شمار ہونے
کے لائق ہیں اور جنہیں ہم ان کی اہمیت کے لحاظ سے بر عایت بھی زیادہ سے
زیادہ فضلہ اعلم کہہ سکتے ہیں۔ معلوم نہیں ہماری غفلت وقیع تصنیفات کی طرف سے
بالکل نہ پڑھنے کی وجہ سے ہے یا ادنیٰ درجہ کی کتابوں کے مطالعہ کی ناقابل
اصلاح عادت کا نتیجہ ہے۔ بہر حال مآل ایک ہی ہے، یعنی ہمارا جہل مرکب دنیا
کے مشہور لٹریچر سے، لیکن ایک بات اور ہے جو عمدہ تر تصنیفات کے شائق ہیں
ان کو وسعت انتخاب پریشان کرتی ہے جو عملاً غیر محدود ہے، کتابوں کا ایک
بہت بڑا حصہ ایسا ہے جسے ہم کبھی پڑھنے کے لائق نہیں ہوں گے، اسی کے ساتھ
ایسی کتابوں کا اوسط بھی کچھ کم نہیں ہے، جو سرے سے پڑھنے کے لائق نہیں ہیں
گذشتہ دو صدیوں میں عمدہ انتخاب کی مشکلات اتنی سخت نہیں تھیں، جتنی آج ہیں
اس لئے جو جو سوال واقعی اپنی اہمیت کے لحاظ سے میرے لئے بار طبیعت ہو رہا
ہے یہ ہے کہ وہ کون سی کتابیں ہیں جن کا علم تھوڑے سے بچے کچھے وقت میں بھی

ہمارے لئے ضروریات زندگی میں سے ہے ہر کتاب جسے ہم بغیر کسی عنایت کے اٹھا لیتے ہیں ایک موقع کا اتلاف ہے جس میں ہم کوئی ایسی چیز پڑھتے جو مفید یا مقصود بالذات ہوتی ہم کو معلوم ہے کہ کتابیں ایسی ہی مختلف ہیں جیسے جواہرات اور کنکر پتھر، اس لئے میں نہایت بھروسہ کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے زمانے کا پہلا دماغی اور عقلی کام یہ ہے کہ ہم اس چھپے ہوئے مواد کی تنظیم کر سکیں، اور اسے کارآمد بنا سکیں جسے گذشتہ چار صدیوں نے ہمارے راستہ میں پھیلا رکھا ہے، علم کو فعل میں لانا، پڑھنے کو با اصول کرنا اور سیاہی کے بہتے ہوئے آبشار سے بے تعلق کے غیر فانی خیالات کا محفوظ رکھنا، ایک ضرورت ہے بشرطیکہ انسان کی بڑھتی ہوئی ذہانت ہم کو مذموم بے نیازی کے باغِ سبز کی طرف نہ لے جائے۔

اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ ایک ایسا مجموعہ جو ضروری تصنیفات کا ایک معقول لب لباب ہو، کس قدر قیمتی ہوگا جو خلاصہ ہو اس چیز کا جو تمام دنیا کے لٹریچر میں سب سے اعلیٰ اور انگیز کرنے کے لائق ہے اور اس لئے لازم سا ہے کہ ہم لٹریچر سے وسیع بحر زخار میں کہیں اپنا قدم جما لیں اور قبل اس کے کہ کتابوں کا سیلاب ان اجزاء کو جو روح لٹریچر ہیں اپنی موجوں میں غائب کر دے، انہیں طوفان بے تمیزی سے بچا لیں، اس سے ہم اس دریائی آوارہ گردی سے محفوظ رہیں گے جو خود اور طریق پر شاید ہی کبھی کنارہ پر پہنچائے اگر ایسا نہ ہوا تو پھر یہ ہوتا ہے کہ پڑھنے کو ہم سب ہی کچھ پڑھ جائیں گے۔ مگر علم خاک نہیں ہوگا اور روح خبیثہ کی طرح ان متبرک مقامات سے ہمیشہ دور رہیں گے، جہاں عالم بالا میں نفوس اعلیٰ دادِ سخن دیتے رہے ہوں گے،

ایک اور صاحب (پروفیسر میکس بولر) فرماتے ہیں کہ "بہت کم کتابیں ہیں جنھیں

شروع سے آخر تک میں عظیم الشان پاتا ہوں، برخلاف اس کے اکثر ٹکڑے، حصے یا پوری نظمیں ایسی ہیں جنھیں بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے اور ہر دفعہ تعجب بڑھ کر حیرت ہو جاتا ہے کہ ایک شخص کیونکران کے لکھنے پر قادر ہو سکا"

فاضل پروفیسر کہتا ہے کہ "اگر میں اپنا خیال آپ کو بتا دوں تو مجھے خوف ہے آپ مجھے کٹر علمی کافر سمجھیں گے یا جاہل محض، کسی بہت بڑے قدیم شاعر کو لیجیے، اور اگر آپ سچ کہلاتے ہیں تو مجھے کہنا ہوگا کہ "ہومر" میں بھی بعض ایسے طویل حصے ہیں جو نہایت گراں گزرتے ہیں اسی کے ساتھ انیسویں صدی کے سب سے بڑے یا کسی بڑے شاعر کو لیجیے، تو میں اقرار کرتا ہوں کہ "گوئٹھ" ایسے شخص کے نتائج فکر بھی ایسے ہیں جن میں متعدد مقامات کے دوبارہ پڑھنے سے جی اکتاتا ہے، جو ہر ان میں بھی ہوتا ہے جو بہت مشہور ہیں اور ان میں بھی جن سے دنیا واقف نہیں ہے، مگر کوئی شاعر یا ناثر ایسا نہیں ہے جس کا ہر حصۂ تصنیف جاننے کے لائق ہو، اور جو بہیئت مجموعی دنیا کے اعلیٰ لٹریچر کے مجموعہ میں کوئی جگہ حاصل کر سکے۔

ان خیالات کی بنا پر تمام دنیا کے لٹریچر کا خلاصہ جو گویا "میگس بولز" کے تخیل کی تکمیل ہے، ڈاکٹر گارنٹ کی ایڈیٹری میں اسٹنڈرڈ نے (جو لندن کا ایک وقیع روزانہ اخبار ہے) شائع کر دیا ہے بیس ضخیم اور خوبصورت جلدوں میں موزوں اور مناسب طریق پر وہ سب کچھ جمع کر دیا گیا ہے جو آکسفورڈ کے ایک پروفیسر کے خیال کے مطابق "غیر فانی حصہ ہے نہایت فانی اجسام کا" اور جو نتائجِ فکرِ انسانی کی حیثیت سے ایک معجزہ سا معلوم ہوتا ہے، مختصر یہ کہ دنیا کے مسلم الثبوت اساتذہ اور نامور فلسفیوں نے جن سے بہتر اسٹاف ایڈیٹری کے لئے نہیں مل سکتا تھا، دس ہزار صفحوں میں نہایت

دلچسپ اور اعلیٰ ترین اجزا ان تصنیفات کے یکجا کر دیئے ہیں جو ابتدائی زمانے سے یعنی جب سے تصنیف کا فن ایجاد ہوا' آج تک کسی دور' کسی زمانہ میں' کسی حیثیت سے لکھی گئیں۔

یہ لائبریری محض قدامت کا ایک مجموعۂ بے کیف نہیں ہے' نہ صرف کلاسیکل لٹریچر اس میں بھر دی گئی ہے' جس کی نسبت نہایت صحیح کہا گیا ہے کہ "پڑھنے کی نہیں صرف تذکرہ کی چیز ہے'' نہ اس کو ان زائد از ضرورت سنجیدہ جلدوں سے تعلق ہے جو بڑے بوڑھے چھوٹوں کے لئے انعام کے موقعوں پر تجویز کرتے ہیں۔ نہیں بلکہ تمام متقدمین و متاخرین علمائے مشرقی۔ حکمائے یونانِ قدیم و روم اپنے اپنے درجہ کے مطابق جو تاریخ لٹریچر میں رکھتے ہیں موزوں نشست میں ہیں۔

ان دلچسپ جلدوں کے مطالعہ کے سلسلہ میں جو طبقات کی حیثیت سے مرتب کیا گیا ہے' ہم علوم کا وہ سرچشمہ جاریہ دیکھتے ہیں جو یونان و اسکندریہ اور رومۃ الکبریٰ کے زمانۂ عروج میں نہایت عمیق اور زوردار تھا اور ازمنہ متوسطہ کے قریب گھٹتے گھٹتے خشک ہو گیا' صرف اس لئے کہ نشاۃ الثانیہ میں پورے زور کے ساتھ پھر بند ٹوٹ جائے اور ہمارے زمانہ میں علمی سیلاب کی کوئی انتہا نہ رہی' بہر حال تاریخی انقلابات اپنی تدریجی رفتار کے ساتھ ایک وقت میں آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ ہر زمانہ اپنے خزائن پیش کر رہا ہے جس میں ہمارا موجودہ وقت کسی سے پیچھے نہیں ہے' صدیوں کے تجربات اور لاکھوں اوراق الٹ پھیر کے بعد ہزاروں صفحے انتخاب کئے گئے ہیں۔ جو ہر زمانہ میں مقبول خاص تھے۔ یہ انتخاب ان لوگوں کا ہے جو لٹریچر کے اکثر اصناف میں کامل الفن ہیں اور اقتباسات کے ضمن میں جنہوں نے اپنی اپنی قوت فیصلہ کا زور ان مضامین میں دکھایا ہے جو ہر جلد کے آغاز میں تقریظیں

حیثیت سے لکھے گئے ہیں، یہ آرٹیکل بجائے خود ایک مستقل چیز ہیں، آنکھیں ہر شخص رکھتا ہے مگر بصارت کے ساتھ بصیرت لازمی نہیں" ان مضامین کے ذریعے سے دس ہزار صفحات پر نظر ڈالنے کے بعد ہماری رائے ہر دور کے مختلف طبقاتِ لٹریچر کی نسبت وہی ہو سکتی ہے، جو ہمارے ذاتی تبحرِ علمی کے ساتھ ممکن تھی۔

یہ جلدیں خوش نصیبی سے میرے مطالعہ میں ہیں، لیکن مجھے افسوس کے ساتھ اس امر کا اعتراف ہے کہ باوجود ان اوصاف کے جو اس لائبریری کی طرف منسوب ہو سکتے ہیں، جہاں تک مشرقی لٹریچر کا استقصار کیا گیا ہے وہ اس قدر مختصر پیمانہ پر ہے جو کسی طرح واجب الادب اور زندہ کلاسیکس کی عظمت کے شایان نہیں ہے یعنی عربی فارسی کا انتخاب جو کچھ ہے وہ بلحاظ قدامت محض "تبرکات" کی حیثیت سے ہے، اور یہ بھی اصلی زبان میں نہیں، بلکہ صرف ترجمہ پر قناعت کی گئی ہے، لیکن اس سے قطع نظر کر کے یوں دیکھئے کہ وہ قوم کس قدر خوش نصیب ہوگی جس کی مادری زبان میں اتنا بڑا سرمایۂ علمی فراہم کیا گیا ہے اور جو مختلف اقالیم سخن یعنی دنیا کے لٹریچر پر آج اس شاہانہ اقتدار کے ساتھ قابض ہے، جس کی نظیر اگر میری کم نظری پر نہ محمول کیا جائے تو گزشتہ تاریخ بھی پیش نہیں کر سکتی۔

بہر حال اگر کسی قوم کا گزشتہ لٹریچر اس کے خیالات و محسوسات کا آئینہ ہے جس میں ہم ان مٹے ہوئے آثار کی سراغ رسانی کر سکتے ہیں، جو کسی عہد میں اس کی ابتدائی نشوونما، شباب اور انحطاط طبعی، یعنی عروج و زوال کا سبب ہوئے تو یورپ کی کوششیں صرف اس لئے لائق شکر گزاری نہیں ہیں کہ ہمارے لٹریچر کے "باقیات الصالحات" کا جامع ہے بلکہ یہ وہ فسانہائے دلچسپ ہیں جن سے نوع انسانی کا

راز ہستی، ترقی کی غایت اور اس کی تاریخ کی رفتار کا عام رخ معلوم ہو جائے گا۔ لیکن یہ نہایت دقیق بحث ہے جو اس موقع سے چنداں تعلق نہیں رکھتی، مجھے کہنا یہ ہے کہ اس مجموعہ کو دیکھ کر پہلا خیال میرے دل میں یہ آیا کہ اگر نمونے پر ایک "لائبریری آف ارنٹیل لٹریچر" مرتب کی جائے تو یادگار ہوگا، ہمارا لٹریچر سچ یہ ہے کہ ہماری گزشتہ حالت کا مرقع ہے جس میں ہم کو ان اسباب کا پتہ ملتا ہے جن سے ہم صفحۂ ہستی پر آئے، پھولے پھلے، اور لتنے ہوئے کہ تاریخ عالم میں کوئی وزن رکھتے تھے گو آج اتنے گئے گزرے ہیں کہ اپنے تنزل کا احساس تک نہیں! بے شک باعتبار خیالات اور ضروریات موجودہ قدیم علوم و فنون عجمی ہوں یا عربی اس لائق ہیں کہ ہم انہیں جہاں تک جلد بھول جائیں مناسب ہے تاہم جہانتک نفس لٹریچر کا تعلق ہے، اسلاف کے حقوق کیا چاہتے ہیں؟ آج کتنے تعلیم یافتہ ہیں جن کی لائبریریوں میں گزشتہ لٹریچر کا کوئی حصہ مل سکتا ہے، حالانکہ انتہائے مغربی خیالات کے ساتھ بھی بہتیرے ایسے نکلیں گے جو کم سے کم قدیم لٹریچر کے ان اجزاء کے رکھنے کے شائق ہوں جو روح لٹریچر ہیں۔ میں نے غلطی کی، مغربی خیالات کے ساتھ جہاں تک شواہد موجود ہیں، اکثر ایسے ہیں جن کے مذہبی اور قومی عناصر زائل ہوتے جاتے ہیں یا سرے سے موجود ہی نہیں، مذہب کی جگہ لے دے کر سائنس کا آوردہ "کوڈ آف مورلیٹی" یعنی ضابطۂ اخلاق ایک رائج الوقت چیز ہے اور قومیت کی اس لئے ضرورت نہیں کہ بعض اتفاق سے ولایت سے ہو گئے اور گو ایک ہی زمین کی پیداوار ہیں تاہم خیالات میں سمندر حائل ہے، معدودے چند کے سوا اکثر ایسے ہیں جنہیں صرف ایک طرح کا حیوان ناطق کہہ سکتے ہیں، جو کسی مفہوم کے لئے ایک سے زیادہ الفاظ

یعنی زبان غیر بھی کچھ جانتا ہو، تھوڑی سی انگریزی، کچھ ٹوٹی پھوٹی اردو بس اتنی کائنات ہے، اس لئے علمی امتیاز ان کے لئے پیدا کرنا مشکل ہے، سوا اس کے کہ قوم اور افراد کے مقابلۃً ان کو فرمائشی کہئے "یہ مختصر گروہ جہاں اس لائق ہے کہ ان میں سے اکثر کما کھانے کی استعداد رکھتے ہیں، یا قرض کو آمدنی سمجھ کر اچھی زندگیاں بسر کرتے ہیں جو ان کے خیال میں غایت زندگی ہے، کہیں سے اس لائق نہیں کہ تبادلۂ خیالات کی حیثیت سے یہ کسی حد تک ہمارے لئے مفید ہو، اس کو ان کے استغنا پر محمول نہ کیجئے، بلکہ یہ دماغی عدم استطاعت یعنی کور بین کا نتیجہ ہے جس کی وجہ سے آج ملک کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور نئے خیال والوں میں معزز مستثنیات کے سوا (اگر ہوں) کوئی اس لائق نہیں کہ سر سید تو بڑی چیز تھے۔ حالی و شبلی کی طرح دو سطریں بھی لکھ سکے، اگر انسانی معاشرت یعنی تمدن اور ترقی کے لئے کسی مرکز کی ضرورت ہے جس کی طرف واقعات افتاں و خیزاں جا رہے ہیں تو یہ مرکز ابھی صدیوں میں بھی لائق حصول نہیں ہوگا، ہم نے ایک جماعت کو تعلیم یافتہ کر کے زیادہ سے زیادہ یہ کیا ہے کہ اوروں سے الگ کر دیا، خود اس کو کسی امر پر متفق نہ کر سکے جس کا ثبوت یہ ہے کہ اس محدود حلقہ میں بھی کوئی آئیڈیل، کوئی تخیل موجود نہیں جو قومی اغراض زندگی میں سب سے زیادہ مہتم بالشان اور فرداً فرداً ہر شخص کا نصب العین ہو، بہر حال میں کہنا چاہتا ہوں کہ ان کی انگریزی کی طرف سے یہ توقعات کہ ولایت والے معترف ہوں، صرف ہمارے حسن ظن کی افراط ہے، قدیم لٹریچر ان کو آتا نہیں، نہ یہ کہیں سے شائق اردو، دوسرے سے ان کے لائق نہیں، مختصر یہ کہ ان کی ذاتی حالت سے قطع نظر کر لیجئے تو من حیث القوم یہ ہمارے لئے ہوئے: ہرتے برابر

ہاں ایک اوسط درجے کا گروہ ہے جس سے کچھ توقعات ہوسکتے ہیں، گمان میں سے بھی اس وقت تک کوئی اتنا نہیں ہے کہ ہمارے اولڈ اسکول مگر نئے خیالات کے علمائ کی طرح کچھ لکھ پڑھ سکے، تاہم چونکہ مغربی خیالات کے ساتھ قومیت کا احساس باقی ہے، کم سے کم یہ ان ضرورتوں کو تسلیم کرتا ہے جو ہمارے قومی مشن کے اجزائے ترکیبی ہیں، علمی مذاق رکھتا ہے۔ آج کل کے اچھے لکھنے والوں کا تتبع کرنا چاہتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ اپنی زبان کو اعلیٰ درجہ کی ترقی یافتہ حالت میں دیکھنا چاہتا ہے، اُردو کی طرف سے بے پروائی اس کے خیال میں صرف پولیٹیکل زوال ہی کا باعث نہیں ہے، بلکہ یہ وہ شائبہ تنزل ہے جو حسن معاشرت اور قومی زندگی کے ٹکڑے ٹکڑے کردے گا، بہر حال جہاں اس کی ضرورت ہے کہ ملکی زبان کو اعلیٰ درجہ کے علمی لباس میں دیکھا جائے، یہ خواہش غیر طبعی نہیں ہے کہ قدیم لٹریچر میں جس قدر نظم و نثر کے حصے ایسے ہیں جو محفوظ رکھنے کے لائق ہیں اور جن پر امتدادِ وقت کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا، وہ ایک کمیٹی کے انتخاب سے لئے جائیں۔

نواب محسن الملک، ڈاکٹر نذیر احمد، پروفیسر شبلی، سید علی اور علامہ حالی سے بہتر اسٹاف ایڈیٹری کے لئے نہیں مل سکتا، ہر لٹریچر کے مجموعہ کی ترتیب میں بتدأً تقریظی حیثیت سے ایک آرٹیکل ہو، جو زبان کے تاریخی حالات، اس کی خصوصیات اور مختلف دور میں جو انقلابات پائے ہوں، ان کے آثار تفصیل کے ساتھ دکھائے مجموعی حیثیت سے جو کام ہوگا، منفرداً ممکن نہیں، ایک موقع پر یہ کہا گیا تھا کہ پروفیسر آزاد کا لٹریچر، شبلی کی وسعت نظر، اور حالی کی بے مثل نکتہ سنجی اور سخن آفرینی اگر جمع کر دی جائیں تو نتیجہ نہایت مہتم بالشان ہوگا، قوم کی بدنصیبی ہے کہ آزاد ہمارے لئے جیتے

جی مر گئے، مگر شبلی و حالی موجود ہیں۔

پروفیسر شبلی کی غائرانہ اور وسیع تحقیقاتوں کے نتائج جس طریق پر ظاہر ہوتے رہتے ہیں ان کے تبحر علمی اور دنیا کے موجودہ مذاق کے لحاظ سے اس سے بہتر پیرایہ ہو نہیں سکتا لیکن توقعات بڑھتی جاتی ہیں، امید ہے دائرۃ التالیف کے سلسلہ میں جہاں تک ہماری قدیم تاریخ کا تعلق ہے یہ اچھی طرح دادِ تحقیق دیں گے، خاص کر اس لئے کہ سلسلہ آصفیہ نے ان کو ان ہی کاموں کے لئے وقف کر دیا ہے۔

حالی کو ان لوگوں کے سامنے پیش کرنا نہیں چاہتا جو ان کو ایک اچھا شاعر سمجھتے ہیں، مگر اس استغنا کے ساتھ غزل داغ کا حصہ ہے، بیشک ان کی نیچرل شاعری معروضہ نقائص کے ساتھ بھی نہایت اعلیٰ درجہ کی ہے خاص کر مسدس کی بنیاد جن امور پر رکھی گئی ہے اور جو میٹریل استعمال کیا گیا ہے، صرف حالی کا حصہ ہے لیکن اپنا اپنا خیال ہے، میرے ذہن میں حالی کی عظمت "دیوان حالی" کے اس حصہ سے ہے جو "مقدمہ شعر و شاعری" کی حیثیت سے لکھا گیا ہے، یہ ۲۲۸ صفحے قطعاً غیر فانی ہیں، اور غالباً آج تک کسی نے اس موضوع پر چند سطریں بھی اس طرح نہیں لکھیں، مگر وہ اس وقت کا خیال ہے جب ان کی سب سے پچھلی تالیف شائع نہیں ہوئی تھی، اب حالی کس اونچی سطح پر ہیں، پھر کہیں دکھاؤں گا۔

نواب محسن الملک کے دل و دماغ کے نتائج تہذیب اخلاق کی جلدوں میں محفوظ ہیں، اور ہمیشہ یادگار رہیں گے، رفیق جسمانی اٹھ گیا، مگر تہذیب کے صفحوں کو دیکھئے دونوں کے اجزاء غیر فانی پہلو بہ پہلو اب بھی موجود ہیں، ممدوح کی مصروفیت و حالت صحت گو دماغی محنت کے لئے موزوں نہ ہو تو تاہم اس خیالی لائبریری کا اہم

آپ کو ایڈیٹر انچیف دیکھنا چاہتے ہیں۔

سید علی نے تمدن عرب کے ذریعہ سے ہماری گزشتہ عظمت کا جو مرقع پیش کیا ہے، سچ یہ ہے کہ اس سے پہلے ہم نے اپنی صورت کبھی یوں نہیں دیکھی۔ یہ وقیع تاریخ جس کی بنیاد مسئلہ ارتقاء پر رکھی گئی ہے، اور جو بلحاظ نوعیت ایک نہایت زبردست حکیمانہ تالیف ہے، ہمارے لئے بہترین یادگار سلف ہے، کم لوگ ہیں جو سید علی کی صحیح وقعت کا اندازہ کر سکتے ہیں، مگر تمام ملک میں یہی ایک شخص ہے جو اپنی وسیع قابلیت کے ساتھ مغربی اور مشرقی لٹریچر کا جامع ہے اور جو طرز تحریر اور واقفیت عام کی حیثیت سے ہم کو یورپ کی خوشہ چینی سے بے نیاز کر سکتا ہے، افسوس ہے کہ ایسا جامع حیثیات فاضل ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔

آخر میں مجھ کو ڈاکٹر نذیر احمد کی نسبت کچھ کہنا ہے۔ میں مستقلاً اپنا خیال کہیں اور ظاہر کر چکا ہوں، یہاں صرف اس قدر کہنا ہے کہ باوصف غور ان کا صحیح مصرف اس وقت تک نہ معلوم ہو سکا یہ شخص جہاں تک مادہ کا تعلق ہے اس بلا کا انشا پرداز ہے کہ اس کو کارلائل اور میکالے نہیں بلکہ جانسن کے پہلو میں جگہ ملنی چاہئے لیکن تصنیفات کی حیثیت سے نسبتہً یہ گھاٹے میں رہے۔ ان میں جہاں اور کمالات ہیں قوت فیصلہ کی کمی معلوم ہوتی ہے، یعنی ترتیباً ان کے نتائج فکر اس وقت تک جو کچھ اور جس پیرائے میں ظاہر ہوئے مجھے اس میں کلام ہے کہ ان کی استعداد کا سب سے بہتر اور صحیح مصرف یہی تھا، بالفاظ غیر جس پیمانے پر یہ آج تک اظہار خیال کرتے رہے وہ فی نفسہ ان کے کمال کو دیکھتے ہوئے کافی نہیں ہے، گو ان کی مخلوقات لفظی کا حرف حرف جو ان کے قلم کے زیر تحت ہے، اس لائق ہے کہ ہم آنکھوں سے

لگائیں، کم وبیش اسی قبیل کی شکایتیں اوروں سے بھی ہو سکتی ہیں پروفیسر شبلی نے سب کچھ کیا
مگر مسلمانوں کی عام مختصر تاریخ نہ لکھ ڈالی نہ اس وقت تک آنحضرت صلعم کی لائف
پر ایک حرف لکھا' حالی اگر حیات جاوید' نہ لکھتے تو سخت گھاٹے میں رہتے۔ بہرحال
علامہ نذیر احمد لائبریری کے عربی حصہ کے ساتھ خوب کھپیں گے اور یہاں مجھ کو ان سے
اتنی ہی غرض ہے۔

میرا خیال ہے کہ اورینٹل لٹریچر کی ترتیب حسب ذیل ہو سکتی ہے،

(۱) عربی قدیم وجدید ۲ جلد

(۲) فارسی قدیم وجدید ۲ جلد

(۳) اردوئے معلی ۲ جلد (جملہ ۶ جلدیں)

ہر جلد کے تقریباً ہزار صفحے ہوں گے نہایت اعلیٰ درجہ کے کاغذ پر مفید عام
آگرہ یا نامی پریس کانپور کی چھپائی ہو گی اور جلدیں پورے کپڑے یا چمڑے کی کسی ولایتی
کارخانہ سے تیار کرائی جائیں گی جس میں پشتہ پر سنہرے حرفوں میں نام ہوگا اور جلد کی
بالائی سطح پر طلائی نقوش میں " ہال مارک آف علی گڑھ" میرے خیال میں زیادہ سے
زیادہ پچاس روپیہ تک ایک سٹ کی قیمت ہو گی۔

میں نے آخر میں اردوئے معلی کے لئے دو جلدیں رکھی ہیں۔ یورپ کی افراط کے
مقابلے میں ہماری قلیل التعداد بلحاظ تصنیفات غور طلب ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ مقررہ
صفحے کیونکر بھرے جائیں گے۔ کیونکہ علی گڑھ مشن اور اسکے ریکرو سے قطع نظر کر لیجئے
تو شرر کے برلے نام اخلاقی ناولوں اور فسانہ آزاد کے سوا کچھ رہ نہیں جاتا۔ تاہم میرا
خیال ہے کہ علی گڑھ کی صدائے اصلی اور آوازہائے بازگشت جس قدر نکلی ہیں وہ بجائے

خود کافی ہیں، اور ہم اس قدر مواد بہم پہنچا سکتے ہیں جس سے افادات سرسید کے تحت میں متعدد ضخیم جلدیں تیار ہو جائیں، مختصر یہ کہ مواد کی کمی نہیں ہے نہ ایسی زبان کو نادار کہہ سکتے ہیں جس میں تمدن عرب، الفاروق اور حیات جاوید سی مبسوط تالیفات موجود ہوں،

بعضوں کا خیال ہوگا کہ "لائبریری آف اورینٹل لٹریچر" کا خیال ایک حد تک بے وقت کی شہنائی ہے"، مگر میں اس سے متفق نہیں، ہندوستان سے ہماری قدیم زبانیں قریب قریب رخصت ہو چکی ہیں، خود ہمارے نونہال اردو کی جان کے لالے ہیں ایسی حالت میں گو علوم قدیم فنا ہو جائیں جن کی ہم کو ضرورت نہیں تاہم لٹریچر کی بقا کا خیال ایک امر طبعی ہے، ہم یادگار سلف کچھ چاہتے ہیں، کم سے کم اس لئے رکھ اس مجموعۂ زرین سے کچھ نہ ہوگا، تاہم ہماری لائبریری کی آرائش میں اضافہ ہوگا، بہر حال یہ خیال اتنا بے تکا نہیں ہے جتنے ہم علمی شوق میں آج گئے گذرے ہیں، پڑھنے لکھنے کا مذاق اگر کچھ ہے تو بالائی طور پر اور صرف ضرورتاً، کچھ نوجوان ایک وقت خاص تک کتابی مشغلہ رکھتے ہیں، جن کی غایت برائے نام بالغ العلوم ہونا ہے اور کچھ نہیں، جہاں سے دراصل تعلیم کی ابجد شروع ہوتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ منزل کا خاتمہ یہیں ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ نئے پود میں سے کوئی ایسا نظر نہیں آتا جو محض شرافت نفس کے لئے پڑھتا لکھتا ہو، یا کسی حیثیت سے راسخ فی العلم کا مصداق ہو اور ساری پھٹکار صرف اتنی بات کی ہے کہ کتب بینی باوصف ادعائے تہذیب شرط زندگی نہیں ہے جو ان سے گئے گذرے ہیں یعنی ایک جم غفیر ایسا ہے کہ کتابوں کا پڑھنا اور خریدنا سے لغو سمجھتا ہے، حوائج انسانی میں یہی ایک ضرورت ہے جو کسی کو محسوس نہ ہوئی، ایک صاحب معقول تنخواہ پاتے ہیں اور گورنمنٹ کے معتمد علیہ ہیں، پروفیسر شبلی کی ایک

تالیف کے مدت سے شائق تھے، مگر جاریہ ملتی نہیں تھی اور خریداری میں روپیہ ڈیڑھ روپیہ
کا صرف تھا جو ان کے خیال میں مصنف کے مقابلے میں ان کی ایک طرح کی شکست تھی
جب کریم آف دی سوسائٹی یعنی زردار لوگوں کا یہ حال ہے تو اسی پر اوروں کو قیاس
کر لیجیے، بعض خرید تو لیتے ہیں، مگر پڑھتے نہیں یا استفادہ کا سلیقہ نہیں ہے امراء سے
میں نے پہلے ہی قطع نظر کر لی ہے کیونکہ ان کے ہاں جہالت ایک طرح کا استغنا ہے
چونکہ یہ حسن اتفاق سے ایسے ہو پڑے ہیں کہ دو وقت کی روٹیوں یعنی مفت خوریوں کی طرف
سے اطمینان ہے۔ اس لیے کہ علم ان کے لیے ایک بے کار سی چیز ہے، روپیہ وہ پردہ پوش
ہے جس کے ہوتے تہذیبِ نفس، اکتسابِ کمال کسی چیز کی ضرورت نہیں، بہائم
صفت اخلاق بجائے خود مشغول رکھنے کے لیے کافی ہیں، دماغی مشغلوں کے لیے نہ فکر
نہ صحبت! رنگین طبع مسلمانوں میں عیش پرستی پہلے بھی سوسائٹی کا جزو رہی ہے جو اس کے
قابل نہیں ہیں، انہیں عہدِ عباسی اور اموی کی پرائیویٹ صحبت آرائیوں پر ایک نظر
ڈالنی چاہیے، مگر یہ علمی رنگ سے خالی نہیں ہوتی تھیں، مذاق لٹریچر ہر شخص کا خمیر تھا
اور لطف یہ ہے کہ ایک ہاتھ میں تلوار تو دوسرے میں قلم ضرور ہوتا تھا۔

ہمارے دیسی رئیسوں کو دیکھیے، بہت کھینچ تان کر اگر ان کو علمی رنگ میں لائیے
تو فنونِ لطیفہ کی ایک شاخ سے آگے نہیں بڑھتے، یعنی ان کے حصہ میں لے دے کر
ایک طرح کی موسیقی رہ گئی ہے جو ہندوستان کی جاہلانہ ایجاد ہے، مارشل اسپرٹ
ان میں بھی ہے مگر اس کا مصرف ان کے ہاں کچھ بھی تفصیل کے لائق نہیں! علماء
اور حکماء کی جگہ صحبت میں اربابِ نشاط ہیں اور گو انھوں نے اہل سیف یا اہل
قلم ہونے کی تکلیف نہیں گوارا کی۔ تاہم سنتا ہوں ایک صاحب ہارمونیم نہیں

پیانوبن نہیں" "بایاں[1]" اچھا بجاتے ہیں! میں نے بڑی مجبوری سے یہ لفظ لکھا ہے
کیونکہ اظہار خیال کا کوئی طریقہ نہ تھا، بہرحال کچھ تو ہندوستان کی آب و ہوا نے ان کے
قوٹی اور ترکیب اعصابی کے ساتھ فیاضی نہیں کی، کچھ یہ اپنے ہاتھوں بنے بگڑے
نتیجہ یہ کہ قوم کے لئے جنہیں اپنی وسیع استطاعت، دماغی اوصاف اور مستثنیٰ
اخلاقی تربیت کے لحاظ سے فرشتۂ رحمت ہونا چاہیے، آج وہ "شیاطین الانس"
سے کچھ گھٹ کر ہیں! اس لئے ہماری توقعات جیسا پہلے کہہ چکا ہوں جو کچھ
ہوسکتی ہیں، وہ اس طبقہ سے جو اوسط درجہ کا ہے اگر ان کو ہم آدمی بنا سکے
یعنی علمی مذاق ان میں رچ سکے تو ہماری آئندہ حالت کی نسبت کوئی خوش آئند
پیشین گوئی فلسفیانہ قرائن سے ہوگی۔ لیکن پہلے ہم کو دیسی طبائع کا سکون اور
اضطراب حیوان کے لیے فطرت ثانی ہو رہا ہے آئے دن کی چھیڑ چھاڑ یعنی علمی
تحریک سے دور کرنا ہے جس میں "افادات سرسید" کی کثرت سے اشاعت اور
میری خیالی لائبریری کا وجود سب کچھ آگیا، انگریزوں نے پچھلی صدی میں یعنی
گذشتہ سال انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ۲۵ ضخیم جلدوں میں شائع کی جو واقفیت
عامہ کی حیثیت سے ایک جامع و مانع تالیف ہے اس کی اشاعت میں کم و
بیش تیس ۳۰ لاکھ روپیے صرف ہوئے ہوں گے حال میں "لائبریری آف فیمس لٹریچر" چھپ کر نکلی
جس کا اہتمام بزبانِ حال کہہ رہا ہے کہ لاکھوں ہی صرف ہوتے ہوں گے، ایک طرف
یہ نمونے ہیں، دوسری طرف ایک ساکن غیر متحرک اور مائل بہ تنزل قوم کو بہ تقاضائے
وقت زمانے کی ترقیات سے ہم سطح کرنا ہے، جس میں نہ قومیت ہے نہ لٹریچر، نہ کوئی
قومی آئیڈیل، جس کے ذریعے سے کسی کوشش یہ میلان قوی یا کسی مقصد کے حصول

[1] طبلے کا اصطلاحی نام

کے لیے اجماع عام ممکن ہو، تاہم کچھ نہ کچھ کرنا چاہیئے، اور چونکہ سوچنے والے ہمیشہ کام کرنے والے نہیں ہوتے، میں صرف اس پر قناعت کرنا چاہتا ہوں کہ یورپ کی دیکھا دیکھی ایک نئی اور مہتم بالشان تجویز اپنی طرف سے پیش کر دی۔ اس کی تکمیل یعنی جو چیز ابھی بالقوۃ ہے اسے فعل میں لانا، اس کے اسباب اور مسائل پر غور کرنا ان اکابر قوم کا فرض اخلاقی ہے۔ جو مجھ سے بہتر ضروریات قومی کو سمجھتے بوجھتے ہیں قبل اس کے کہ اس اسکیم میں کامیابی ہو اور اسی قسم کا کوئی واقعہ عملی وجود میں آئے۔ کار لائل کا قول سن لیجئے کہ "فرض انسانی میں سب سے زیادہ اہم یہ ہے کہ ہر شخص اپنی لائبریری بنائے خود وہ کتنی ہی چھوٹی ہو" اس کا خیال ہے "کتاب دماغ کے لئے ایسی ضروری ہے جیسے جسم کے لئے غذا" شیکسپیر اور اونچا گیا ہے اور کہتا ہے "دنیا میں کوئی تاریکی نہیں ہے مگر جہالت" ان اقوال کی بنا پر اور نیز اس سے پہلے جو کچھ کہا گیا ہے اس کے لحاظ سے میں امید کروں گا۔ قوم کے اکثر نوجوان جو میرے مخاطب صحیح ہیں اس خیال کو پیش نظر رکھیں گے کہ ان کی ساری عظمت صرف ان کے ذاتی منتخب کتب خانے میں ہے۔

آئیے! مادی دنیا سے تھوڑی دیر کے لئے میں آپ کو غیر فانیوں میں لئے چلتا ہوں، آپ کی لائبریری جہاں بیٹھ کر آپ ایک ہی وقت میں تمام اطراف عالم میں ہو سکتے ہیں، دنیا کی یہی بہشت یا باغ عدن ہے جہاں کے پھل اس رسائی کے باعث نہیں ہوں گے جو ہمارے سب سے پہلے والدین کی طرف منسوب کی جاتی ہے، میں ایسے لوگوں سے آپ کو مصافحہ کرتے دیکھتا ہوں جنہوں نے دنیا میں انقلابات عظیم پیدا کر دیئے اور گو ان کے ہاتھوں نے کبھی تلوار سے کام نہیں لیا۔ تاہم ان کی

فتوحات جہاں تک عقلی اور دماغی سیاست کا تعلق ہے حریفوں یعنی اہل سیف سے پیچھے نہیں ہیں، بڑے بڑے فلاسفر، بڑے بڑے علما اور معیار مرجو اپنے اپنے دور میں بہت سستے نہیں تھے آج وہ صف بستہ آپ کے سامنے ہیں اور آپ کی جنبش چشم کے تابع، تاریخ بتائے گی کہ یہ کاغذی سرمایہ ان بندگوں کی عمروں کی کمائی ہے زمانہ نے گو ان کی ہڈیاں خاک کر دیں، مگر ان کے جوہر یعنی اجزائے غیر فانی کو مٹا نہ سکا اور یہی ان لوگوں کی حقیقی زندگی ہے جس کی نسبت بے تکلف دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ وہ اس وقت تک باقی رہے گی جب تک کائنات میں اضمحلال طبعی واقع نہ ہو،

اچھا! یہ سہل الحصول روحیں جنہیں اس وقت میں آپ کے زمرۂ مصاحبین میں دیکھتا ہوں آپ سے کیا چاہتی ہیں؟ کچھ نہیں سوا اس کے کہ ان کی خاموش ہدایتوں کو اپنا رہنما اور مقدمۂ زندگی بنائیے اور یاد رکھئے کہ گو دنیا میں معیار فوقیت ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں، مگر موجودہ دنیا جو ترقی کی حیثیت سے عالم شباب میں ہے اور جس کے ثمر پیش رس آج کل کی عقلی ایجادات اور دماغی انکشافات ہیں، صرف ان لوگوں کی بقا کی حامی ہے، جو علمی حیثیت سے امتیاز رکھتے ہوں، فرشتہ ہونے کا وقت نہیں رہا، یہ منصف ان لوگوں کا تھا جن کے زبردست تخیلات عالم غیر مادی سے مناسبت رکھتے تھے، ہم کو انسان ہونا ہے مگر کامل یا قریب قریب کامل اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ زندگی کی کشمکش اور ضروری مشاغل کے ساتھ ہم اتنے رہ جائیں کہ کتب بینی ہمارے لئے مشغلۂ عیش ہو، جو دنیا میں سب سے بڑی اور اختیاری خوشی ہے۔

(البشیر ۱۹۰۲ء)

ترکوں کی معاشرت

اردو لٹریچر دنیا کی اور مہذب زبانوں کے مقابلے میں اس قدر کم مایہ ہے کہ سالانہ اشاعت کی تعداد اتنی بھی نہیں ہوتی جو انگلیوں پر گنی جاسکے، ملک کے زبردست اہل قلم باستثنا علامہ شبلی آج کل قریب قریب سب گویا ریٹائرڈ لسٹ پر ہیں یعنی ان لوگوں کو جو کچھ کہنا سننا تھا ایک زمانہ میں کہہ سن چکے، اور اب جدھر دیکھئے خاموشی ہی خاموشی ہے، اس عام ناداری میں کبھی اچھی کتاب کوئی ہاتھ آجائے تو غنیمت معلوم ہوتی ہے، اس وقت میں مترجم ناچیز کی ایک جدید تالیف کی تقریب کرنا چاہتا ہوں جو اس تحریر کا عنوان ہے لیکن نفس مطلب سے پہلے اسی سلسلے میں کچھ اور کہنا ہے،

آج کل ہمارے لیے اس سے زیادہ دلچسپ مشغلہ کوئی نہیں ہے کہ ہم اس بات کا پتہ لگائیں کہ اور اسلامی ممالک میں جہاں مغربی اثر ترقی کر رہا ہے خصائص مشرقی کے ساتھ تمدن اور معاشرت کی کیا حالت ہے یعنی یورپ کے دماغی اور اخلاقی تصرفات سے اور جگہ مسلمان کتنے بنے بگڑے؟ ہم کہاں ہیں؟ یہ معلوم ہے کہ مصر و ترکی ہم سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ حالت میں ہیں، اس لئے ان تغیرات کی اگر ہم ٹوہ لگا سکے جو تبدریج وہاں پیش آرہے ہیں، تو ہم کو سلسلہ کی درمیانی گڑیاں مل جائیں گی اور ہم اندازہ کرسکیں گے کہ بلحاظ خصائص مشترک ہم میں کہاں تک

صلاحیت ہے کہ دنیا کی شائستہ اور متمدن اقوام سے آئندہ کبھی ہم سطح ہو سکیں اس طرح ہم رفتہ رفتہ تمدن کے وسیع حدود میں پیش قدمی کے لائق ہو سکیں گے اور وہ حد فاصل کم ہوتی جائے گی جو مشرق اور مغرب میں سر دست حائل ہے۔

مصر و ٹرکی کے متعلق ہمارے وسائل واقفیت وہ تصنیفات ہیں جو انگریزی میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہتی ہیں، مختلف موضوع پر لکھنے والوں کے قلم اٹھتے رہتے ہیں، لیکن ٹرکش لائف اور اس کے متعلقات میں کچھ ایسی دلچسپی ہے کہ عموماً مصنف کی کوشش ہوتی ہے کہ معاشرت کے تمام اجزاء تحلیل کر کے علیحدہ علیحدہ دکھائے جائیں، خاص کر ٹرکش حرم ایک طلسم سربستہ ہے جس کی عقدہ کشائی کے لئے کم سے کم یونانیوں کی سی لطافتِ خیال اور مذاقِ حسن کی ضرورت ہے، مغربی طرز تحریر اور ادائے خیال کے ساتھ خاص حسنِ ترتیب بجائے خود ایک چیز ہے، اس پر بڑھایئے جزئیات کی ضروری تفصیل جو معاشرت کی جان ہے، اور جن پر بہ سبب کثرت مساوات خود اہل ملک کی نگاہ نہیں پڑتی، تاہم چونکہ ٹرکی کے ساتھ یورپ کے سیاسی تعلقات اچھے نہیں ہیں، میں نہیں جانتا بہ حیثیت مجموعی کوئی ایسی تصنیف موجود ہے جو ٹرکش سوسائٹی اور اس کے نظاماتِ زندگی کے متعلق مخلصانہ اظہار خیال کے ساتھ ہماری توقعات پوری کر سکتی ہو،

افسوس ہے کہ کسی ترک نے کوئی جامع اور مبسوط کتاب اس موضوع پر نہیں لکھی اور نہ غیروں کا دست نگر نہ ہونا پڑتا۔ ہندوستان کا مشہور اور فاضل مورخ بھی ہم کو اس حیثیت سے بے نیاز نہ کر سکا۔ سفرنامہ ٹرکی میں وہ امور نہیں دکھائے گئے جن کو وہ خود متقدمین کی تالیف میں ڈھونڈھتا ہے، گویا اس کی

مورخانہ عظمت کی تکمیل کے لئے ہندوستان سے باہر کلرے کو سول جس سفر قسطنطنیہ کا انتساب کافی تھا، یہ فردگزاشت ایک لٹریری نقصان ہے جس کی تلافی اب نہیں ہو سکتی لیکن میں خوش ہوں کہ حال میں "ڈائری آف ترک" شائع ہوئی ہے جس کو ایک ترک کی سرگزشت کہنا زیادہ تر موزوں ہے، خلیل خالد (ٹرکی رسم خط کے مطابق "خ" کا نقطہ اڑا دیجئے) جو نوجوان ٹرکش پارٹی کا ایک ممبر ہے، یہ کتاب اس کے حوادث زندگی یعنی وقائع عمری کے چند صفحے ہیں جس میں معاشری اور سیاسی اہم مسائل بھی آگئے ہیں، یہ کتاب جس کا قالب شملہ میں بدلا گیا ہے۔ خلیل خالد نے ارض آزاد یعنی لندن میں بیٹھ کر لکھی ہے، اور چونکہ وہ گھر کا بھیدی ہے۔ اس نے کوئی کمزور رگ چھوڑی نہیں ہے ترکی کا موجودہ انحطاط اس کے خیال میں شخصی حکومت کے غیر معتدل اقتدار کی وجہ سے ہے جو آج کل کے شائستہ اصول حکمرانی کے لحاظ سے ایک سیاسی گناہ ہے جس ملک میں رعایا کوئی آواز نہ رکھتی ہو جہاں جائز آزادی اور بغاوت مرادف سے الفاظ ہوں، جہاں ہر جدید پیش قدمی جابرانہ سیاست کی آہنی گرفت سے باہر نہ ہو یقینی وہ وطنیت اور قومیت کے دلداد نوجوانوں کے اعتراضات کی زد سے علٰحدہ نہیں رہ سکتا۔ خالد نے نہایت دریدہ دہنی سے سلطان پر نہیں بلکہ ان کی پالیسی پر مختلف پہلوؤں سے حملہ کیا ہے، اور یہی حیثیت ہے جو اس مختصر کتاب میں نہایت اجاگر معلوم ہوتی ہے۔

بہر حال خالد کم سے کم ایک معتبر ناجی ہے جس نے گھر کا کچا چٹھا کہہ سنایا اور ہم کو لائق مترجم کا ممنون ہونا چاہیے کہ ٹرکش لائف کے متعلق یہ دوسری کتاب ہے جو ان کے قلم کے سایہ میں موزونیت کے ساتھ شائع ہوئی جس

طرح میں نفسِ مضامین کی غیر ضروری تفصیل سے اس مضمون کو بڑھانا نہیں چاہتا
میرا خیال ہے کہ ترجمے کے متعلق بھی مجھے کہنا نہیں ہے، لائق مترجم کا نام خود
ایک کافی ضمانت ہے۔ وہ اپنے فن کے اسپشلسٹ ہیں، اور سچ یہ ہے کہ جس
لطافت اور برجستگی کے ساتھ یہ زبان کا قالب بدل دیتے ہیں۔ ان ہی کا حصہ ہے
ترجمہ شستگی اور روانیِ خیال کے ساتھ اتنا تو ہو کہ مستقل کتاب کا دھوکا ہو
اور اصلی تصنیف کا خیال تک نہ آئے، یہ بات ان کے سوا اور کہاں! ایک وصف
اضافی اور بھی ہے کہ اپنی کتابوں کو بگڑنے نہیں دیتے، یعنی چھپائی وغیرہ ٹکسالی
اور قیمت نسبتاً کچھ نہیں، میں سمجھتا ہوں مترجم کی حوصلہ افزائی کے لیے کم سے
کم اس کی دردسری کا عملی ثبوت یہ ہے کہ ایک جلد اس کی ہر تعلیم یافتہ شخص
کے پاس ہونی چاہیے، مصنفین کے ساتھ اس حیثیت سے بے پروائی یا عدم توجہی
ایک طرف کی خیانت ہے جو آج کل کے علمی دور میں بہت ہی ناموزوں ہے، ایک
طریقہ اور ہے یعنی عاریتہً لے کر دیکھنا، لیکن مس کاریلی جو انگلستان کی موجودہ
انشاپردازوں کی صف اول میں ہے، اسے معیوب بتاتی ہے مستعار کتابوں کا پڑھنا
اس کے خیال میں ایسا ہی ہے جیسا دوسروں کے چبائے ہوئے نوالوں کا منہ
میں پھیرنا، جو ذرا اکروہ سا ہے، "نفاست چاہتی ہے" وہ شیرزہ کاغذی دستِ غیر
کی مس کردہ نہ ہو، یعنی اچھوتی اور نئی نویلی ہو۔

اسی سلسلے میں مجھے لائق مترجم سے کچھ کہنا ہے، ترجمہ میں جا بجا تصرفات
کیے گئے ہیں، بلکہ میں کہنا چاہتا تھا، مختلف مقامات پر بعض حصے چھوڑ دیئے
گئے ہیں، حالانکہ اصلی کتاب جس اسپرٹ میں لکھی گئی ہے اس کا اقتضا طبعی یہ

تھا کہ ترجمہ میں ایک حرف متروک نہ ہوتا، سلطان المعظم کی نسبت ہمارا ذاتی میلانِ
طبع کچھ ہی ہو، لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ عظمت و عقیدت واقعات کو بدل نہیں سکتے
جن مقامات کو مترجم نے نظر انداز کیا ہے۔ بعض جگہ وہی بیان واقعہ کی جان تھے۔
مثلاً خالد کا ایک واقعہ لیجیے وہ ایک موقعے پر یورپین احباب کے ساتھ ہم نوالہ
و ہم پیالہ ہے۔ میز پر ولایتی گوشت (خنزیر) اور شراب دونوں موجود ہیں، وہ شوخی
سے کہتا ہے، مجھ کو ولایتی گوشت سے طبعاً نفرت تھی جس کا نظارہ ہی میری اشتہا
کے زائل کرنے کے لیے کافی تھا، اور گو دونوں چیزیں ایک سال ممنوع ہیں تاہم میں
نہیں کہہ سکتا پچھلی چیز یعنی شراب سے کہاں تک محترز رہ سکا! لائق مترجم اس
پچھلے حصہ کو پی گئے، آخر خالد میں اس قدر سنجیدگی پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی
جو نفس واقعہ کے خلاف معلوم ہوتی ہے، بہر حال میں رعایت کے ساتھ بھی اس
قسم کے متروکات کو جائز نہیں سمجھتا، صرف اس لئے نہیں کہ واقعہ نگاری کی حیثیت
بدل گئی، بلکہ ساری کتاب پھیکی پڑ گئی۔ اور ذائقہ اصلی کچھ سے کچھ ہو گیا جس کا افسوس ہے۔

اب دیباچہ پر نظر ڈالنا چاہتا ہوں، جو بجائے خود ایک مستقل چیز ہے۔
اور جس سے لائق مترجم کچھ آگے بڑھ کر زمرۂ مصنفین کی حدود میں داخل ہوتے ہیں
لیکن دیباچہ کو نسبتاً اتنا ہی ہونا چاہیے جتنا کھانے میں نمک، سیکڑوں صفحے
الٹنے کے بعد بھی اصل کتاب کا پتہ نہیں چلتا، جس سے جی اکتا جاتا ہے، میں
اس وقت اس سے تعرض کرنا نہیں چاہتا کہ پردہ کی بحث ڈائری آف اے
ٹرک کے ساتھ کہاں تک خارج از موضوع یعنی گول خانہ میں چوکھنٹی چیز ہے
ایسا معلوم ہوتا ہے یہ مدت سے بھرے بیٹھے تھے جذبۂ اشاعت اظہار خیال

کا ایک ذریعہ ہوگئی۔ لیکن یہ ممکن تھا کہ یہ حصہ ضمیمہ کے طور پر کتاب کے آخر میں شامل کر دیا
جاتا ہے، آئندہ ایڈیشنز میں اس کا موقع باقی رہتا ہے۔

ابھی پردہ کی بحث، جہاں تک لائق لکھنے والے نے مواد تحقیق دی ہے وہ اس
حیثیت سے لائق اعتراف ہے کہ ایک خاص بحث کے متعلق اس قدر مواد ایک جگہ
فراہم کر دیا گیا، اصل مسئلہ وہ تنکے کی اوٹ پہاڑ ہے۔ میں نہیں جانتا کوئی دو ٹکڑے
بات کہہ سکوں گا، میں ان طالب علمانہ کج بحثیوں سے واقف ہوں جو پردہ کی حمایت
یا مخالفت میں ہوتی رہتی ہیں، حال میں جواز پردہ کے سلسلے میں ایک عالمانہ تاریخی
مضمون نکلا جس سے قریب قریب نوجوانوں کے دل بیٹھ گئے جن کا پردہ مروجہ کی
نسبت خیال تھا کہ منجملہ اور بے وقوفیوں کے ایک یہ بھی ہے، اور اس نوعیت کا سلسلہ
آگے (یعنی تاریخ گذشتہ میں) نہیں چل سکتا ہے، اسی مضمون میں سید امیر علی پر بھی لے
دے ہوئی ہے جو نوجوانوں کا پیشوائے علمی ہو یا نہ ہو، تاہم یورپ میں وہ اسلامی دنیا
کا ایک مستند فلسفی مورخ سمجھا جاتا ہے جو صرف مولف یعنی جامع واقعات ہی
نہیں ہے بلکہ طبائع عالم کا نباض ہے۔ اس نے اپنی قیمتی تالیفات میں ہر جگہ
اپنا یہ درجہ قائم رکھا ہے،

نائنٹینتھ سینچری میں اس نے اس نے زنانِ اسلام پر جو جامع اور بے نظیر آرٹیکل لکھا
تھا، وہ جب تک انگلش لٹریچر دنیا میں باقی ہے، اس کی غیر فانی یادگار رہے گا
بہر حال سید امیر علی کی غائبانہ پردہ دری کے ساتھ چونکہ ضمناً نوجوان تعلیم یافتہ بھی
مخاطب ہیں اس لیے نہایت ادب کے ساتھ جواباً صرف یہ عرض کیا جا سکتا ہے

ترا گاہے گریباں نے نہ شد چاک　　　چہ دانی لذت دیوانگی را

جن صاحبوں کو اس پامال مسئلہ میں دردسری پسند ہے، ان کو نیک نیتی کے ساتھ یہ صلاح دی جاسکتی ہے کہ وہ مصر کے ایک روشن ضمیر فاضل کی تصنیفات "تحریر المراۃ" اور "مراۃ الجدید" کو پیش نظر رکھیں، جس میں ہر پہلو سے یہ بحث طے کر دی گئی ہے، بہتیرے ایسے بھی ہوں گے جو اس قسم کے مسائل کو صرف مذہبی رخ سے دیکھنا چاہتے ہیں ان کو یاد رکھنا چاہیئے، کہ ہمارے افعال کے محرکات اس زمانہ میں کچھ اور ہیں۔

انیسویں صدی کے ایک بہت بڑے عالم کے خیال کے مطابق مذہب کے دو حصے ہوسکتے ہیں، اعتقادی اور عملی، عملیات کا زیادہ تر حصہ صرف مخصوص المقام سوسائٹی اور اس کی لوکل ضروریات ہوا کرتی ہیں، اور یہ "پیران نمی پرند و مریداں می پرانند" کی حیثیت سے ہے کہ ہم کسی مذہب کے عملی احکام میں اتنی جامعیت اور وسعت تسلیم کریں کہ وہ باوصفِ اختلاف حالات، اختلافِ طبائع، اختلافِ اسباب خارجی، صدیوں کے تغیرات کے بعد بھی تمام ضروریات انسانی کا کفیل ہو، وہ آئین و ضوابط جو ایک وحشی یا نیم مہذب سوسائٹی کی فی الوقت اصلاح کے لیئے ہوں، ایک متمدن اور شائستہ قوم کے لیئے "وضع الشیٔ فی غیر محلہ" سے بھی زیادہ گئے گزرے ہیں، بہرحال یہ ایک فلسفی کی جو طبائع کائنات کا راز داں ہے ایک آزادانہ رائے ہے۔ مگر ایسی رائے ہے جو سرسری طور پر ٹالنے کے لائق نہیں ہے۔

روشن خیال علمائے اسلام کا خیال ہے کہ شرائع ضروریات انسانی کے تابع ہیں جس طرح ضروریات انسانی بدلتی رہتی ہیں، شرائع میں بھی رڑ کے سے تمدد یعنی گھٹنے بڑھنے کی خاصیت موجود ہے، کیونکہ اسلام اصولاً ایک ایسا مذہب ہے جو اول ان لوگوں کی دماغی قابلیت اور گرد و پیش کے حالات کے مطابق ہو لیتا ہے جو اسے قبول کرتے ہیں

اور بعد میں ان کی دماغی اور اخلاقی سطح کو بلند کرتا ہے، یعنی اسلام ایک ترقی پذیر مذہب ہے، اور ایک بڑی حد تک مسلمانوں کی ناکامیوں کا سراغ اگر مل سکتا ہے تو اسی اصول کے نظر انداز کرنے میں، یہ بھی کہا گیا ہے کہ دماغی تحریک اور تمدنی ترقی کا اثر سچے مذہب کے روحانی اور اخلاقی حصہ پر کچھ نہیں ہوتا۔ اور ہر مقدس مذہب میں بجائے اس کے کہ وہ خود علم میں تحلیل ہوجائے ہر قسم کے علم و تہذیب کے جذب کرنے کی قابلیت ہوتی ہے، کچھ شک نہیں جہاں تک اسلام کا تعلق ہے یہ خیال کافی حد تک صحیح ہے۔ لیکن یہ کھینچا تانی صرف ایک طرح کی من سمجھوتی ہے۔

مسلمانوں کے عام تنزل کے اسباب پر بہت بحث ہوچکی ہے، بہت سے لکچر دیئے گئے، رسالے شائع ہوئے۔ مگر اصلی بات کسی کے منہ سے نہیں نکلتی، کوئی صاحب فرماتے ہیں تو دبی زبان سے تاکہ ان کی مقبولیت میں فرق نہ آئے۔

اس لئے صاف صاف سن لیجئے کہ تمدنی امور میں سرے سے مذہب کو تکلیف دینے کی ضرورت نہیں، ہمارے افعال کو صرف حیثیت "افادی" اور فوائد "اخلاقی" کا تابع ہونا چاہیئے۔ یہی اصول موضوعہ آج شائستہ اور مہذب دنیا کی ترقیات کا عنوان ہے، ایک کام کو اس لئے کیجئے کہ اس میں بہ مقابلہ مضرت کے فوائد کے پہلو زیادہ ہیں اور یہ کہ فی نفسہ وہ اچھا ہے، اور چونکہ ہر فعل خود اپنی مکافات ہے میں نہیں جانتا اخلاقی منظوری کے سوا کسی اور منظوری کی ضرورت ہے، یہی حیثیت افادی ہے جس کا مذاق یورپ میں رچ گیا ہے اور قریب قریب ان کا خمیر ہو رہا ہے جو ان کی ترقی اور آزادی کی روح ہے، اگر آج وہ ہماری طرح مذہبی گرداب میں پھنسے ہوتے تو وہ تغیرات جو ترقی انسانی کے اجزائے عناصر ہیں سرے سے وجود میں نہ آتے

یونانیوں کا تخیل صرف تکمیلِ انسانیت تھا، یعنی وہ ہستی موجودہ سے آگے نہیں جاتے تھے، ان کے خیال میں قوائے فطری کی کامل نشوونما اور ان کا معتدل استعمال بس یہی غایت زندگی تھی، یہی خیال شاگردانہ حیثیت سے یورپ نے حاصل کیا، یورپ کا موجودہ تمدن اسی خیال کا نتیجہ ہے، برخلاف اس کے ہم آج تک یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہماری ہستی جو گہوارے سے شروع ہوتی ہے اور ہیئت موجودہ یقینی قبر سے پہلے ختم ہو جائے گی، ایک حرف غلط ہے، ترقی کا افتتاح آغوش لحد میں پہونچ کر ہوگا میں نہیں جانتا ان خیالات کے ساتھ کوئی قوم دنیا میں کہاں تک متمدن اقوام سے ہم سطح ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

خیام کا فلسفہ زندگی آج کل کی شائستگی سے ملتا جلتا ہے جس نے شوخی سے نقد کو ادھار پر ترجیح دی ہے۔ یعنی ہستی موجودہ کی تحقیر نہیں کرتا جو تبدیل ہیئت یعنی موت سے پہلے اپنی تکمیل چاہتی ہے، یہی تکمیل ہمارے تمدنی مسائل کے فیصلہ کا عنوان ہونا چاہیئے۔ جن میں سے ایک عورتوں کا پردہ ہے۔ یہ ایک نہایت قدیم رسم ہے جو مختلف اقوام و ملل میں وقتاً فوقتاً رہی ہے جس کو اسلام کے ساتھ کوئی تخصیص نہیں تمدن کے ابتدائی دور میں عورت کی حالت غلامی کی حالت سے کچھ اچھی نہ تھی! رومیوں اور یونانیوں کے حالات پڑھیئے، جاہلیتِ عرب کی رسموں کا پتہ لگایئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ایشیا کی بعض قوموں میں عورت کا شوہر کی وفات کے بعد زندہ رہنا ہی سرے سے غیر ضروری سمجھا جاتا تھا، یورپ کا اس حیثیت سے ذکر ہی نہ آئے تو اچھا ہے

بہرحال ہر زمانہ میں عورت ایک اضافی اور ضمنی شئے سمجھی گئی جو محض حصول التذاذ کے لئے مردوں کے نفسانی جذبات کا تختہ مشق بنتی رہی، تاریخ سے معلوم ہوگا کہ

مسلمانوں نے اپنی ترقی کے دور میں ایک حد تک عورت کو آزادی اور تمدنی اور قانونی حقوق عطا کئے لیکن جب اس کے اچھے دن تھے تب بھی وہ اپنے آقا کا ایک ضمیمہ یعنی زیادہ سے زیادہ کنیز تھی کوئی مستقل وجود نہیں رکھتی تھی، یہی خیال وراثت طبعی کی حیثیت سے کسی نہ کسی پیرایہ میں آج تک چلا آتا ہے، اگر ہم اس خیال کی تحلیل کریں تو معلوم ہوگا کہ پردہ مرد جیسی تنگ خیالی کا ایک ثمرہ ہے جو صدیوں سے عورت کی آزادی کے خلاف ہماری فطرت کا ایک جزو ہو گئی ہے۔ عورت و مرد کی جسمانی ساخت بتا رہی ہے کہ اعضاء، حواس، عقل و فکر، جذبات و خیالات اور ان تمام امور کے لحاظ سے جو انسانیت کے اجزائے ترکیبی ہیں، دونوں میں کوئی فرق نہیں، پھر یہ غیر ضروری تفریق ہماری وحشانہ قدامت پسندی کے سوا اور کیا معنیٰ رکھتی ہے۔

آج کل زمانہ تزاحم فی الحیات کے سلسلے میں جکڑا ہوا ہے یعنی کوئی قوم دنیا میں باقی نہیں رہ سکتی ہے، جب تک وہ بمقابلہ اور اقوام عالم کے ترقی کی دوڑ میں پیش پیش نہ ہو اور ترقی کی بنیاد صرف عقل پر ہے یعنی انسان کی ترقی کے اس کے سوا کوئی معنی نہیں ہیں کہ اس کی عقلی قوتوں کو وسعت دی جائے، کیونکہ یہی قوتیں تمام انسانی امور پر مسلط ہیں یہ مسلم ہے کہ عقلی توسیع صرف علمی اختراعات و انکشافات پر منحصر ہے اور آئندہ صدیوں میں کسی ایسی ترقی کی امید نہیں کی جا سکتی، جو ایجادات عقلی کے سوا کسی دوسرے عوامل و موثرات پر منحصر ہو، غرض ترقی کے اصلی اسباب صرف عقل یا اس کے متعلقات میں مل سکتے ہیں جس کے لئے ہم کو سب سے پہلے یہ کرنا ہے کہ مردوں سے پہلو بہ پہلو عورتوں کی طبعی، اخلاقی، اور دماغی قوتوں کو کامل نشو و نما اور تحریک دی جائے اور یہ اسوقت تک ممکن نہیں کہ گرفتاران قفس یعنی عورتیں پردہ کی اوٹ سے باہر نہ آئیں۔

موجودہ مغربی تمدن ایک سائنس ہے، وہ اپنا قدرتی نصاب اپنے ساتھ

رکھتا ہے اور میرے آپ کے خاص طرح کے مجموعۂ خیال کا تابع نہیں ہے، ہم کو عارفانِ طبقات الارض نے بتایا ہے کہ انسانی زندگی کی ابتدائی تاریخ کہاں سے شروع ہوئی ہے۔ اور کس طرح اوائل میں وہ بلحاظ سلسلۂ آفرینش، صرف جماد، پھر نباتات پھر حیوان تھا، یہاں تک کہ طبقۂ اسفل کی مخلوقات بڑھتے بڑھتے اور ترقی کرتے کرتے صدیوں کے انقلابات اور متواتر تغیراتِ ارتقائی کے بعد انسان تک پہنچی، غرض یہ امر پیش نظر رکھتے کے بعد کہ انسان ایک ترقی یافتہ حیوان ہے، میں نہیں جانتا اختلافِ جنس کے سوا مرد و عورت میں کوئی تفریق ممکن ہے، عورت مرد کی طرح فطرۃً ایک مستقل وجود رکھتی ہے اور وہ اپنے افعال و جوارح میں اتنی ہی آزاد ہے جس قدر اس کا فرد مقابل، اس لئے انسانی پیداوار کے "نصف بہتر حصہ" کی روپوشی یعنی ناک کان چھید کر گھر کی چار دیواری میں نظر بند رکھنا ایک طرح کا غیر ضروری تعطل اور واضعِ آئین فطرت کی غایتِ اصلی کے لحاظ سے بالکل غیر طبعی امر ہے، جن لوگوں کا خیال ہے کہ ہماری عورتیں اپنے فیصلہ قسمت یعنی دائم الحبس رہنے پر راضی ہیں ان کو یہ سمجھانا مشکل ہے کہ یہ رضا اگر ہو، ایسی ہی ہوگی، جس طرح پر شکستہ طائر قفس اپنی محدود وسعت پر قانع ہوتا ہے، جن کو اصرار ہو وہ کم سے کم ایک ہفتہ میری خاطر سے پردہ میں بیٹھ کر دیکھ لیں۔ ناک کان کی حفاظت میرا ذمہ، تجربہ بتائے گا کہ یہ حالت خلقتہً فرد انسانی کے دونوں اجزا کے لئے بے جوڑ سی ہے، گو صدیوں کی مشق و مساوات سے ایک کے لئے عادت مستمرہ ہو رہی ہو، مختصر یہ کہ بیسویں صدی کے تمدن کی طرف سے یہ امر بلا خوف تردید پیش کیا جا سکتا ہے کہ صنف نازک کا چہرہ اور ہاتھ "ستر عورت" نہیں ہے اور اس لئے قطعاً چھپانے کی چیز نہیں۔

ہر قوم کے لئے ہر زمانہ میں اس کی عقلی حالت کے مناسب خاص خاص خلاق

وعادات ہوتے ہیں جو ملکی آب وہوا باہمی میل جول، مذہبی عقائد لٹریری خیالات، علمی اختراعات اور سیاسی نظامات کے تحت میں آہستہ آہستہ اور بتدریج بدلتے رہتے ہیں اور جس قدر قوم کی عقل ترقی کی طرف حرکت کرتی ہے اسی قدر اخلاق وعادات پر اس کا اثر پڑتا ہے۔ موجودہ زمانہ ارتقاء علمی کا دور ہے، صدیوں کے زنگ ایک دم سے نہ سہی رفتہ رفتہ چھوٹیں گے، اور جن مسائل پر مجتہدانہ آج دو شخص بھی متحد الخیال نہیں ہو سکتے یہی کسی زمانہ میں ہماری آئندہ ترقی کے موضوعات ابتدائی ہوں گے۔

افسوس ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں گوری چٹی، عذرا، اور زہرا کی جگہ سانولی کریمن اور نصیبن پیدا ہونے لگیں، ان کے بھی ناک، کان محفوظ نہیں، صدیاں گزر گئیں، کرتی اور پہننے کا جوڑ نہ مل سکا! دوسری اصلاحوں کی کہاں تک امید ہو سکتی ہے سچ یہ ہے کہ رواجی پردہ ایک طرح کی عیب پوشی ہے، یہاں تو جیتے جی بیویاں چار کی جگہ دو کے کندھوں پر یعنی ڈولیوں میں چڑھی پھرتی ہیں جن ممالک میں گھر سے باہر زمین پر پاؤں رکھنے کا رواج ہے وہاں بھی ایک طرح کی کفنیاں یعنی برقعے استعمال ہوتے ہیں لیڈیاں تھیلیوں میں! یہ ہماری موجودہ تہذیب کا خاکہ ہے جس پر ہم کو ناز ہے اور اصرار ہے کہ گویا ہم سے خالص مغربیت کی کوئی ادا چھوٹنے نہ پائے، تاہم عورتیں اسی بسیط اور ابتدائی حالت میں رہیں جو ایام جاہلیت سے پہلے تھی، ساری تہذیب حرم سرا کے باہر ختم ہو جاتی ہے اور بڑے سے بڑا تعلیم یافتہ بھی عورتوں کے نظامات زندگی کو سرے سے مس کرنا نہیں چاہتا۔

لیکن میں خوش ہوں کہ مصر و ٹرکی میں جو تغیرات پیش آ رہے ہیں وہ بہت ہی امید افزا ہیں خوفناک برقعوں کی جگہ "فریجہ" (ایک متناسب الاعضا اور کوٹ) "اوڈیشنک"

(نقاب) کو ملتی جاتی ہے، ایک وقت آئے گا کہ نازنینانِ حرم یعنی سرکیشیا کی پریوں کے خوبصورت چہروں کے لئے صرف ہلکی سی نقاب کافی ہوگی، یہ تو خیر ایک فقرہ معترضہ تھا، مگر اسے طے شدہ سمجھئے، کہ ہم کو اپنی آئندہ نسل کی ترقی کے لئے یہ کرنا ہے کہ جن گھوارں میں ان کی ابتدائی نشو ونما ہو اور وہ نمونہ شائستگی اور دماغی اور اخلاقی تربیت کے ساتھ ہر طرح کے فنون لطیفہ سے آراستہ و پیراستہ ہوں اور یہ قطعاً ممکن نہیں جب تک موجودہ گھونگھٹ کو خیرباد نہ کہا جائے، عورتوں کی آزادی کے خلاف جو شواہد پیش کئے جا سکتے ہیں۔ ان میں آزادی کا جو فی نفسہ اچھی چیز ہے ہمیشہ غلط استعمال ہوا ہوگا، اس کی روک تھام کرنی ہوگی، بے شک! یہ ایک دن کا کام نہیں، نہ یہ منظور ہے کہ کل کا ہوتا آج ہی سب کچھ ہو جائے مگر اصولاً ہم کو ایک بات طے کر لینی چاہیئے۔

زمانہ بہت آگے نکل آیا ہے، یہ مسائل ایک طرفہ اب حجروں میں بیٹھ کر طے نہیں ہو سکتے، فضائے عالم میں نکلئے، نظام کائنات اور طبائع موجودات کا مطالعہ کیجیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ انسان کی عام تاریخ کا رخ بدلا ہوا ہے اور گو ابھی وہ مرکز دریافت نہیں ہوا جس کے گرد مسلسل اور با ترتیب واقعات حلقہ زن ہوتے ہیں تاہم کوئی غایت اصلی ہے جس طرف حوادثِ انسانی افتاں و خیزاں جا رہے ہیں گزشتہ دنیا کی کایا پلٹ ہو گئی ہے، آئے دن کے تغیرات نے نظامات زندگی کو درہم برہم کر رکھا ہے اس لئے وقت کا فتویٰ بھی کچھ اور ہے۔

آج جاپان کی ترقی کی کیا حالت ہوگی، اگر وہ ہندوستان سے رواجی پردہ کا سبق لیکر اپنے ملک میں گھر گھر نافذ کرے، یعنی یہاں کے ثقہ و سنجیدہ اہل الرائے کے خیال کے مطابق جاپانی لیڈیاں بھی دستانہ کی طرح چھپنے والی محرم میں کس کسا کر دہرائے ہوئے آنچل میں

کچھ غائب کرتی اور سر سے پاؤں تک نے یودوں سے لدی چھاچھم کرتی ہوئی گھروں میں بیٹھ جائیں۔ بیشک ایک نیا دور شروع ہو جائے گا، لیکن بنی بنائی قوم اور اس کی حاصل کردہ ترقیات کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے، کہا جاتا ہے، بس یہ وہ سب کچھ ممکن ہے دولیوں کے ذریعہ سے فلسفہ عالیہ سیکھا و، ایں خیال ست و محال ست و جنوں!

افسوس ہے کہ ایک ضمنی بحث مجھے کہاں سے کہاں لے گئی۔ اس لئے بہکنے پن میں یا نہیں رہا، میں نے لائق مترجم کو کہاں چھوڑا تھا، ترکوں کی معاشرت ایک نہایت وسیع عنوان ہے، یورپ کی تصنیفات تو غالباً ایک ایک کر کے صاحب ترجمہ کے پیش نظر ہوں گی جن میں سے ایک امریکن لیڈی کی جدید تصنیف ماخذ کی حیثیت سے بہت دلچسپ ہے لیکن میں بالتخصیص مشہور ٹرکش لیڈی یعنی عدالت کے اس سلسلہ مضامین کی طرف ان کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں جو ولایت کے نامور علمی رسالوں میں متفرق طور پر نکلے ہیں، میرے خیال میں حشو و زوائد سے علیحدہ ہو کر نفس مضمون میں اتنی گنجائش ہے کہ وہ بہت پھیلایا جا سکتا ہے۔ اور ہندوستان کی پبلک مولوی احمد حسن خاں کی شکر گزار ہو گی اگر وہ ترکوں سے کبھی زیادہ تفصیل کے ساتھ ملا سکے۔

(علی گڑھ منتھلی ۱۹۰۵)

علامہ شبلی کا ماہوار علمی رسالہ

آج چھ کروڑ مسلمان تو خیر، اسٹریچی ہال کی مقتدر جماعت کے پاس بھی کوئی علمی رسالہ نہیں جو معلوماتِ غائرہ اور انکشافاتِ عصریہ کے لحاظ سے قوم کے دماغی افق کی توسیع کر سکتا ہو۔ "تہذیب الاخلاق" "سلسلۂ جدید" سرسید کا نفس واپسیں تھا جو ان کی طرح ہمیشہ کے لئے ہم سے رخصت ہو گیا اور اس کا زندہ کرنا اصول طبعی کے لحاظ سے ناممکن ہے؟

"ہر لالۂ پژمردہ نخواہد بشگفت"

لیکن افسوس ہے کہ ہم جوانمرگ "معارف" کو جو "تہذیب الاخلاق" کا خلفِ صالح تھا زندہ نہ رکھ سکے، "معارف" کی چار سالہ جلدوں کو دیکھئے، صرف یہ ہی نہیں کہ وہ یورپ کے اچھے سے اچھے علمی پرچوں سے بڑا نہیں "اصحاب المعارف" نے جس طرح دادِ تحقیق دی ہے اور عربی وغیرہ کی لٹریچر کے اجزاء جس طرح شائستگی اور قابلیت کے ساتھ اردو میں لئے گئے ہیں، لکھنے والوں کا خاص حصہ ہے؟ میرا خیال ہے موجودہ رفتار دماغی کے ساتھ ہم مدتوں اس قابل نہیں ہوں گے کہ اس قسم کے مضامین کی وقعت کا کوئی صحیح اندازہ کر سکیں، لائق لکھنے والوں نے علی گڑھ کی نئی پیداوار کی طرح کوئی زبان غیر نہیں لکھی ہے بلکہ جس وسیع تمدن کا خاکہ کھینچا گیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اصلی زبان "معارف" ہی کی زبان تھی، لیکن ان مخصوص اوصاف کے ساتھ بھی کیا نتیجہ ہوا، دو سال

تک یہ پرچہ ایک رئیس کی سرپرستی میں رئیسانہ حیثیت سے نکلا، نفسِ مضامین، کاغذ، تقطیع غرض پرچہ کے تمام اجزائے ترکیبی "کلاسیکل" تھے دو سال بعد اس نے صورت بدلی "امت" آفتابدی، آخر آخر اس کی ہئیت ظاہری لکھنؤ کے بازاری پرچوں سے کچھ ہی اچھی تھی، محلوں کا رہنے والا جھونپڑے میں کیا پنپتا، پانی پت کی مٹی تھی ٹھکانے لگی، مولوی وحیدالدین سلیم کو اپنے طبع زاد نونہال کا سسک سسک کر جان دینا آج تک یاد ہوگا، بہر حال اس لٹریری حادثہ کا ذمہ دار کون ہے؟ یقینی مسلمان! لیکن چھوٹی امت نہیں بلکہ کچھ وہی روادار لوگ جو اپر انڈیا کے طبقہ اعلیٰ میں ہیں اور زیادہ تر "ینگ علی گڑھ" پارٹی جس کی زندگی میں صحیح مذاقِ علمی کا اس وقت تک پتہ نہیں؟

"البشیر" مسلمانانِ ہندوستان کو بہ حیثیت ایک "قارن" قوم کے دیکھنا چاہتا ہے لیکن یہ خیال قہقہہ کے لائق ہے، قومیت یعنی "نیشنلٹی" کے جتنے لوازم ہیں میرا خیال ہے یہاں کبھی حاصل نہیں ہوں گے، اس لئے مجموعی ترقی کے لئے متعدد صدیاں بھی کافی نہیں زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ چند منتخب افراد کو کسی ایک مرکز خیال کا محیط بنایا جائے اور یہی لوگ میرے مخاطب صحیح ہیں جن کی غذائے دماغی کے لئے ضرورت تھی کہ کانفرنس "معارف" کو متبنیٰ کر لیتی بولایت" وحیدالدین سلیم" اور "رشید احمد سالم" جن کے قلم کے سائے میں یہ ہونہار معصوم پھولتا پھلتا لیکن میں بھولا، کانفرنس ایک عملی اور کاروباری جماعت ہے یا کم سے کم ہونا چاہتی ہے" اور اس لحاظ سے اس کا وجود بعد سے خالی نہیں کہ یہ علم سے پہلے عمل چاہتی ہے جس کی طرف بہ زعم خود اس نے مفید پیش قدمیاں کی ہیں "لٹریری" حیثیت سے یہ اتنی گری ہوئی ہے کہ امید نہیں کوئی علمی تحریک، اس کی تعمیلات کے "فائل" میں داخل ہو سکے، شواہد لیجئے، رپورٹیں وقت پر نہیں شائع ہوتیں،

جو نکلتی ہیں وہ بھی "لارڈ کرزن" کے ضوابط اختصار کے زیر اثر جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مہینوں
کے انتظار کے بعد بھی پڑھنے کو قریب قریب کچھ نہیں ملتا،

اسپیچیں عموماً زبانی ہوتی ہیں، اور اس بولنے والے کے رحم پر چھوڑ دیا جاتا ہے کہ
اظہار فصاحت کے بعد وہ پھر کبھی ضبط تحریر میں لائی جائیں، جو بہت زیادہ نمودیئے ہیں
ان کا استغنا اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ آزاد خیال سرے سے قید تحریر پسند نہیں کرتی
مختصر یہ کہ رپورٹ اتنی مفصل اور دلچسپ نہیں ہوتی، جس کی امید ایک ایسی "ہیئت
الاجتماعیہ" (سوسائٹی) سے ہو سکتی تھی، جو ۶ کروڑ مسلمانوں کی پیشوائے علمی ہو، شائقین
کانفرنس میں ایسوں کی تعداد کم نہیں ہے، جن کو شرکت کا موقع نہیں ملتا، اور وہ صرف
اس خیال سے ممبر ہوتے ہیں کہ سال کے سال مکمل رپورٹ ان کے ہاتھوں میں ہو اور
وہ تعلیم یافتہ حضرات کے خیالات یعنی اردو لٹریچر کے بہتر سے بہتر نمونے سے گھر بیٹھے
لطف اٹھا سکیں، یہ توقع کہاں تک پوری ہوتی ہے میں بانیان کانفرنس کے سلیقہ احساس
پر چھوڑتا ہوں۔

بولنے والوں میں صرف ایک شخص ہے جو اپنے دماغی نتائج کی حفاظت کرتا ہے اور
تاجرانہ پالیسی کو بھی نظر انداز نہیں ہونے دیتا، یعنی علامہ نذیر احمد "یہ کانفرنس کے
سامنے پکی پکائی ہنڈیا پیش کرتے ہیں، کچی رسوئی کے شائق نہیں اور اس حیثیت سے
ہم ان کے ممنون ہیں، لیکن ان کے پچھلے لکچر اس قدر پھیکے اور بدمزہ ہوئے ہیں کہ
آج تک بے نمکی بھولی نہیں ہے، ایک پچھلے موقع پر انھوں نے جو کچھ کہا وہ ان
کی اچھی خاصی "آٹو بیاگرفی" تھی جس میں ایک سانس میں وہ تمام ذاتی واقعات دہرائے
گئے تھے جن کی تفصیل سے متعدد موقعوں پر جستہ جستہ یہ اور لکچروں میں بھی بالکل نہیں

جو کہ اِمشرقی شاعر اسے قندِ مکرّر کہے گا، مگر چچوری ہوئی ہڈیاں بار بار منھ میں! ناگوار سا ہوتا ہے۔ ان کی گھبراہٹ سے معلوم ہوتا ہے، جیسے ان کو مایوسی ہو کہ ان کے بعد ان کے واقعاتِ زندگی کا سمیٹنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ لیکچر کا زیادہ تر حصہ وہی فوائد قرآنی کے متعلق ہوتا ہے جو ان کے ترجمہ کے ساتھ مخصوص ہیں، اور جن کی الہامی تکمیل ان کی ہستی کی علتِ غائی ہے، مختصر یہ کہ بعض فاضلوں کی قوت کا بہترین استعمال نہیں ہوتا، یعنی ملک کے اچھے لکھنے والوں کو خاص سبجکٹ نہیں دیئے جاتے، نہ علمی مضامین کے لیے کسی قسم کے معاوضہ کی ضرورت سمجھی جاتی ہے۔

سر سیّد کے بعد اردو لٹریچر کی جان کے لالے پڑ گئے ہیں اور میں نہیں جانتا کانفرنس نے بالذات یا بوسائط کہاں تک ان حریفانہ کوشش کی مقاومت کی ہے جو اس معصوم زبان کو صفحۂ ہستی سے معدوم کرنا چاہتی ہیں، ایک یادگار موقع پر نہایت گرم جوشی سے کہا گیا تھا کہ "اردو کا جنازہ ہم دھوم سے اٹھائیں گے"، لیکن موجودہ سردمہری اور بے اتفاقی تو یہ کہہ رہی ہے کہ اگر سر پرستوں اور وارثوں کے یہی طور طریقے ہیں تو ایک دن طاعونی لاش کی طرح عالمِ کس مپرسی میں یہ بیچاری چپ چپاتے پیوندِ خاک کر دی جائے گی، بہتیرے رو پیٹ کر بیٹھ رہیں گے، کچھ ایسے ہیں جو مصلحت یعنی اپنی کمزوری کے لحاظ سے آنسو پی جائیں گے، بہر حال لٹریچر کی حیثیت سے کانفرنس بہیئتِ مجموعی اس کی مصداق ہو رہی ہے: ؎

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا   جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

اس لیے ہم کو بانیانِ کانفرنس اور علی گڑھ کی تنگ پیدا وار سے سر دست قطعِ نظر کر لینی چاہیے۔ کیونکہ یہ جس قدر ترقی کریں گے لکھنے پڑھنے کا مشغلہ چھوٹتا جائے گا اور

ایک زمانہ آئے گا کہ علی گڑھ کی "لٹریری ڈائری" بالکل سادی اور کوری ہوگی! الہامیاں اور استنباط نتائج کے لئے صرف علم الاعداد کافی ہوگا۔

اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ ادھر ادھر جگہ کیا ہو رہا ہے، علی گڑھ کے حریف کیمپ یعنی "ندوۃ العلماء" پر میں اس وقت کوئی تفصیلی نظر ڈالنا نہیں چاہتا، مجھ کو اس سے بحث ہے کہ عربی لٹریچر کی تجدید جہاں تک آج کل کی ترقیات کے مؤثرات کا تعلق ہے مذہب کی طرح اسباب تنویہ میں محسوب ہونے کے لائق ہے، ہاں یہ نہیں مانتا کہ علی گڑھ پارٹی "ندوۃ العلماء" کو رقابت کی نگاہ سے دیکھتی ہے، ممکن ہے بعض لوگ ہے وقت کی تنہائی سمجھتے ہوں لیکن نئے خیال والوں کا حصہ غالب عربی کی تعلیم کو صرف "زبان ثانی" کی حیثیت سے لینا کرتا ہے، یعنی مغربی علوم کی تکمیل کے ساتھ ساتھ غالباً مقصود یہ ہوگا کہ "جامع ازہر" کی طرح قوم کا کوئی حصہ غیر ضروری اور متروک مشاغل کے لئے وقف نہ ہو جائے، اور جو کچھ ہو صرف مستشرقانہ حیثیت سے جس میں قدیم لٹریچر کے باقیات الصالحات کی تجدید مقصود بالذات نہیں ہوتی بلکہ کوئی اہم غائت ہے جس کے لئے کرم خوردہ اوراق کی الٹ پھیر کی دردسری گوارا کی جاتی ہے، مختصر یہ کہ نیا گروہ ایک منٹ کے لئے بھی ان مسلمات سے علیحدہ ہونا نہیں چاہتا جو ہماری موجودہ اور آیندہ زندگی کا طے شدہ عنوان ہیں لیکن میں اس اضافی بحث سے علیحدہ ہو کر سردست "الندوہ" پر ایک نظر ڈالنا چاہتا ہوں جو واجب الادب علماء کا ایک ماہوار علمی رسالہ ہے اور جس کے ایڈیٹر یا روح رواں جو کچھ کہئے "علامہ شبلی" ہیں، الندوہ سے جو کچھ دلچسپی ہے اسی حیثیت سے ہے، کیونکہ شبلی گو آج کل ہم سے ٹوٹ کر وقف اغیار ہو رہے ہے، تاہم روابط سابقہ کی بنا پر یہ قطعاً ہماری چیز ہیں۔

اور ہم برسوں کے گھر۔ تعلقات کے بعد ان سے دست بردار نہیں ہو سکتے، لیکن سچ یہ ہی کہ ان کی "جامعیت" نئے پرانے خیالی والوں کی ملکِ مشترک ہے، اس لئے اس کی ضرورت نہیں کہ یہ کسی ایک کے ہو رہیں۔

پر مجھ سے پہلے فاضل اڈیٹر پر کچھ ریویو کرنا منظور رہے، مگر یہ اس قدر مشکل کام ہے کہ سمجھ میں نہیں آیا کہاں سے شروع کروں، اردو لٹریچر کے پیدا کرنے والے تھوڑے ہیں، ان میں بھی تھوڑے ہی ایسے ہیں جو آج کل کے وسیع معیار قابلیت کے لحاظ سے اہل قلم کی صف اول میں شامل ہونے کے لائق ہوں، سرسید سے قطع نظر کرنے کے بعد جن کو باستحقاق اولیت کا فخر حاصل ہے، میرا خیال ہے شبلی بہ لحاظ فن صرف ہندوستان نہیں بلکہ تمام اسلامی دنیا میں کسی سے دوسرے درجہ پر نہیں ہیں، اس کو میری قاصر النظری یا علمی فرومایگی پر نہ محمول کیجیے، فلسفہ تاریخ جو آج کل تمام علوم میں سر فہرست ہے ایک مستقل فن ہو گیا ہے اور اس قدر اہم ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے فاضل مورخانہ موشگافیوں کو بہترین مشغلہ ہستی سمجھتے ہیں، مصری اور ترکی لٹریچر میں تاریخی مذاق جس حد تک موجود ہے میں اس سے بے گانہ نہیں ہوں۔ مجھ کو معلوم ہے کہ دونوں زبانیں خاصکر اول الذکر اس قدر مغربیت سے مانوس ہو گئی ہے کہ وہاں کے روشن خیال علمار مغربی طرز تحریر کی خصوصیات کے ساتھ عربی اور ترکی زبانوں میں نہایت شائستگی سے داد سخن دے رہے ہیں لیکن جن مضامین پر ان کے ہاں منقولہ اور معقولانہ سرگرمی سے طبع آزمائیاں ہو رہی ہیں، وہ شبلی کے ہاں دست فرسودہ اور مسائلِ ابتدائی ہیں جن کو فاضل مورخ کی سرسری جنبش قلم مدت ہوئی ایک سے زیادہ موقعوں پر طے کر چکی ہے۔

ملک کے لئے یہ کچھ کم فخر کی بات نہیں ہے کہ مصر کے مشہور رسالہ "الہلال" کا

نامور ایڈیٹر علامہ "جرجی زیدان" اپنی تاریخ "تمدن اسلام" میں جو متعدد جلدوں میں ختم ہوگی علامہ شبلی کی تحقیقات سے بے نیاز نہ رہ سکا، اور اس نے سنداً اقتباسات کیئے۔

بہر حال ہم میں صرف شبلی ایسا شخص ہے جو بہ لحاظ جامعیت اور وسیع النظری مورخانہ تدقیق اور مذاق فن کی حیثیت سے آج یورپ کے بڑے سے بڑے مورخ سے پہلو بہ پہلو ہو سکتا۔

یورپ کو شکایت ہے کہ مسلمانوں میں متقدمین بلکہ متاخرین میں بھی کوئی شخص ایسا نہیں ہوا جسے صحیح معنوں میں اگر حفظِ روایات سے قطع نظر کی جائے تو مورخ کہنا درست ہو، یعنی استقصائے روایات کے سلسلے میں کسی نے اپنے ماخذوں کی چھان بین نہیں کی، نہ غیر مرتب مواد سے کسی دور اور کسی زمانہ میں ایسے نتائج حاصل کیئے گئے جن میں طبیعت انسانی کے اقتضاء زمانہ کی خصوصیتیں، منسوب الیہ کے حالات اور دیگر قرائن عقلی سے مدد لی گئی ہو۔

ابن خلدون کا نام بار بار لیا جاتا ہے جس نے تاریخ پر فلسفہ کا رنگ چڑھانا چاہا مگر خود اس کی تاریخ بتاتی ہے کہ اس کے خیالات سے فعل میں نہ آسکے، یہ بالکل صحیح ہے لیکن آج ہم بیسویں صدی کے ایک فاضل مورخ کو پیش کرتے ہیں جس کا دائرہ معلومات اس قدر وسیع ہے کہ وہ اپنے سلسلۂ تحقیقات میں صدیوں کی فروگزاشت کی تلافی کرتا جاتا ہے اور اگر وقت نے مساعدت کی اور اس کا تخیل پورا ہو سکا تو تاریخ اسلامی کے مہماتِ مسائل ایک ایک کر کے طے کر دیئے جائیں گے۔

کہا جاتا ہے کہ دلی اور لکھنو کے گوشوں میں اب بھی بہتیرے علما پڑے ہیں ممکن ہے لیکن کسی شخص کا دماغ دوسروں کے علوم و فنون سے بھرا ہو مگر اس میں خود تحقیق یا اختراع

کا مادہ نہ ہو تو ایک بیکار سی چیز ہے، اس لئے ایک حکیم کے قول کے مطابق اصلی قابلیت صرف وہ وسائل یعنی طریقہ استعمال ہے جس سے مواد گزشتہ کارآمد بنایا جاسکے یہی تصرفات ہیں جن کی بنا پر ایک ادیب یا مورخ کو لائق سے لائق شخص پر جو صرف جامع اللغات ہو تو ترجیح حاصل ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ ذخیرۂ الفاظ موخر الذکر کے ہاں کچھ زیادہ ہی ہوتے ہیں۔ انسانی احساسات و خیالات اور تحقیقات و اختراعات کی مسلسل تاریخ ہمارے سامنے موجود ہے اور کیمار لائل کہتا ہے کہ جس شخص کو چھپے ہوئے حروف تہجی کا راز معلوم ہے وہ اسے قوت آخذہ سے اپنا کر سکتا ہے، صرف صدائے اصلی کی تلاش کا ذوق صحیح ہونا چاہئے بالم شبلی، فاضل شبلی نقوش حرفی کا راز داں ہے، اس نے اپنے ماخذوں کی چھان بین میں صرف صدائے اصلی سے غرض رکھی، اور اپنے وسیع سلسلۂ تحقیقات میں زبردست قوت استقرائی کے ساتھ اسباب و نتائج کی تفریعات فلسفیانہ سے آج کل کے ترقی یافتہ مذاق کے مطابق اس طرح کام لیا جس سے اس کی آواز بازگشت تمام ملک میں گونج اٹھی اور ہندوستان کے علمی قلمرو میں ایک نیا تاریخی دور شروع ہو گیا۔

مختصر یہ کہ آج کل کے مصنفین میں علامہ شبلی کو ایک خاص امتیاز فوقیت حاصل ہے جو ان کے اور معاصرین کے حصہ میں نہیں آیا۔ ان کے سخت سے سخت حریف مقابل بھی ان کی تحقیقات کی گرد کو نہیں پہنچتے، بعضوں نے موضوع سخن ایسا اختیار کیا ہے کہ اگر زمانہ کی رفتار یہی رہی تو زیادہ جیتے معلوم نہیں ہوتے، نذیر احمد اپنی لائق رشک عربیت کے ساتھ بھی کچھ یوں ہی سے ہیں، یا ذوق بخیر، حالی نے مسدس کے ساتھ مقدمہ شعر و شاعری اور حیات جاوید لکھ کر اپنا ٹھکانا کر لیا، لیکن شبلی قطعاً غیر فانی ہیں، آج ہزاروں صفحے متعدد نظم و انشاء ان کے قلم سے نکل چکے ہیں اور جس موضوع پر جو کچھ لکھا گیا ہے کسی

زبان میں اس سے بہتر مجموعہ خیال موجود نہیں،

میں نہیں جانتا اس سے زیادہ ہماری توقعات کیا ہو سکتی ہیں اور چونکہ سلسلہ تصنیف باوصف موانع باقاعدہ طور پر جاری ہے امید ہے کہ انکی تالیفات موعود استادانہ حیثیت سے آئندہ بھی ملک کو دماغی اور ادبی سبق دیتی رہیں گی۔

افسوس ہے کہ سلسلۂ آصفیہ ان کی جامعیت سے پورا فائدہ نہ اٹھا سکا، نہ ان کی مخفی قوتوں کو کافی تحریک دی گئی دارۃ التالیف کا پیما سیکلس مجھے ہمیشہ یاد رہے گا جس کی تکمیل تاریخ اسلام کے ان عناصر پر جو آج تک سربمہر رہے ہیں بہت کچھ روشنی ڈالتی اور ہم متقدمین کی سادہ اور بسیط سلسلہ روایات کے ساتھ یورپ کی نکتہ سنجیوں سے بھی بے نیاز ہو جاتے، لیکن میں خوش ہوں کہ الندوہ نے جو اس تحریر کا موضوع اصلی ہے گزشتہ نقصان کی تلافی کر دی ہے میرا ہمیشہ سے خیال ہے کہ منتشر معلومات کا بہت بڑا حصہ ایسا ہوتا ہے جس کے اجزا کسی مستقل تصنیف کی تحت میں نہیں آ سکتے، اور اسکے لئے موقت الشیوع پیرایہ کی ضرورت ہے جن صاحبوں نے رسائل شبلی کو استفادۃً دیکھا ہے وہ بہت خوش ہوں گے کہ مضامین شبلی کا ایک ضخیم مجموعہ لائق حصول ہے یعنی الندوہ کو جاری ہوئے دوسرا سال ہے ۱۸ پرچے شائع ہو چکے ہیں جن کے تخمیناً چھ سو صفحے ہوتے ہیں، اور قریب قریب سب علامہ شبلی کے قلم کے سایہ میں ہیں جن میں نہایت بلند پایہ ارٹیکل مضامین پر طبع آزمائی کی گئی ہے، یعنی علوم قدیمہ و جدیدہ کا موازنہ عربی زبان کی نادر الوجود کتابوں پر تقریظ و تنقید اکابر سلف کی سوانح عمریاں، ان کے اجتہادات سے بحث وغیرہ وغیرہ، غرض ایک علمی رسالہ کا اونچے سے اونچا تخیل جو ہو سکتا ہے پیش نظر رکھا گیا ہے۔ آج کل کے رائج الوقت طالب العلمانہ رسالوں کی طرح ناقص لٹریچر میں دوم درجہ کی معلومات سے مقررہ صفحے نہیں بھرے

گئے ہیں بلکہ جو کچھ ہے تاریخی لٹریچر کا اعلیٰ سے اعلیٰ نمونہ ہے۔

مثلاً اگر میں صرف "فلسفۂ یونان و اسلام" لیتا ہوں جو نہایت معرکۃ الآرا مضمون ہے اور کئی نمبروں میں ختم ہوگا۔ آج ملک میں شبلی کے سوا کون ہے جو اس وسیع اور دقیق مضمون پر قلم آزمائی کی جرأت کر سکے، نہ جاننا بھی مزے کی چیز ہے، اس لئے بعضوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئے گی، لیکن ہندوستان کیا اور ممالک میں بھی دو چار سے زیادہ نہیں ہیں جو مذاق موجودہ کے مطابق مسائل قدیمہ کے طے کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہوں شبلی ہم میں پہلا شخص ہے جس نے مذہب کے ساتھ تاریخ و فلسفہ میں ربط باہمی پیدا کیا اور ان جواہر عقلی و ترکیب کیمیائی اس طرح کی کہ لٹریچر میں ایک خاص امتزاج پیدا ہو گیا جس کے آثار ان کے مستقل تاریخی سرمایہ کے علاوہ "الندوہ" میں کثرت سے ملیں گے، عموماً عنوان ایسے ہوتے ہیں جن کو اس سے پہلے اردو کے قلم نے اس طرح کبھی مس نہیں کیا، کس کس کو گناؤں۔ پوری تفصیل کا یہ موقع نہیں جس طرح رسائل اخوان الصفا ہمارے گزشتہ ارتقاء عقلی کی لٹریری یادگار ہیں میرا خیال ہے یہ پرچہ آئندہ نسلوں کے لئے ندوۃ العلماء کے عملی کارناموں کا ایک جامع گوشوارہ ہوگا۔

جن صاحبوں کو میری طرح شبلی کے دل و دماغ کے نتائج سے تعلق رہا ہے وہ ان مضامین میں ایک خاص بات دیکھیں گے یعنی طرز ادائے مسائل، اس قدر اچھوتا اور صاف ہے کہ بڑے سے بڑا فصیح البیان بھی اس قسم کے دقیق مسائل کو ایسی برجستگی اور لطافت کے ساتھ ادا نہیں کر سکتا اور گو فصاحت ان کی تمام تالیفات کا قدرتی خاصہ ہے جس میں اہتمام کو دخل نہیں، تاہم یہ حیثیت یعنی قادر الکلامی کے ساتھ حسن بیان مضامین متذکرہ میں بہت ہی زیادہ نمایاں معلوم ہوتی ہے،

غالب زندہ ہوتے تو شبلی کو اپنی "اردوئے خاصہ" کی داد ملتی جس نے ایک نوخیز

بازاری یعنی کل کی چھوکری کو جس پر انگلیاں اٹھتی تھیں آج اس لائق کر دیا کہ وہ اپنی بڑی بوڑھیوں سے
اور ثقہ بہنوں یعنی دنیا کی علمی زبانوں سے آنکھیں ملا سکتی ہے، جو انہوں پر آئی ہوئی بجلی نہیں بیٹھ
سکتی تھی، مدتوں شعرا سے گاڑھا اتحاد رہا، یہ اقتضائے سن بری طرح کھل کھیلی، ہاتھ پاؤں نکالے
اور بہتیرے بنائے بگاڑے۔ کیونکہ ایک زمانہ شیدائی تھا۔ ممکن یہ باتوں ہی میں سب کو ٹالتی رہی
بعض جگہ بے آبروئی کے سامان ہو ہو کر رہ گئے اور بال بال بچی آخر آخر میں ملک کے منچلے یعنی ناول
تو یہاں تک ہاتھ دھو کر پیچھے پڑے کہ اس کی پردہ دری میں کچھ اٹھا نہیں رکھا تھا۔ کبھی کبھی دبی
زبان سے اسے یہ کہتے سنا،

"اری اٹھ جاؤں گی میں صحنک سے"

لیکن دفعتہً اس کی حالت نے پلٹا کھایا، کثرت فواحش باعث سنجیدگی ہو گئی، اچھے دن آتے
ہیں تو بگڑی بن جاتی ہے، اب وہ مقدس علماء کی کنیزوں میں داخل ہے لیکن سنا گیا خوش وقت
شبلی سے زیادہ مانوس ہے اور قریب قریب ان ہی کے تصرف میں رہتی ہے۔ الندوہ اسی
تعلق کا ایک ثمر بیش رس ہے۔

پہلے اس کی قیمت -/۴ روپے مقرر کی گئی تھی۔ اب صرف دو روپے سالانہ رکھے گئے
ہیں۔ میرے خیال میں کوئی وقیع علمی پرچہ تمام دنیا میں اس سے زیادہ سستا نہیں ہو سکتا۔
خاص کر جب چھپائی، کاغذ اچھے سے اچھا ہو، نفیس پسند ایڈیٹر ان لوگوں میں ہیں جو حسن سیرت
کے ساتھ صورت کی بھی اچھی چاہتے ہیں، یہ اصول ممدوح کی تمام تصنیفات میں عموماً ملحوظ رہتا ہے۔
اور کوئی کتاب کسی بھونڈے پریس کو نہیں دی جاتی۔ ان اوصاف کے ساتھ یہ پرچہ گویا مفت
ہے لیکن علمائے موجودہ کے دور آخری کی یادگار کی بقا اگر منظور ہے تو اس نونہال کو ہاتھوں
ہاتھ لینا ہوگا یعنی کمی قیمت کی تلافی اگر ہو سکتی ہے تو کثرت اشاعت سے اور اس کی چلتی

ہوئی تدبیر یہ ہے کہ ہر خریدار کم سے کم ایک ایک نام اور بڑھائے ورنہ خوف ہے کہ ایک دن اس کو بھی روتے رہ جائیں گے، بیشک یہ دنیا کا کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں ہوگا، پرچے آئندہ بھی جاری ہوں گے لیکن شبلی یعنی ہندوستان میں تاریخ کا معلم اول پھر کہاں!

دنیا کے نہایت گہرے تعلقات بھی راہ چلتے کی صاحب سلامت ہیں، سرسید چلے گئے، دو چار رفیق کہیں کہیں رہ گئے ہیں، ایک ایک کرکے ہم سے رخصت ہو جائیں گے، اچھا تو بڑے سے بڑا فلسفۂ زندگی یہ ہے کہ وقتِ موجودہ سے جہاں تک ممکن ہے استفادہ کا کوئی پہلو رہ نہ جائے۔ اس لئے چلتے چلاتے جو کچھ ان کے دماغوں کی تحویل میں بچا کھچا رہ گیا ہے وہ تو نکلوا لیجئے ورنہ یاد رہے گوروں کی اردو سنی ہے، چلئے علی گڑھ کالج میں سنوا دوں۔ دور از حال پس یہ قطع ہو جائے گی، غالب کی اردو فارسی بندشوں کی افراط کے ساتھ جیسی ہوتی تھی یہی حالت، آج کل مخلوط اردو کی انگریزی الفاظ کے ثقیل آمیزش سے ہو رہی ہے، لیکن امید ہے، لہٰذا وہ ملکی لٹریچر کو ان آلائشوں سے صاف ستھرا کرکے رہے گا، کیا اچھا تھا اگر اس کا نام "الجامع" ہوتا، تب بھی ندوہ ہی کا پرچہ رہتا، موجودہ نام آپ ہی آپ کچھ کھٹکتا ہے، اور غیر ضروری سنجیدگی کے ساتھ ایک ساکن اور غیر متحرک شئے خیال میں آتی ہے۔ شگفتگی نام کو بھی، لیکن "الندوہ" ایک ایسی قائم المزاج جماعت کا پرچہ ہے کہ میری طفلانہ تحریک شاید ہی کسی مفید تغیر کی طرف مائل کر سکے۔ تاہم یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ شبلی کے تعلق سے تو "الحاج" ہی موزوں تھا۔

(البشیر سنہ ۱۹۰۶ء)

نامی پریس کانپور کی لٹریری خدمات

پھر جگر کھودنے لگا ناخن   سینہ جویائے زخم کاری ہے

آج کل دو کتابیں سرعت کے ساتھ نامی پریس میں چھپ رہی ہیں ایک تو یادش بخیر اس شخص کی جدید تالیف ہے جو آج ادبی حیثیت سے ہزارہا تربیت یافتہ دماغوں کا حکمران ہے یعنی معلم شبلیؔ، کی تقریظ مثنوی دعہ عصری ان کے خلیفہ وقت یعنی "مولف البرامکہ" کا نقش ثانی ہے یعنی تذکرہ نظام الملک طوسی جو سلسلہ وزرائے اسلام کی دوسری جلد ہے۔

ان کتابوں پر تفصیلی نظر اس سلسلۂ مضامین کا موضوع خاص ہوگا جو آئندہ تالیفات جدید کے عنوان سے الپشیری ملک کے "شریف ترلٹریچر" سے متعلق مستقل قائم کیا جائے گا۔ یہاں بالتحقیق یہ دکھلانا ہے کہ جس زمانہ سے سرسید نے لکھنے پڑھنے کو رواج دیا یعنی ایک خاص طرح کا لٹریچر عالم وجود میں آیا، ساتھ ہی مرحوم کا یہ بھی خیال تھا کہ لٹریچر کی ترقی کیلئے ٹائپ کا رواج لازم سا ہے یعنی وہ ملک کی روز افزوں دماغی ضروریات کے لحاظ سے پتھر کی گھس گھس کو پسند نہیں کرتے تھے، چنانچہ مطبوعات "سائنٹفک سوسائٹی وغیرہ کا بیشتر حصہ اور تہذیب الاخلاق کے پرچے ہمیشہ ٹائپ میں چھپے رفتہ رفتہ علی گڈھ کی صدائے اصلی اور آوازہائے بازگشت کا ایک اچھا خاصہ مجموعہ تیار ہونے لگا۔ سال کے سال کانفرنس نے بھی لٹریچر میں مستقل اضافے شروع کئے ان کے لیے کسی انسانی مگر خوش حیثیت پریس

کی ضرورت تھی، اس تقریب سے مفید عام آگرہ منظر عام پر آیا اور لٹریری دنیا روشناس ہوئی
علی گڑھ لٹریچر کا زیادہ تر حصہ عام نے شائع کیا ہے اور جن صاحبوں نے ابتدائی
پاکیزہ مطبوعات اور آخر آخر میں "تمدن عرب" کے ٹھاٹھ دیکھے ہیں، وہ اسے تسلیم کریں گے۔
کہ اس صوفیانہ پریس" نے شریف تر لٹریچر کی اشاعت میں جس قدر حصہ لیا ہے اس کے
نتائج وسیع تاریخی حیثیت رکھتے ہیں، وہ نقوش جو ظاہرا پتھر سے کاغذ پر منتقل ہوتے رہے آج
اس لطیف دماغی سطح پر ہیں جو ہمیشہ "معلمان غیر ذی روح" کا تختہ مشق رہی ہے جس کے
آثار اگر خصائص قومی کوئی چیز ہیں تو رہتی دنیا تک مٹنے والے نہیں۔
مختصر یہ کہ سر سید اور ان کے لٹریری دائرہ نے کبھی اسے پسند نہیں کیا کہ ان کی تصنیفات
کسی عامیانہ پریس کو دی جائیں اس لئے صرف "مفید عام" سے واسطہ رکھا گیا جس نے
اپنے فرائض خودداری کے ساتھ ادا کئے ورنہ ملک میں دوم درجے کے مطابع آرٹ تر چھے
حاشیوں کے ساتھ "نسخہ لاجواب مفید ہر شیخ و شاب" کے شائع کرنے والے کم نہیں ہیں
جہاں نری "مولویانہ تصنیفات" آئے دن "سیاہ و سفید" قالب اختیار کرتی رہتی ہیں۔
ایک حکیم کے خیال میں شائستگی کا خلاصہ یہ ہے کہ زندگی کے جتنے صیغے ہیں عملاً اُن
میں تناسب موزونیت ہو یعنی شائستگی کا کوئی رکن کسی حیثیت سے چھٹنے نہ پائے، یہ
نہیں ہوسکتا کہ جہاں کوئی صاحب مغربی تہذیب اور لباس سے آراستہ پیراستہ ہیں
کبھی ایسا بھی ہوا کہ ہمتے سمتے صرف "لنگوٹی" پر قناعت کی گئی ہو (میری غرض اس لفظ
سے صرف اصطلاحی مفہوم سے ہے) شاید یہ ایک طرح کا بے ساختہ پن ہوتا ہم اس کے
مکروہ ہونے میں تو شک نہیں، لیکن ہم میں بڑے سے بڑا سفید پوش بھی اکثر ان اوصاف سے
معرا دیکھا جاتا ہے اور بے تمیزی ایک طرح کی سادگی سمجھی جاتی ہے بہرحال جس خاص موزونیت

کی طرف میں آپ کو لے جانا چاہتا ہوں اس کا اقتضائے طبعی یہ ہے کہ زندگی کی ہر شاخ میں
متوازی اور مساوی ترقی کے آثار پائے جائیں یعنی کہیں سے بے تکاپن نہ ہو۔ اگر میں غلطی
نہیں کرتا تو سرسید کے تمام افعال ارادی اور اضطراری میں اس اصول کی رعایت
ملحوظ ہوتی تھی، جس طرح وسیع نظامات پر انہوں نے اپنے عظیم الشان تخیل کی بنیاد قائم کی
تھی جس کے مادی شواہد آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں یہی اہتمام وہ چھوٹی سے چھوٹی
بات کے لئے کرتے تھے جو کالج یا اس کے متعلقات کا ایک جزو ہو سکتی تھی۔

یہ ظاہر ہے کہ مرحوم کے بعد علی گڑھ لٹریچر میں بلحاظ وصف یا مقدار چنداں اضافہ
نہیں ہوا، یہ اور بات ہے کہ کبھی ضرورت ہوئی تو پڑھے ہوئے سبق دہرا لئے گئے تاہم اس
نہیں نہیں پر بھی کچھ نہ کچھ مواد جمع ہوتا رہتا ہے، مگر یہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ وہ
عموماً غیر وقیع مطابع کر دیا جاتا ہے جو آج کل ہر گلی کوچے میں حشرات الارض کی طرح نکل پڑے ہیں۔

پچھلے چند سالوں کی کانفرنس کی رپورٹوں کو دیکھئے کتنی بری چھپی ہیں جنہیں دیکھ کر
نفرت ہوتی ہے، خود سرسید کی ایک لائق قدر تصنیف ایک بازاری پریس سے ہو کر نکلی
یہ "لنگوٹی" نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ امور کتنے ہی رکیک ہوں تاہم ایسے خاصان قوم
کے اصلی مذاق کی ایک حد تک غمازی ہوتی ہے، مجھے اصرار ہے کہ "علی گڑھ لٹریچر کو بلا استثناء
اول درجہ کے پریس میں چھپنا چاہئے"، موجودہ پالیسی لائق اصلاح ہے اور شاید اسی کا
اثر ہے کہ "مفید عام" کی لطافت اور صفائی میں بھی ایک طرح کا انحطاط شروع ہو گیا ہے۔
یعنی وہ پہلی سی بات نہیں، قاعدہ ہے بازار میں زیادہ تر وہی چیز آتی ہے جس کی عموماً
مانگ ہوتی ہے۔

لیکن میں نہایت خوش ہوں کہ آج کل ایک "شریف پریس"، لگ گئے "شریف تو"

لٹریچر کے لئے وقف خاص ہو رہا ہے اور اپنے طرزِ عمل سے ثابت کرتا جاتا ہے کہ بیسویں صدی کی
اختراعات کے ساتھ بھی "لیتھو گرافی" کی صنعتی تصرفات ایسے نہیں ہیں جن سے ایک سمت
کے لئے بھی دست بردار ہونا ممکن ہو، مصنف طرب یورپ کی عاجلانہ ضرورتیں صرف ٹائپ کی
سرعت رفتار سے پوری ہو سکتی ہیں لیکن وہاں بھی تزئین و آرائش کے موقعوں پر لیتھو گراف
کی ضرورت ہوتی ہے، گو طریقہ کارروائی کسی قدر مختلف ہو، ہم کو نامی پریس کا ممنون ہونا چاہیے
کہ وہ ایسے زمانہ میں جب کسی چیز کی اچھائی کا اندازہ اس کے اوصاف سے نہیں بلکہ سستے
داموں سے کیا جاتا ہے قیمتی لٹریچر کے اجزائے زریں غیر معمولی نفاست و پاکیزگی سے
پیش کرتا رہتا ہے اور غالباً وہ اس حیثیت سے تمام مشرق میں منفرد ہے۔ ملک میں
آج پانوں کے ولایتی جوڑوں پر معمولاً ایک اشرفی صرف کرنے والے تو بہتر سے ہیں لیکن اس
وضعدار جماعت میں کتنے ایسے ہیں جو بالالتزام نامی پریس کی شائع کردہ "جلد ہائے خاصہ" کی
خریداری کو حفظِ مرتبت کا ایک ضروری جزو سمجھتے ہوں، بہر حال یہی وقعت کی کمی سے لٹریچر
کی کتنی ہی کساد بازاری ہو تاہم نامی پریس اصولاً جرمن نہیں بلکہ انگلش ہے یعنی اس کی پیداوار
آخر کی بھرتی نہیں ہوتی، بلکہ جو چیز ہے ٹکسالی اور آپ اپنی نظیر ہے،

اس وقت تک اس پریس سے جتنی لائقِ ذکر تصنیفات نکل چکی ہیں انکی تفصیل غالباً یہ ہے

۱۔ الفاروق ۲۔ البرامکہ ۳۔ حیاتِ جاوید ۴۔ رباعیات حالی
۵۔ الغزالی ۶۔ الکلام ۷۔ دیوان شبلی

بعض جزئیات کی تصریح خاص لٹریری مقاصد کے لحاظ سے ناگزیر سی ہے اسلئے
میں بتانا چاہتا ہوں کہ "الغزالی" کی جلد خاصہ کے لئے جو کاغذ استعمال کیا گیا ہے غالباً
اس سے پہلے ملک کی کسی تصنیف کو اتنا قیمتی کاغذ نصیب نہیں ہوا۔ کم و بیش یہی

حال اور کتابوں کا بھی ہے، خطاطی اور چھپائی ایک سے ایک بڑھ کر ہیں یہ معلوم ہوتا ہے سنگ مرمر پر سنگ اسود کی پچی کاری کی گئی ہے، یورپ میں "بیسکر ول" بہترین ساخت کا کاغذ سمجھا جاتا ہے جس کی کتابی تقطیع کے ایک کوائر یعنی ۲۰ تختوں کی قیمت گیارہ روپے ہوتی ہے۔ لیکن نامی پریس نے حال میں ایک کاغذ منگوایا ہے جو "بیسکر ول" کی طرح برف سا سفید اور نہایت چکنا اور لطافت میں اس سے بڑھا ہوا ہے یعنی ہلکا ہے اور لاگت میں تو نسبتاً کچھ نہیں" الکلام" اور دیوان شبلی" قسم اول میں یہی کاغذ لگایا گیا ہے۔ اور اسی پر تالیفات موعود کی جن کا ذکر شروع میں آچکا ہے، جلد خاصہ چھپ رہی ہے، ناظرین قبل از وقت درخواستیں بھیجکر ایک ایک جلد اپنے لئے محفوظ کرا سکتے ہیں۔

تالیفات متذکرہ کے علاوہ دو کتابیں اور ہیں جو منشی رحمت اللہ رعد نے خاص اہتمام سے اپنی ایڈیٹری میں شائع کی ہیں۔

یعنی "دیوان حافظ" اور "آثار الصنادید" اور یہ ایک ایسی مفید جدت ہے جس کی طرف ملک کے لائق اصحاب کو بھی متوجہ ہونا چاہیے، آج جو لوگ مستقل تصنیفات کے مالک ہیں ان میں وضع تراجم کا بالکل رواج نہیں ہے اور اس کا تو خیال بھی کسی کو نہیں آتا کہ کوئی قدیم تصنیف محققانہ نوٹ، و حواشی کے ساتھ شائع کی جائے اور گو یورپ کی مستشرقیت کا اعتراف نہایت فیاضانہ الفاظ میں کیا جاتا ہے، لیکن وہاں کے نمونوں کی پیروی کا خیال تفکر بالقوۃ سے آگے نہیں بڑھتا، یہ بھی لٹریچر کی حق تلفی کا ایک پیرایہ ہے جو ناقدردانان سخن کے ہاتھوں ہوتی رہتی ہے، بہرحال ہم رعد کے ممنون ہیں کہ انہوں نے ایک جدید پیش قدمی کی۔

ابھی مجھے یہ دکھانا باقی ہے کہ عموماً کتابوں کی لوح یعنی "سرورق" کے آرائشی

تکلفات رعد کی نازک خیالی اور ایجاد پسند طبیعت کا بہترین مرقع ہوتے ہیں۔

"آرٹ" کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ اپنے تصرفات کے سلسلہ میں نیچر سے قریب و مماثل ہوتا جائے، رعد اس نکتہ کو خوب سمجھتے ہیں، اور سچ یہ ہے کہ فنون لطیفہ کی جس شاخ کو انھوں نے اپنی جدت اختراع اور صنعت آرائیوں سے چمکایا ہے وہ ان کو من حیث الفن، اختصاصی (اسپشلسٹ) ثابت کرتی ہے اور یہ خود ایک کمال ہے۔

بعضوں کا خیال ہے کہ مسلمانوں میں کسی حد تک ارتقاء عقلی شروع ہو گیا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو تھوڑی دیر کے لیے، ہم دل خوش کرنے کو مانے لیتے ہیں کہ موجودہ دور (جس میں "تقریظ مثنوی" اور "نظام الملک طوسی" کی لائف عنقریب عالم محسوسات میں قدم رکھنے والی ہیں) دماغی حیثیت سے اس وقت کے لیے گزرے مسلمانوں کا "نشاۃ الثانیہ" ہے، اس خیال کے ساتھ ہی وہ "ادب العالیہ" یعنی "کلاسیکل" مجموعۂ زریں پیش نظر ہو گیا جسے "نامی پریس" نے وقتاً فوقتاً شائع کیا ہے ان مکلّف اور خوبصورت جلدوں کو ایک جگہ رکھ کر دیکھیے، کیا یہ کسی مٹی ہوئی قوم کے عقلی آثار ہیں ؟ ہرگز نہیں! یہ صحائف زرنگار تو کچھ اور کہہ رہے ہیں، ان کی ایک ایک جلد مطبع سے براہ راست برٹش میوزیم، انڈیا آفس، پیرس کے کتب خانہ عامہ اور اردو لٹریچر کے پروفیسر "گارسن ڈی ٹاسی" کے پاس ہدیتہً بھیجی جاتی تھیں، یعنی دنیا کے اور فائق تر لٹریچر کے دائرہ میں ان کو داخل کرتا تھا، ملکی فضل و کمال کے ساتھ صنعت کے عمدہ ترین نمونے تھے جو یورپ میں علمی نمائش کی حیثیت سے پیش کئے جا سکتے تھے

ہاں ایک بات اور یاد آئی، آرٹسٹ رعد کے دستِ صنعت کی موشگافیاں اس وقت تک طلائی اور نقرئی مینا کاری اور مختلف قسم کی نازک رنگ آمیزیوں

سے آگے نہیں بڑھیں۔ اس میں بھی کسی حاشیہ کی بیل کے لیے وہ نمونہ کام میں نہیں لایا
گیا جسے اصلاح میں "کلید یونانی" کہتے ہیں، اور جو قدامت کے لحاظ سے ایک
کلاسیکل چیز ہے۔

میری خواہش تھی کسی موقع پر صرف سادگی سے آرائش کا کام لیا جائے،
ایک جدید طریقہ یہ ہے کہ حاشیہ کی درمیانی سطح یعنی پلیٹ کو دبا کر حروف ابھارے
جاتے ہیں، جس کے لئے کسی رنگ کی ضرورت نہیں، سطح کا نشیب و فراز اور کوئی
خاص خیال جو نقوش میں ظاہر کیا گیا ہو بجائے خود ایک لطیف صنعت ہے اس
کے لئے وہ طریقہ اختیار کرنا ہوگا جو ریلیف اور ہاف ٹاؤن پر دسعس میں ہوتا جاتا
ہے، یہ خیال کافی طور پر الفاظ میں ادا نہیں ہو سکتا، مغربی نمونے رہبری کریں گے،

دیوان شبلی کی لوح نے ترکوں کی معاشرت کی جدت کو دبا یا۔ لیکن رعد
اس بڑھاپے میں ابھار کہاں سے لاتے نتیجہ یہ ہوا کہ حروف سپاٹ رہے،

آخر میں حضرت رعد سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ موجودہ بے چین زندگی کے حوائج
کو دیکھتے "دیر آید درست آید" ایک بے معنی سا فقرہ ہے، اکسپریس میں اڑنے
والے (چھکڑے تو مدت ہوئی متروک ہو چکے ہیں) مسافر گاڑیوں میں سفر کرنا بھی بلائے
جان سمجھتے ہیں، آپ کی "کل" خیام کی "فردائے دیروز" (یعنی آج) سے بدل جاتی
تو اچھا تھا، آخر انتظار کی کوئی حد بھی ہے، مولانا روم اور نظام الملک طوسی سے
جلد ملا دیئے تو احسان ہوگا۔

یہ بسیط اظہار خیال ایک مستقل عنوان کے تحت میں غالباً بعض صاحبوں کی
رائے میں ایک بے جوڑ سی بات ہوگی، لیکن دنیا میں آج ذرے بھی سالمات

ہو رہے ہیں، اور کوئی ایسی چیز موجود فی الخارج نہیں ہے جس سے نظام کائنات کو کچھ نہ کچھ مدد نہ ملتی ہو، نامی پریس چونکہ بواسطہ ملک کی دماغی ترقی کا کفیل ہے، ضرورت تھی کہ لٹریری گروہ کی طرف سے قومی اخبار میں اس کے مساعی جمیلہ کا کافی اعتراف نہ سہی ایک مرتبہ ذکر تو آ جائے۔

(البشیر - ۱۹۰۶ء)

آدھ گھنٹہ علامہ شبلی کے ساتھ

فاضل عصر پروفیسر کی تالیفات جدید یعنی مولانا روم کی لالئف جس کے لئے مدت سے آنکھیں فرش راہ تھیں، گھونگھٹ سے باہر آئی اور اس طرح کہ

"عروسِ جمیل و لباسِ حریر"

یورپ میں جہاں مذاقِ حسن پرستی یعنی ایک طرح کے تناسبِ اجزا کی رعایت قریب قریب ہر شخص کا خمیر ہو رہی ہے، جہاں شائقین کی نگاہیں کہربائی روشنی میں جگمگاتی "زہرہ ہائے شب" کے مقیاس الشباب اور اس کے برہنہ حصۂ افقی کے جائزہ کے لئے وقف رہتی ہیں، ایک سنجیدہ طبقہ ایسا بھی ہے جو کتابوں کو علمی حرم کی حیثیت سے دیکھتا ہے اور ان کا دلدادہ ہے، اس کے خیال میں کسی کتب خانہ کا ایک گوشہ جہاں اس کی منظورِ نظر نازنینوں کا جھرمٹ ہو، اور جو ہمیشہ اس کی فرصت اور مرضی کی منتظر رہتی ہوں، اس شاہی محل سے کہیں بڑھ کر ہے جس کے لوازمِ عیش صرف دور سے دیکھنے کی چیز ہیں،

بہر حال ایک ایسا گروہ موجود ہے جو علمی دنیا میں درجۂ استغراق رکھتا ہے۔ اور زمانے کے سرد و گرم سے قطعاً بے پروا ہے، اس کا دائرہ مخصوص خود ایک دنیا ہے جہاں ایسے سامانوں کی کمی نہیں جن سے قوتِ احساس ہر طرح کی لذت و انبساط

حاصل کرتی رہتی ہے۔ اسی طبقہ میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کی نفاست اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ وہ معمولی مطبوعات کو پسند نہیں کرتے، اور چیدہ چیدہ کتابوں کے خاص خاص اڈیشن چھپوائے جاتے ہیں، حال میں "رباعیات عمر خیام" کا ایک اڈیشن اسی اصول پر ایک جماعت محمود یعنی صرف دو سَو صاحبوں کے لیے چھاپا گیا ہے، جس کی اشاعت صرف ممبروں تک محدود رہی اور جس کا ایک قیمتی نسخہ خوش نصیبی سے آج کل میرے مطالعہ میں ہے۔

ہندوستان میں اس قسم کے معزز شواہد کی اوّلیت کا فخر، صرف "نامی پریس" کانپور کو حاصل ہے، جس کا ذکر ایک دفعہ آچکا ہے، اسی طرح طبقۂ اعلیٰ کے مصنفین میں علامہ شبلی کی تصنیفات کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ ان کا بہتر سے بہتر اڈیشن جو کسی نفیس پسند کے خیال میں آسکتا ہے، اکثر لائق حصول ہوتا ہے، موجودہ کتاب کی جلد خاصہ میرے دعوی کے ثبوت میں ہے اور میرا خیال ہے ملک میں آج تک اس سے بہتر اڈیشن ایسی کتاب کا شائع نہیں ہوا، قاعدہ ہے لفافہ اچھا ہوتا ہے تو ملفوف کو اس سے کہیں زیادہ اچھا ہونا چاہیے، اور گو میں اس وقت جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ صرف تازہ وارد یعنی تقریظ "مثنوی" کے خیر مقدم کی حیثیت سے ایک فوری جوش کا اظہار ہوگا تنقید یعنی مولانا روم کے ساتھ علامہ شبلی پر قلم اٹھانا فرصت دلیاقت کا کام ہے جسے ملک کے فاضل تر اصحاب کے لئے چھوڑتا ہوں، اس میں میرا پردہ رہا جاتا ہے اور سپاہی سرسری طور پر کچھ نہ کچھ کہہ جاؤں گا جس میں ذمہ داری ہاتھ دھوکر پیچھے نہیں پڑے گی۔

"سوانحِ روم" علامہ شبلی کی تالیفات میں (بشمول دیوان فارسی) سلسلہ کی دسویں جلد ہے، موضوع سخن اور اس لحاظ سے کہ انہوں نے اپنے ملکۂ راسخہ یعنی فطری قوت

تصنیف سے آج تک وہی کام لیا جو ان کے دل و دماغ کا اچھے سے اچھا مصرف ہو سکتا تھا۔ ملک کے مصنفین میں یہ فہرست تو تھے ہی، میں دیکھتا ہوں اب بہت آگے نکلے جاتے ہیں، انھوں نے فلسفہ و تاریخ کو اس لحاظ سے کہ وقت کی چیز ہے۔ اپنا خاص فن قرار دیا اور ترتیباً جس پیمانہ پر یہ اظہارِ خیال کرتے رہے وہ ایک منحرف بھی تسلیم کرے گا کہ ان کی قوتوں کا صحیح سے صحیح استعمال تھا کہ جو خیال میں آسکتا ہے، ملک کے اچھے لکھنے والوں میں بعض ایک طرح کے دھوبی ہیں، یعنی وہ فرمائش سے کچھ نہیں کرتے، اچھی سے اچھی تجویز پیش کیجئے، لیکن اسلئے لائق التفات نہیں ہوگی کہ وہ ان کے صاف و شفاف دماغ کی گونج نہیں ہے، تاہم وقت آگے چل کر بتائے گا کہ جن دماغوں میں اقتضائے وقت کی رعایت اور صحیح قوت فیصلہ نہیں ہے۔ ان کے نتائجِ فکر ایک طرح کی وقتی اور خودرو پیداوار ہیں جن کی شادابی صرف ایک موسمی چیز ہے۔

لیکن علامہ شبلی سے ہم کو اس قسم کی شکایت نہیں، یہ خود بلا بارِ تہدید و فرمائش جو کچھ کرتے رہتے ہیں وہ ہماری توقعات اور استحقاق سے کہیں زیادہ ہے ان کی مستقل تصنیفات جن کی تعداد پر بتائی گئی ہے ۱۳-۷۲ صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں، حالتوں کا موازنہ آجکل کے عوائد الرسمیہ (ایٹی کیٹ) کے مطابق خلاف شائستگی سمجھا جاتا ہے، تاہم یہ تنقید کا ایک ضروری عنصر ہے، لیکن میں اس وقت ان کو ان کے دائرہ کے دوسرے خلاقینِ ادب سے ٹکرانا نہیں چاہتا۔ صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ جس طرح یہ اپنے حلقہ میں غالباً سب سے کم عمر مصنف ہیں، ادبی حیثیت سے یہ نسبتہً اتنے ہی بڑھے ہوئے ہیں، اس دماغی فوقیت کا راز صرف یہ ہے کہ خوش نصیب شبلی نے اپنی ذہنی اور اکتسابی قوتوں کو رعایت سے جو وسیع موضوع بحث اختیار کیا وہ

بلا استثناء اوروں کے دسترس سے باہر تھا، اس سے زیادہ موزونیت لائق رشک ہے۔
حقیقتاً ان کے ہر حصۂ تصنیف کا ایک خاصہ ہوتی ہے، اسلامی تاریخ فلسفہ اور عقاید کے
متعلق جس قدر مواد یہ یکجا کر سکے قدیم تاریخ کا گویا نچوڑ ہے جس سے ایک حد تک
تاریخ عربی لٹریچر کی ترتیب ممکن ہے، اسلامی تاریخ کے متعلق ایک زمانہ میں یورپ نے
جس قدر متعصبانہ رائے قائم کی تھی، اب رفتہ رفتہ وہ ان سے دست بردار ہوتا جاتا
ہے، موجودہ دور میں جو ہر قسم کی دماغی ترقیات کا دور ہے، واقعات کا ایک خاص معیار
صداقت قائم ہو گیا ہے، ہر واقعہ کی جانچ اجتماعی اخلاقی، سیاسی حیثیت سے کی
جاتی ہے۔ چنانچہ یورپ میں علمائے مستشرقین کی توجہ سے جدید سلسلۂ اکتشافات میں
اسلام کے متعلق ایک نیا لٹریچر پیدا ہو گیا ہے، جس میں ہمدردانہ التفات کے ساتھ
ایک طرح کی سنجیدگی اور بلند نظری پائی جاتی ہے تاہم ان علمائے کے خیالات کا بیشتر حصہ
نظرثانی چاہتا ہے میں مثلاً محققین یورپ کے سرخیل یعنی "وان کریمر" کا ذکر کروں گا
جس نے ایک رسالہ مختصر الموضوع میں یہ دکھایا ہے کہ اسلام اپنی ترکیب و ساخت
کے لئے کن کن مذاہب کا ممنون ہے، ناظرین عنقریب مفصل اقتباسات دیکھیں گے
جس سے اندازہ ہو سکے گا کہ فاضل مورخ نے عمداً استخراج نتائج میں کہاں تک بے پروائی
سے کام لیا ہے، بہر حال باوصف اس حسن ظن کے جو آج کی جماعت مستشرقین کی طرف
سے پیدا ہوتا جاتا ہے۔ اس قسم کی مثالیں کم نہیں جن میں مغربی علماء کی اجتہادی
لغزشیں اب بھی محسوس ہوتی ہیں۔

لیکن پروفیسر شبلی نے جیسا کہ پہلے کسی موقع پر دکھایا گیا ہے ہم کو غیروں
سے قریب قریب بے نیاز کر دیا ہے، یہ جس طرح قدیم تاریخ و لٹریچر کے جامع ہیں، آجکل

کے فلسفیانہ انتقادات اور نکتہ سنجیوں سے آشنا ہی نہیں، بلکہ مذاق ان میں اس قدر
رچا ہوا ہے کہ ان کے طے کردہ مسائل جو دنیا کے سامنے پیش کئے گئے ہیں اس حد تک
کامل ہیں کہ میرا خیال ہے زمانۂ آئندہ بلکہ بعید آئندہ میں بھی غالباً ان پر کوئی معتدبہ
اضافہ نہ ہو سکے گا، اسی طرح ان کے اجتہادات کا (جن کو تاریخی الہامات کہنا زیادہ تر
موزوں ہوگا) کوئی حصہ صدیوں بعد بھی متروک ہونے کے لائق نہیں ہوگا، اس سے
اس سے زیادہ شبلی کے غیر فانی ہونے کا ثبوت کیا ہوگا؟ یہ لکھ رہا ہوں اور میری نظر ان بہترین
تالیف یعنی الکلام کے دونوں حصوں پر ہے اور میں بلا خوف تردید یہ کہنا چاہتا ہوں کہ
اگر موجودہ نسل کے لئے دماغی اور عقلی ترقی کے ساتھ اخلاقی تکمیل کی بھی ضرورت ہے
تو ہم کو "الکلام" کے ہوتے کسی کتاب کی ضرورت نہیں، جو حضرات جدید علم کلام کی
ضرورت کا احساس رکھتے ہیں، وہ دیکھیں گے کہ فاضل پروفیسر نے ایک طرف تو
بڑے میاں یعنی مذہب کی پگڑی نہیں اتاری اور ساتھ ہی یورپ کے نوخیز چلبلے
چھوکروں یعنی فلسفہ اور سائنس کے سامنے تیرہ سو برس کے بوڑھے سے ہاتھ نہیں
جڑوائے، بلکہ دلوں میں مصافحہ کرا دیا، یہ معتدل روش جو اس علمی تنازع میں اختیار کی
گئی ہے وہ شبلی ہی کا حصہ تھا جو نئے پرانے خیال والوں کے متفق علیہ پیشوائے علمی
ہیں، ان کی ثقافت نے جہاں مذہب کی حق تلفی نہیں ہونے دی، سائنس و فلسفہ
کی مغائرت بھی دور کر دی، اور سان کو مذہب کا دست و بازو بنا دیا، آئندہ زمانے
میں جب ہماری عقلی ترقیات کا شباب ہوگا، شبلی کو اپنے مساعی جمیلہ کی پوری داد ملےگی
تاہم آج کل کا تعلیم یافتہ طبقہ جو تھوڑا مذہب سے بے پروا ہو رہا ہے، مذہب فطری یعنی
حکیمانہ اسلام سے دست بردار نہ ہو سکے گا، معقول و منقول تطبیق کی غایت اس کے سوا

اور کیا ہو سکتی ہے جو شبلی کی دردسری کا بجائے خود ایک قیمتی صلہ ہے۔

خدا جانے میں رَو میں کہاں سے کہاں نکل گیا، لیکن یہ قصور انشا پردازی نہیں ہے، بلکہ پروفیسر شبلی اس کے ذمہ دار ہیں، ناممکن ہے کہ ان کی ذات کے ساتھ ان کی صفات غالب یعنی جزئیاتِ متعلق سامنے نہ آجائیں، اس لئے ان بے ربط خیالات کا اعادہ کچھ ناگزیر سا تھا، مختصر یہ کہ جہاں ان کی مورخانہ عظمت قطعی الثبوت ہے ایک خاص امر جس کی طرف ناظرین کو اس وقت متوجہ کرنا منظور ہے یہ ہے کہ "عربی کا یہ فاضل پروفیسر نہایت سخت عجمی ہے،" تو یہ! کیا کہہ گیا؟ ہاں تو یہ وصف اضافی ان کی عربیت میں اس قدر دب گیا ہے کہ بہتروں کو یہ بات معلوم نہیں ہوگی کہ دنیا کی سب سے شیریں زبان یعنی فارسی شبلی کی خاص زبان ہے ان کو جس حد تک صحیح مذاق سخن ہے اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو خود اہل زباں ہیں یا کم سے کم ذوق سلیم رکھتے ہیں ہندیوں کی متعارف فارسی" بابو انگلش" کی طرح ایک بالکل جداگانہ چیز ہے جو قریب قریب یہاں سے رخصت ہو چکی ہے اور جس سے میں یہاں کوئی غرض رکھنی نہیں چاہتا، میری غرض پروفیسر براؤن کی فارسی سے ہے جو اس قوم کی زندہ یادگار ہے جو بلحاظ گزشتہ عظمت و ترقیات دنیا کی قدیم متمدن اقوام میں خاص تاریخی وقعت رکھتی ہے، انگلستان مستشرقانہ مشاغل کے لحاظ سے یورپ کے اور ممالک سے بہت پیچھے ہے، تاہم وہاں ایک جماعت موجود ہے جو السنہ مشرقی میں اہل زبان کی سی مہارت رکھتی ہے، حال میں پروفیسر براؤن نے ادبی حیثیت سے "تاریخ العجم" لکھی ہے، جس کی دو مبسوط اور ضخیم جلدیں اس وقت تک شائع ہو چکی ہیں" دور اخمانیاں" یعنی فارسی قدیم کے ساتھ اس نے ساسانیوں" کے عہد کے لٹریچر یعنی زبان پہلوی

کا پورا مرقع کھینچا ہے جو تمام تر کمال گویا "نوربشتی" لٹریچر ہے، اس نے نہایت قدیم کتب ملی
اور تاریخی اسناد سے اس عہد کی علمی معلومات بہم پہنچائی ہیں جس کی یادگار پارسیوں کا
صحیفۂ علمی یعنی "اوستا ہے"، جس کی تفسیر پہلوی اور شرح الشرح "ژند یا زند" ہیں
ہیں، عجمیوں کی ایام جاہلیت کی تاریخ کے بعد جو نہایت عسیر الحصول ماخذوں سے
مرتب کی گئی ہے، تیسرے دور میں فاتحین اسلام کے تصرفات یعنی عربی کی آمیزش
نے زبان پر جو اثر ڈالا ہے۔ ان جزئیات کی تفصیل کے ساتھ ارتقائی حیثیت سے یہ
دکھایا ہے کہ فارسی جدید کس طرح عالم وجود میں آئی، اسی طرح مسلمانوں کی مفصل دماغی
تاریخ لکھی ہے اور اس کو متعدد دوروں میں تقسیم کیا ہے، جدت یہ ہے کہ ساتھ ہی ساتھ
عجمی عنصر کو الگ کر کے دکھاتا گیا ہے، پہلی مقدمہ کی حیثیت سے ہے، دوسری میں جو
ابھی شائع ہوئی ہے فردوسی سے لیکر سعدیؒ کے وقت کی لٹریری سرگزشت ہے
جس میں مختلف عہد کے لٹریچر کے ساتھ لگے لپٹے واقعات پر بھی نظر ڈالی گئی ہے جو
کسی حیثیت سے تاریخی وقعت رکھتے ہیں، پھیلاؤ غضب کا ہے، لکھنے والا سب
کچھ سمیٹتا گیا ہے، لٹریچر کی تاریخ تو اس سے پہلے بھی لکھی گئی ہے۔ لیکن مسلمانوں
کی دماغی تاریخ پر قلم اٹھانا ان اصلی ماخذوں کی چھان بین کے بعد جو یورپ کی
عظیم الشان لائبریریوں میں لائق حصول ہیں، پروفیسر براؤن کا حصہ تھا، یہ نمونہ جس
کی نظیر انگریزی کے سوا مغربی لٹریچر میں بھی موجود نہیں ہے اپنی ندرت اور دلچسپی
کے لحاظ سے ہر طرح پیروی کے لائق ہے لیکن شبلی کے سوا آج ملک میں اسلامی
لٹریچر کے متعلق کون اس قسم کے وسیع لٹریری تحقیقات کا ساتھ دے سکتا ہے؟
موجودہ دور میں پروفیسر آزاد کا نام نامی ہمیشہ عزت کے ساتھ یاد رکھنے کے

لائق ہے، شبلی کے دائرہ میں یہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اپنی تحقیقات کی تکمیل ایران میں جا کر کی، ان کا ایک بے نظیر رسالہ سخندان پارس شائع ہو چکا ہے۔ لیکن نہایت افسوس ہے کہ دنیا آزاد کے سرمایۂ زندگی یعنی جامع اللغات فارسی سے محروم رہ گئی جس کی ترتیب ان کی عمر کا اصلی کارنامہ تھی، آزاد کی نکتہ آفرینیاں جن پر خود اہل ایران کو تعجب و رشک ہوتا تھا، تمام علمی دنیا کو حیرت میں ڈال دیتیں لیکن ملک کی بدنصیبی سے ایک ذخیرہ دست ماہر السنہ جیتے جی ہمارے ہاتھ سے جاتا رہا، معلوم نہیں اس کے خزائن علمی کا ضروری حصہ اب کہاں تک لائق حصول ہے، اسی طرح "تذکرہ شعرائے فارسی" میں خدا جانے فرمانروائے سخن نے کچھ لکھا ہوگا لیکن ان دونوں تالیفات کے متعلق کہیں سے کوئی آواز نہیں آتی، دار الاشاعت پنجاب نے ایک حد تک حق رفاقت ادا کیا، لیکن اب مدت سے بالکل ساکت ہے،

جس طرح فارسی کے صحیح ادبی مذاق کا بہت بڑا حصہ آزاد کو ملا تھا، شبلی پر مع شئے زائد اس کا خاتمہ ہو جائے گا، اس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں، میں دیوان شبلی کو استشہاد اً پیش کرنا چاہتا ہوں، سستہ، رفتہ، کلام کی برجستگی اپنا مرتبہ آپ بتائے گی، صاف معلوم ہوتا ہے سچے جذبات میں ڈوبا ہوا شاعر خالص اہل زبان ہے، جس کو ہند کی ہوا تک نہیں لگی، اساتذہ کے ہزاروں اشعار کا نوک زباں اور روزمرہ اور محاورات کا ناخنوں میں ہونا اضافی امور ہیں جن کو شبلی کی بلند پائگی کے ثبوت میں پیش کرنا ایک عبث یا نہ فعل ہوگا ان کا اصلی فن کچھ اور ہے "شعر العجم" جو آج کل یہ لکھ رہے ہیں ان کے مذاق سخن کی جولانگاہ ہو گی جس میں فارسی شاعری کا محققانہ تاریخ اور فلسفۂ شاعری کے دقیق رموز مفصل بحث ہو گی جس سے معلوم ہوگا کہ فارسی

شاعری کی ابتدا میں کیا حالت تھی، پھر اس نے کیا صورت اختیار کی، کیا کیا تغیرات اور اضافے ہوئے، اور اب کس لباس میں جلوہ گر ہے۔

شاعری جیسا کہ عربوں کا خیال تھا صرف کلام موزوں نہیں ہے نہ شعرائے عجم کے خیال کے مطابق صرف تخیل یعنی ایک ہی طرح کے مقدماتِ موہومہ کی ترتیب کا نام ہے۔ بلکہ جیسا کہ علامہ شبلی نے خود ایک موقع پر تصریح فرمائی ہے جو چیز مدرکاتِ انسانی میں ہمارے جذبات و احساسات کو برانگیختہ کر سکتی ہے اور ایک خاص طرح کی موزونیت کے ساتھ مصوری اور موسیقی کی جامع ہے، آج اسی پر شاعری کا اطلاق ہو سکتا ہے، یہ بحث نہایت دلچسپ ہے جسے شبلی جو فطری شاعر ہیں، من حیث الفن اچھی طرح سمجھائیں گے، ہم کو معلوم ہے کہ یورپ کے دو زبردست مستشرق آج کل تاریخ فارسی لٹریچر لکھ رہے ہیں جن میں پروفیسر براون کی بے نظیر کتاب کے دو حصے جن کا ذکر آ چکا ہے شائع ہو چکے ہیں، دوسرے صاحب "ڈاکٹر ڈینی سن راس" ہیں، ان کی فارسیت کا بھی لوہا مانا جاتا ہے، مستشرقین یورپ کی ایک خاص طرح کی وسیع النظری میں کلام نہیں، یعنی اصولِ ارتقا نے تحقیقات کے راستے اس قدر صاف کر دیے ہیں کہ ہر شے کے مدارج اور طبقاتِ ترتیبی کی کڑیاں ملتی جاتی ہیں، لٹریچر بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں تاہم مذاقِ سخن میں جو ایک ذوقی چیز ہے ان فلسفیانہ اکتشافات سے کوئی مدد نہیں مل سکتی، شبلی جو کچھ لکھیں گے آشنائے فن ہو کر لکھیں گے اس لیے ان کی تصنیف موعود (شعر العجم) میرا خیال ہے معاصرانہ تالیفات سے جو حسن اتفاق سے ساتھ ساتھ لکھی جا رہی ہیں بالموازنہ فائق رہے گی، بہرحال فارسی شاعری سے پروفیسر شبلی کو جو طبعی مناسبت ہے اور آئندہ جس حد تک یہ کھل کر دادِ سخن دے سکیں گے اس کی نسبت ابھی کچھ

کہنا قبل از وقت ہے۔

میں سردست سوانح مولانا روم کو پیش کرتا ہوں، جس میں مثنوی پر مفصل تقریظ کی گئی ہے اور جو شبلی کی طرف سے فارسی لٹریچر کے سلسلے کی گویا پہلی قسط ہے۔ مثنوی فارسی کی ان چار کتابوں میں ہے جو دنیا میں سب سے زیادہ مقبول ہوئیں لیکن وہ عموماً ایک تصوف کی کتاب سمجھی جاتی ہے جس کی نسبت عام خیال ہے کہ تمثیلی زبان میں وہ اسرار نہاں بیان کئے گئے ہیں جو صوفیوں میں سینہ بہ سینہ چلے آتے ہیں۔ شبلی نے بالکل ایک جدید حیثیت سے اس مثنوی پر نظر ڈالی ہے، یعنی ان کا دعویٰ ہے کہ تصوف یعنی فلسفہ باطنی کے سوا کلام و عقائد کی یہ بہترین تصنیف ہے جو اسلامی لٹریچر کی طرف سے پیش کی جا سکتی ہے اور کچھ شک نہیں کہ تقریظ میں اس قدر شواہد بہم پہنچائے گئے ہیں کہ دعویٰ آپ اپنی دلیل ہو رہا ہے، عقائد و کلام کے جس قدر اہم مسائل ہیں ایک ایک کر کے متفرق عنوانات کے تحت میں لائے گئے ہیں، اور ان پر حکیمانہ استدلال کے ساتھ فاضل مؤلف نے دکھایا ہے کہ یہ تمام مسائل مثنوی سے ماخوذ ہیں، ایک ایسی کتاب میں جو سیکڑوں برس پہلے لکھی گئی اس قسم کے نکات و معارف کا موجود ہونا جن کا انکشاف جدید سائنس صدیوں کے مسلسل مطالعہ فطرت اور ارتقائے عقلی کے کر سکا، کہاں تک اس کی معجز بیانی ثابت کرتا ہے۔

شبلی نے ایک طرف کوئی ایسی بات نہیں پیدا کی جس کی طرف خود مولانا روم رو کا ذہن منتقل نہ ہوا ہو، اور ساتھ ہی ان مسائل کو جو مذہبی فلسفہ کی حیثیت سے مثنوی کے اعضائے رئیسہ میں تحلیل کر کے اس طرح دکھا دیا کہ ان کی صحت کا اذعان غالب ہو جاتا ہے اور یہی مسائل فلسفہ کی واقفیت کی اخیر سرحد ہے ان کے مقابلے میں علمائے

نذیر احمد کہاں تک ہم کو اپنے ساتھ رکھ سکیں گے۔ جب وہ بیسویں صدی کی ایک جدید تالیف میں دعائے صحتِ خانہ کی تلقین فرماتے ہیں، حالانکہ زمانہ کے ساتھ صحت خانے کا اصلی مصداق بھی باقی نہیں رہا۔ اب ان کی جگہ صاف ستھرے غسل خانوں نے لے رکھی ہے۔

یہ امر بھی توجہ کے لائق ہے کہ فاضل پروفیسر نے تقریظ مثنوی میں جو نئے نئے عنوان قائم کئے ہیں اور جن کی طرف بہتوں کا ذہن اس سے پہلے منتقل نہ ہوا ہوگا وہ زیادہ تر ایسے ہیں جن پر اس سے پہلے شبلی کی قوت صرف ہو چکی ہے یعنی الکلام و الغزالی میں تفصیل سے ان کا ذکر آچکا ہے کسی ایسے موضوع پر ایک دفعہ زور طبیعت صرف ہو چکا ہو۔ دوبارہ اس طرح بچ بچ کر قلم اٹھانا کہ کہیں سے تکرار و اعادہ نہ معلوم ہو بلکہ اصلیت کے زور کے ساتھ ہر عنوان اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل اچھوتا ہو کمال انشا پردازی دلیل ہے، فاضل شبلی نے مثنوی کی خصوصیات کو تفصیل کے ساتھ دکھایا ہے اور مختلف پہلوؤں سے اس پر نظر ڈالی ہے، جس میں تخصیص کے ساتھ لائق ذکر مثنوی کا طرز استدلال اور طریقہ افہام ہے یعنی مولانا نے فطرت کے سلسلہ سے استدلال کیا ہے، جو بالکل جدید سائنس کے مطابق ہے، مثنوی میں فرضی روایات و حکایات ضمن میں جن میں صرف نتائج سے غرض رکھی گئی ہے اخلاقی مسائل کی تلقین کا جو طریقہ مدت سے چلا آتا تھا پروفیسر شبلی نے دکھایا ہے کہ مولانا نے اس کو کمال کے مرتبہ تک پہنچا دیا، اور چونکہ استدلال میں تمام تر قیاس تمثیلی سے کام لیا گیا ہے، اس لئے مسئلہ زیر بحث کی واقفیت دل میں بیٹھ جاتی ہے یعنی عموماً تشبیہات و تمثیلات کے پیرایہ میں اس قسم کے قرائن پیش کئے جاتے ہیں جن سے خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ اس واقعہ کا جو

صورت بیان کی گئی ہے زیادہ تر قرائن عقل ہے جس سے ایک خاص طرح کی وجدانی کیفیت دل
میں پیدا ہو جاتی ہے جو استقرائے منطقی سے نہیں ہو سکتی، اور جس کو تصوف کی اصطلاح میں ہم
اطمینانِ ذوقی کہہ سکتے ہیں، مختصر یہ کہ مثنوی معنوی میں عارف روم نے جس طرح دادِ سخن
دی ہے ۔ اس پر تنقیداً کچھ رائے زنی کرنا میرا منصب نہیں، میں تو صرف تقریظ پر تقریظ
کرنی چاہتا ہوں، یعنی مجھے صرف یہ دکھانا ہے کہ شبلی نے انتقادی حیثیت سے کہاں تک
اپنے فرائض سے سبکدوشی حاصل کی، اس کے لئے جو کچھ عرض کیا گیا اس کے ساتھ بس
اتنا کافی ہے کہ "آفتاب آمد دلیل آفتاب" کتاب کو ایک نظر دیکھ لیجئے وہ اپنا درجہ آپ
بتائے گی، لیکن آخر میں اتنا کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ الہیات کے ضمن میں توحید،
نبوت، معجزہ، جبر و قدر، روح و معاد وغیرہ وغیرہ پر جن سلجھے ہوئے اور پاکیزہ خیالات
کا اظہار کیا گیا ہے اور موجوداتِ عالم یعنی مادیات اور مجردات کی نازک تفریق اور اس پر
منطقی اور فلسفیانہ تفریعات جس لطافت سے کی گئی ہیں، انتقاد کی جان ہیں، ہمارے
ہاں ردّیات تو بہت ہیں لیکن اس طرح علوم قدیمہ و جدیدہ کو ترکیب دے کر کسی نے
ست یعنی جوہر نہیں نکالا ہے صرف فاضل پروفیسر کا حصہ ہے۔

تصوف جیسا کہ اکثروں کا خیال ہے ایک طرح کا "خبط متعارف" نہیں ہے
بلکہ جیسا کہ علامہ شبلی نے تصریح فرمائی ہے دراصل تصحیح خیال کا نام ہے جو اخلاق کی طرح
فلسفہ کی ایک مستقل شاخ ہے لیکن جس طرح توکل کا مصداق ایک طرح کی گداگری ہو رہا
ہے تصوف کی صورت بھی اتنی بگڑ گئی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ پیٹ کا ایک مشغلہ
رہ گیا ہے، لیکن شبلی نے تصوف پر علمی حیثیت سے نگاہ ڈالی ہے، جس سے ہم یہ سمجھ سکے
کہ ذوقی اور وجدانی کیفیت کے ساتھ اس میں ادبی پہلو بھی موجود ہے، یہ بات ذرا دل

لگتا ہے یعنی اس گروہ کے مذاق سے ملتی جلتی چیز ہے جو اس کوچہ سے نابلد ہے۔

تصوف کی مفصل تاریخ اور اس کے لفظی استقاق و اطلاق کی بحث جس کے متعلق علمائے یورپ اب بھی غلطی کر رہے ہیں "الغزالی" میں مستقل عنوان سے آچکی ہے ناظرین اسے اٹھا کر پھر ایک نظر دیکھ لیں "تقریظا مثنوی" میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اختصار کے ساتھ ہے لیکن "شریعت" کے ساتھ "طریقت" و "حقیقت" سے جو پردہ اٹھایا گیا ہے اور حدود و اقلیدس کی طرح ان اصطلاحات کی جس قدر جامع و مانع تعریف کی گئی ہے وہ بجائے خود ایک چیز ہے اور ضرورت ہے کہ ان کے اطلاقات معناً ہماری روزآنہ زندگی کا ایک جزو ہو جائیں

میرا خیال ہے اب مجھے کچھ اور کہنا نہیں ہے، ہاں ایک بات رہ گئی۔ کتاب کے ختم کر لینے کے بعد خیال ہوتا ہے کہ مولانا روم کے کلام کا جس قدر استقصا کیا گیا ہے کچھ اس سے زیادہ ہونا تھا، لیکن میری رائے اس لئے لائق وثوق نہیں ہے کہ میں چونکہ شبلی کے عالمانہ لٹریچر کا دلدادہ ہوں۔ پہلی بار پڑھتے وقت نظم کا حصہ چھوڑ تا گیا تھا اضطراری حرکت اوروں نے بھی کی ہوگی۔ یورپ کے مذاق کے مطابق مثنوی یا اس کے حصہ غالب کو ضمیمہ کی حیثیت سے کتاب کا جزو ہونا تھا، لیکن ملک کا ادبی مذاق اس قدر گرا ہوا ہے کہ یہ خیال مشکل سے توجہ کے لائق ہے، اس کے سوا تنقیدی حیثیت سے کلام کے جن اجزا پہ ریویو کی ضرورت تھی ہر قسم کے نمونے لے لئے گئے ہیں اور بیا گرافر کا صرف اتنا ہی فرض تھا۔

آخر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ چونکہ لٹریچر کا لطف اور اس کی دلچسپیاں انسان کی اخلاقی اور ادبی ترقی کی ممد ہوتی ہیں، ہم علامہ شبلی کے ممنون ہیں کہ ہم کو جلد جلد ان کے دماغی اکتشافات سے مستفید ہونے کا موقع ملتا رہتا ہے اور ہماری دلی خواہش ہے کہ موجودہ کتاب ان کی تصنیفات موعود کا صرف پیشرو ہوگی۔

آج کل کی کاروباری زندگی میں جب ہم کو مشرقی لٹریچر کی طرف توجہ کرنے کی بالکل فرصت نہیں ہے، صرف یہی ایک طریقہ ہے کہ عربی فارسی لٹریچر کے بہترین اجزا عالمانہ تنقید و تقریظ کے ساتھ نئی نسل کے سامنے پیش کئے جائیں۔ اس طرح لٹریچر کا وہ حصہ جو جاننے کے لائق ہے ہمیشہ کیلئے محفوظ رہ جائے گا۔ ملک میں ناقص لٹریچر کی مقدار اس قدر بڑھ رہی ہے کہ ضرورت ہے جواہرات کنکر پتھر سے علٰحدہ کر لئے جائیں، حکما نے انتخاب کے کچھ قاعدے بتاتے ہیں جن میں "لارڈ بیکن" کا خیال بہت ہی چبھتا ہوا ہے وہ کہتا ہے "بعض کتابیں صرف چکھنے کے لائق ہیں، کچھ نگلنے کے اور تھوڑی ایسی ہیں جو چبانے اور ہضم کرنے کی ہیں" شرر کے ناول پہلی شق میں ہیں، دن رات میں چند منٹ محض ذائقہ علمی کے لئے نگلنے کے لائق وہ تصنیفات ہیں جو کم سے کم ایک دفعہ پڑھی جائیں (نام نہیں لوں گا، ادب مانع ہے) مگر چبانے اور ہضم کرنے کے لائق مجموعۂ غیر فانی یعنی "تالیفات شبلی" ہیں جن میں "مولانا روم" کی لائف ترتیباً آخر ہے، لیکن بہ لحاظ اوصاف کسی سے پیچھے نہیں ہے۔

(البشیر ۱۹۰۶)

افادات وان کریمر

متعلق

تمدن اسلام

(۱)

مسٹر صلاح الدین (خدا بخش) ایم اے بیرسٹر ایٹ لا نے تاریخ الاسلام کے متعلق انگریزی میں ایک مجموعۂ رسائل شائع کیا ہے جس میں جرمنی کے نامور مورخ "وان کریمر" کی ایک بے مثل اور جامع تالیف کا ترجمہ خصوصیت کے ساتھ لائق ذکر ہے، وان کریمر کی نسبت یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ عربی داں تھا یا نہیں؟ تاہم چونکہ مسلمانوں کی تمام قدیم اور نمایاں تاریخی تصنیفات قریب قریب ترجمہ کے ذریعے سے یورپین زبانوں میں منتقل ہو گئی ہیں، یہ کہنا غالباً صحیح ہوگا کہ وان کریمر نے جو کچھ لکھا ہے اول درجہ کے ماخذوں سے لکھا ہے، اس نے متعدد کتابیں متعلقاتِ اسلام پر جرمن زبانوں میں لکھی ہیں اور آج یورپ میں اس حد تک اس کی تحقیقات کا لوہا مانا جاتا ہے کہ بڑے بڑے فاضل اور پروفیسر بھی اس کی تحقیقات کے نتائج سے بے نیاز نہیں رہ سکتے، اور ادبی (لٹریری) گروہ میں ایک رواج سا ہو گیا ہے کہ استشہاداً جہاں جہاں کھپت ممکن ہوتی ہے اس کے خیال سے جدید تالیفات کی وقعت بڑھائی جاتی ہے۔

بہر حال جس تالیف کے اقتباسات اس وقت پیش کرنے ہیں اس کا موضوع خاص یہ ہے کہ اسلام نے دوسرے مذاہب سے کہاں تک فائدہ اٹھایا؟

"وان کریمر" نے اسلام پر ایک ارتقائی نظر ڈالی ہے اور دکھایا ہے کہ اس کی ترکیب اور ساخت میں دوسرے مذاہب کا کتنا حصہ ہے؟ یعنی یہودی، عیسائی، پارسی اور مانوی مذاہب نے کس حد تک "دنیا کے سب سے نوعمر مذہب" پر اثر ڈالا ہے۔ یہ بحث نہایت دلچسپ ہے اور آج کل کے محققین کا خیال ہے کہ یہ رسالہ مختص الموضوع اپنی جامعیت اور محققانہ تلاش کے لحاظ سے اس کی اور تالیف میں ایک ممتاز درجہ رکھتا ہے جس میں امور زیر بحث کا ایک طرفہ فیصلہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ جو کچھ ہے خالص عالمانہ نکتہ سنجی کا نتیجہ ہے، وان کریمر کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ صرف تاریخی راز کی پردہ دری کرنے والا ہے، کسی خاص فرقہ کا نقیب نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ حق کی تلاش کے سوا اس کی خامہ فرسائی کی کوئی غایت نہیں ہے، اس نے صرف مذہبی مباحث تک اپنی توجہ محدود نہیں رکھی، بلکہ نہایت بیدار مغزی سے مسلمانوں کی معاشرت پر بھی ساتھ ساتھ نظر ڈالی ہے۔ یعنی جہاں اس نے مختلف اسلامی فرقوں کی ابتدا [illegible] ان کی نشوونما کی جزئیات دکھائی ہیں، اگلے پچھلے مسلمانوں کی معاشرت کا خاکہ بھی کھینچا گیا ہے اس سے ان کے تدریجی تغیرات کا سراغ ملتا ہے جن سے ایک قدامت پسند صحرائی گروہ کی کایا پلٹ ہو گئی اور عرب کے سیدھے سادھے نظامات زندگی کی جگہ رفتہ رفتہ رومیوں اور اور عجمیوں کی شائستگی گھر گھر پھیل گئی۔

پچاس برس ہوئے مجموعہ تصنیفات عالم وجود میں آیا، لیکن باوصف اس غیر منقطع تحریک کے جو مشرقی تحقیقات کے متعلق یورپ میں جاری ہے، یہ کتاب ایک زبردست مستشرق کی بہترین یادگار ہے جو بلحاظ نوعیت اب بھی بے نظیر سمجھی جاتی ہے لائق مترجم کے مفصل دیباچہ اور ان کے تاریخی انتقادات پر آئندہ نظر ڈالی جائے گی، سردست

یہ چند سطریں غالباً تالیف زیر بحث کی تقریب کیلئے کافی ہیں۔ اصل اقتباسات شروع کرنے
سے پہلے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اس امر کا فیصلہ علامہ شبلی نعمانی فرمائیں گے کہ اسلام
کے موثرات میں مذاہب غیر اور خاص کر عیسائیت کو جس حد تک ان کو میں نے پیش کیا
ہے یہ جذبۂ تحقیق کہاں تک اعتدال سے بڑھا ہوا ہے اور فاضل مورخ کو اپنے فلسفیانہ
اجتہادات اور نتائج استقرائی میں کس حد تک کامیابی ہوئی ہے۔

تمدن اسلام

میرا ارادہ تھا کہ اپنی ایک جدید تصنیف کے آخر میں اسلام کی تاریخ و تمدن کے
چند منتخب اور ضروری مضامین ضمیمہ کی حیثیت سے بڑھا دوں۔ میں بالتخصیص ان مضامین
کو یکجا کرنا چاہتا تھا جس سے عرب کے مذہب، اخلاق پر بیرونی اثر کا اندازہ ممکن ہو۔
لیکن اس انتخاب کے سلسلہ میں میں نے معلوم نہیں کہاں کہاں سے زیرہ چینی کی،
جس سے بڑھتے بڑھتے ایک پاکیزہ مرقع تیار ہو گیا اور شیفتگی یہاں تک بڑھی کہ
اسے ایک مستقل وجود کی حیثیت سے پیش کرنے کا خیال راسخ ہو گیا۔ میرا مخاطب صحیح
گو دراصل میرا ہم مشرب اور ایک محدود حلقۂ مستشرقین ہے تاہم یہ پیرایۂ بیان معلومات
مشرقی کے صرف ایک خشک مجموعہ کے مقابلے میں ہر طرح لائق ترجیح ہوگا۔ موجودہ
تالیف میری گزشتہ تصنیفات سے نسبت قریبہ رکھتی ہے۔ کیونکہ یہ ان کے مضامین کی متمم
اور شارح ہے۔ مجھے اپنے سلسلۂ انکشافات میں اگر یہ معلوم ہوتا کہ میری قائم کردہ رائے
غیر صحیح ہے تو میں اپنی غلطی کے علانیہ اعتراف اور اس سے دست بردار ہونے سے
بالکل نہ شرماتا، لیکن یہ صورت پیش نہ آئی۔ بلکہ معتقدات ذہنی اور دل میں جمتے گئے

تاہم ابھی بہت کچھ ٹوہ لگانی ہے، اسلام کے ساتھ اسکے سیاسی نظامات کو اچھی طرح سمجھنے بوجھنے کے لئے (جو اسلام کی بنا پر قائم ہوئے اور جو ہزار بعل برس تک اسلامی ہیئت الاجتماعیہ یعنی سوسائٹی کا سنگ بنیاد رہے ہیں) ہم کو سائنس کی اور شاخوں کی طرح بھی منطقی حیثیت سے جانچنا اور جزئیات سے کلیات کا استقرا کرنا ہوگا۔

اسلام کی عمارت گزشتہ تمدنوں کے کھنڈر پر اٹھائی گئی ہے اس نے پرانے عناصر کو اپنے ساتھ مخلوط کر لیا، کچھ ان کی صورت بدلی، کچھ اپنی طرف سے جدید اضافے کیئے، ان اجزائے ترکیبی کی تحلیل و ترتیب اور ان کے باطنی تعلقات و روابط کی تنقیح اس آزاد اور غیر طرفدار علم کا کام ہے جو صرف سچائی کا حامی ہے لیکن مشرقی مذاہب اور تمدنوں کے مطالعہ کے سلسلے میں بعض اوقات ان مختلف الحس اجزا میں تمیز کرنا (جو پہلو بہ پہلو پائے جاتے ہیں اور جو باہم ایک دوسرے کو مسخ اور کبھی بالکل بدل دیتے ہیں اور ان کی اصلیت کا ٹھیک پتہ لگانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ گو بادی النظر میں ایسا معلوم نہیں ہوتا۔

مغربی ایشیا میں مذہبی ایجادات کی بھرمار رہی ہے اس میں چار عظیم الشان مذاہب نے جنم لیا اور اسی زمین سے بے شمار مذہبی فرقے، فلسفیانہ نظامات اور مذہبی قانون قاعدے پیدا ہوئے یہیں سے مذہبی خیالات کے زبردست تموج سے وہ چشمہ ہائے لعل نکلے جن سے دنیائے تاریخ "سیراب ہوگئی"، یعنی یہودی، پارسی، عیسائی اور اسلام جن میں سے ہر مذہب نے انسانی خیالات اور احساسات میں ایک قومی تحریک پیدا کردی، یہ ایک عجیب بات ہے جس سے ظاہر ایک خوش ترتیب نظم اور باقاعدگی کا وجود پایا جاتا ہے کہ یہ مذاہب یکے بعد دیگرے مقررہ فصل کے ساتھ وجود

پذیر ہوتے گئے، یعنی حضرت موسیٰ۔ حضرت عیسیٰ سے ۱۵ سو برس پہلے، زرتشت ۶ سو برس قبل المسیح، اور آنحضرت (صلعم) مسیح سے ۶ سو برس بعد دنیا میں آئے' ان درمیانی وقفوں میں جانے کتنے مذہبی گھروندے بنتے بگڑتے رہے بعضوں کے فنا کرنے والے اجرام (جراثیم) ساتھ پیدا ہوئے تھے، بعض ایسے تھے جو پھولے پھلے اور آئندہ نسلوں کے لیے ان سے قلمیں لی گئیں۔

مشرقی تمدن طبقاتِ مختلفہ کے دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے متعدد تہیں تلے اوپر جمائی ہوئی ہوں جس میں ایک طرح کی ہیئیت مجموعی پائی جاتی ہے' یہ اتصال آسانی سے اس لیے محسوس ہوتا ہے کہ تمام بڑے ایشیائی مذاہب اس حد تک ہیئیت متماثلہ اور خاندانی مشابہت رکھتے ہیں جس سے قریب قریب یہ خیال مستحکم سا ہو گیا ہے کہ بانیانِ مذاہب کا وجود صرف مغربی ایشیا کے معتدل خطہ کے لیے گویا مخصوص تھا۔ ہم قریب قریب اس کلیہ کے تسلیم کر لینے کی طرف مائل ہیں کہ شمالی فلسطین، عراق عرب اور فارس کی وادی مرتفع کے طبعی خواص جو لازماً متحد ہیں ان کی ایک جھلک ان ملکوں کے رہنے والوں کی دماغی استعداد اور خاص کر مذہبی حسیات میں بھی پائی جاتی ہے، یعنی جس طرح ان ممالک کے رنگ روپ مقامی اور یکساں ہیں دماغی مخلوقات میں بھی اسی امتیاز کا پتہ چلتا ہے' پارسیوں کی مقدس کتابوں میں بہتری باتیں ہیں جو انجیل کو یاد دلاتی ہیں، اسی طرح عیسائیوں اور مسلمانوں کے آسمانی صحیفوں میں بھی ایک طرح کی مماثلت قریبہ ہے۔

صحرائے عرب پر ایک نگاہ دوڑائیے تو جس چیز سے آپ دفعتہً پہلے پہل متاثر ہوں گے وہ مخلوقات کے رنگ کی حیرت انگیز ہم طرحی ہوگی' ارضِ صحرائی کے ساتھ نباتی

حیوانی بلکہ انسانی مخلوقات بھی غیر مستقل ریت کے مائل بہ زردی باریک ذرات کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے، جس سے آفتاب کی چمکتی ہوئی شعاع میں آنکھیں خیرہ ہوتی ہیں۔ غزال عربی جو صحرائی بگولوں کے ساتھ اڑتا پھرتا ہے، اس کی گہری زعفرانی جلد زمین کے رنگ سے کتنی ملتی جلتی ہے کہ ایک کو دوسرے تمیز کرنا مشکل ہوتا ہے، یہی حال "جہاز صحرا" یعنی اونٹ اور اس کے کلغی دار "برادر لطیف" شتر مرغ کا ہے، چند چھوٹے اور سوکھے ساکھے خاردار درخت جو کہیں کہیں نظر آجاتے ہیں وہ بھی خاک آلود ہوتے ہیں، اور خالص الاصل بدوی کی جگہ اور اس کے لباس کو دیکھئے، کس قدر اس پاس کے آثار و کیفیات سے ملتا جلتا ہے کہ غیر عادی نگاہ تھوڑے فاصلے سے بھی وہاں کی خاک اور ان چیزوں میں کوئی فرق محسوس نہیں کر سکتی، لیکن جس طرح یہاں کے باشندوں کے طبعی حالات اور خصائص میں باہم ایک چھپتی ہوئی مطابقت ہے، یہی مماثلت مادی اشیاء سے گزر کر ان چیزوں میں پائی جاتی ہے جو دماغی اور اخلاقی ہیں، یہ موزونیت متحد الاصل طبعی اسباب کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ہزارہا سال کے روابط و تبادلۂ خیالات کا نتیجہ ہے جو مغربی ایشیا کی سامی اور آریا قوموں میں ہوتا رہا، اس سے معلوم ہوا ہوگا کہ فرداً فرداً ہر مذہب کے نظامات کی جانچ اور ان اجزا کی تحلیل جن میں مختصات مذہب کے ساتھ کچھ خارجی عناصر بھی ہیں، کس قدر مشکل ہے، اس زمانہ تحقیق سے اس قسم کے موضوعات غیر مثبتہ سے کام نہیں چلنے کا کہ تمام مذاہب کسی ایک ہی درخت کے پھول پتے اور دنیا کے قدیم سے قدیم صحیفے یعنی وید سے ماخوذ ہیں، جس طرح ہم یہ نہیں مان سکتے کہ توحید ہمیشہ سے صرف سامیوں کے حصہ میں تھی، کیونکہ یہ مسلمات ایک طرف، سائنس کے مصرف کے نہیں ہیں،

قبل اس کے کہ تجزیۂ عناصر سے اس قسم کے کلیات کے استخراج ممکن ہو، ہم کو پہلے خاص خاص امور کے متعلق وسیع اور دقیق تحقیقات کرنی ہوگی، اور سائنٹیفک تحقیقات بتدریج ہم کو اس شاہراہ پر ڈال دے گی جہاں سے منزل مقصود چنداں دور نہیں۔ جس میں سب سے مقدم اصول استقرائی کا استعمال ہے، اسلام یعنی پیغمبر مکہ کا مذہب نسبتہً کم تر مشکلات پیدا کرتا ہے، یہ تمام مذاہب میں کم عمر ہے، اور اس کی اصلیت کے متعلق بہتیری دستاویزات مصدقہ لائق حصول ہیں جن سے ہم اس کے آغاز و نشو و نما کی تدریجی رفتار کا پتہ لگا سکتے ہیں، اسلام نے بہت کچھ مذاہب یہود و نصاریٰ اور زرتشت سے اخذ کیا ہے اور غالباً مذہب مانوی سے بھی مستغنی نہیں ہے، اس نے پارسیوں سے بالذات اور بواسطہ دونوں طرح فائدہ اٹھایا ہے، بہتیرے زرتشتی عقائد اسلام میں کتب یہود خاص کر "تلمود" کی طرف سے داخل ہوئے، عقیدہ حشر و نشر بہشت و دوزخ کے متعلق اکثر روایات اور شیاطین وغیرہ کے متعلق جس قدر تصریحات قرآن میں موجود ہیں تمام و کمال مذہب یہود کا عطیہ ہیں، اسی طرح عذاب قبر اور تصریحات متعلقہ منکر نکیر[1] یہودیوں سے لی گئی ہیں، پل صراط[2] کا خیال جو بال سے باریک ہے۔ اور قصر جہنم ہوتا ہوا بہشت کو گیا ہے قطعاً پارسیوں سے ماخوذ ہے جو "مدراش" کے ذریعے سے "قرآن" تک پہنچا ہے، لیکن اسلام نے براہ راست بھی زرتشت سے اخذ کرنے میں کچھ تامل نہیں کیا ہے۔ یہ ایک قطعی امر ہے کہ "دین" کا لفظ جو متواتر قرآن میں آیا ہے

---

[1] عذاب منکر نکیر کے متعلق ایک حرف بھی قرآن مجید میں مذکور نہیں ۱۲

[2] قرآن مجید میں پل صراط کا نام و نشان بھی نہیں۔

پارسی کتابوں سے لیا گیا ہے[۱] "ہوزورش" میں یہ لفظ بعینہ اسی ہیئت سے پایا جاتا ہے۔

شعائر مذہبی کی نسبت اس قدر صاف اور طے شدہ کہ طواف اور حج کعبہ کے تمام ارکان اسلام میں قریب قریب بغیر کسی تصرف کے وہی چلے آتے ہیں جو ایام جاہلیت سے پہلے تھے۔ یعنی کعبہ کی تمام رسومات وہی ہیں جو ۱۵ سو برس پیشتر تھیں۔

تھوڑا عرصہ ہوا کہ ایک مکی نے جو بیروت سے مصر تک جہاز میں میرا ہمسفر تھا مجھ سے کہا کہ "نحن اولاد الشمس وخدامین الحرام" اور یہ صحیح ہے کہ ایام جاہلیت کے خیال کے مطابق آج بھی اہل مکہ اپنے کو خادم حرم سمجھتے ہیں حج کعبہ کی ابتدا کا سراغ جیسا کہ خوب معلوم ہے قدامت بعیدہ میں ملے گا، جو لوگ طواف کعبہ کرتے تھے ان کو جاہلیت کی رسم کے مطابق برہنہ ہونا پڑتا تھا، عورتیں بھی بلا استثنا لباس عریانی میں ہوتی تھیں۔ غرض زائرین کو سات مرتبہ کعبہ کے گرد چکر لگانا ہوتا تھا، قریش تنہا لباس کے رکھتے اور اجنبی زائرین کو مستعار دینے کے مجاز تھے جس سے اچھی خاصی تجارت پیدا ہوگئی۔

آنحضرت (صلعم) نے جو کچھ تغیر کی حیثیت سے اضافہ کیا وہ زائرین کے لئے لباس مخصوص یعنی دو چادریں تھیں جن میں سے ایک زیر کمر لپیٹی جاتی تھی اور دوسری شانہ اور سینہ پر پڑی رہتی تھی، لیکن سر کھلا چھوڑ دیا جاتا تھا کیونکہ قدیم الایام میں بالوں کو ایک لس دار شئے کی مدد سے "دگ" کی قطع کا بنا رکھتے تھے، آج بھی حاجیوں کا لباس مجوزہ یہی ہے، زیارت کعبہ کے بعد جاہلیت میں یہ بھی رسم تھی کہ کوہ صفا و مروہ کو جایا کرتے تھے جہاں دو بت بھی رکھے ہوئے تھے، آنحضرت (صلعم) نے

---

[۱] توفیق المسنہ کی دوسری بات ہے ورنہ دین کا لفظ عربی زبان میں اسلام سے بہت پہلے موجود تھا اور دین کے موجودہ معنی اسکے سکنڈری معنی ہیں،

رسم جاہلیت کی یہاں تک رعایت کی کہ صفا و مروہ کا جانا بدستور قائم رکھا صرف یہ کیا[1]
کہ بت ہٹا دیئے، ارکان نماز، سجدے، وضو اور روزے کی تاریخ کا جہاں تک تعلق
ہے ہماری معلومات ایک حد تک غیر متعین، مذبذب اور بالائی ہیں، روزہ عاشورہ آنحضرت
(صلعم) سے پہلے بھی موجود تھا، لیکن رمضان کے روزے کرسچین لینٹ سے ماخوذ ہیں
وضو و سجود ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بالاشتراک یہود و نصاریٰ یا فرقہ مانویہ سے لیے
گئے ہیں جس طرح بانی مذہب عربی نے مختلف ماخذوں سے فائدہ اٹھا کر اسلام
آنحضرت (صلعم) کی وفات کے بعد میں اس زمانہ میں بھی جب تکمیل کی حیثیت سے
مذہب میں ایک طرح کا "انجماد" پیدا ہو گیا تھا، اصول آخذہ کو بدستور جاری رکھا،
مثلاً واقعہ معراج کو لیجئے جس کا کچھ یونہی[2] سا اشارہ قرآن میں پایا جاتا ہے، سنہ ہجری
کی پہلی صدی میں اس پر شاعرانہ رنگ چڑھ چکا تھا اور رفتہ رفتہ یہ اسلامی عقائد
کا ایک جزو غیر منفک ہو گیا، اس واقعہ کی بنیاد عیسائیوں کی ایک معتبر روایت
یعنی پیغمبر اشعیاہ کے سفر آسمانی پر رکھی گئی ہے، یہ اس وقت گھڑی گئی تھی جب
شہنشاہ نیرو کے ظلم و تعدی سے عیسائی بالعموم نالاں ہو رہے تھے، پارسیوں سے
غالباً بہ توسط یہود یہ روایت پہنچی کہ حشر کے روز موت ایک مینڈھے کی صورت میں
ذبح کی جائے گی، اور اس کے بعد انسان دائمی زندگی سے لطف اٹھائے گا، یہ
خیال باحتمال غالب پارسیوں کے اس قصے سے ماخوذ ہے جو "تلمود" میں "ہدایوحی بل"

---

[1] صفا و مروہ کی رسوم حضرت ابراہیم کے زمانہ سے ہیں بت انکے بعد قائم کئے گئے اسلئے آنحضرت (صلعم) نے صفا و مروہ کی رسوم قائم کرنے میں حضرت ابراہیمؑ کی تقلید کی ہے نہ جاہلیت کی

[2] یونہی تو نہیں صاف تصریح ہے لیکن وہ درحقیقت ایک خواب تھا جیسا کہ احادیث سے صاف صاف ثابت ہوتا ہے۔

کے متعلق موجود ہے۔[۱]

بیرونی اثرات کا احساس مذہبی دائرہ کے سوا معاشرت اور مسلمانوں کے سیاسی نظامات میں بھی ہوتا ہے جن پر بالتخصیص مستقل اور گہرا نقش پڑا ہے، گو عربی دماغ اپنے دعویٰ خودسری اور قوتِ خلاقیہ کے اظہار سے قاصر نہیں رہا۔ مثلاً عمر کا سیاسی نظام جو مساوات واخوت عامہ پر مبنی ہے۔ تاریخ کا ایک عظیم الشان اور عجیب و غریب مظہر ہے اور عہد سلف اس کی کوئی نظیر پیش نہیں کرسکتا ہے، تمام مسلمان کامل مساوی حقوق رکھتے تھے اور کل مداخلِ سلطنت معہ اراضیاتِ مفتوحہ اسلامی جماعت کی ملک عام تھیں یہاں تک کہ "اخوت اسلامیہ" کے ہر فرد کو خزانہ عامرہ سے سالانہ ایک وظیفہ مقررہ ملتا تھا، عربوں کو حصولِ جائیداد ارضی اور زراعت کی اجازت نہیں تھی وہ صرف ایک فوجی جماعت تھی اور یہ مفتوحہ اقوام کا فرض تھا کہ وہ کھیتوں کو جوتیں بوئیں اور سامان رسد پہنچاتے رہیں۔

لیکن باوصف اسکے کہ حضرت عمر میں سیاسی حیثیت سے ایک طرح کی اجتہادی قوت اور آزادی تھی، انھوں نے اپنے دور حکومت میں ہر محکمہ کیلئے بہتیرے عجمی اور رومی آئین سلطنت کو پسند کرکے رواج دیا۔ مثلاً نقود یعنی سکوں کا رواج، صوبجات کی عادلانہ تقسیم ٹیکس کے سلسلے میں جزیہ اور خراج کی تعیین، یہ سب گویا ان کے تقلیدی اجتہادات تھے، ٹیکس جائیداد جو غربا کے نام سے بھی مشہور ہے کیونکہ شروع شروع اس صیغہ کے محاصل غریب مسلمانوں میں صدقات، زکوٰۃ، عشر کے نام سے[۲] تقسیم ہوتے تھے، ایک ایسا نظام ہے جو قدیم سے قدیم زمانہ میں کنعانیوں اور اہل فنیشیہ اور کارتھیج والوں کے ہاں پیشوایان مذہبی کی امداد کے لیے "محصول دیر" کے نام سے

---

[۱] ہم احادیث کے ذمہ نہیں ہیں۔ لیکن قرآن مجید میں اس قصہ کا کہیں ذکر نہیں ہے

سے وصول کیا جاتا تھا، اس کے علاوہ الفاظ "صدقہ" اور "زکوٰۃ" یہودیوں کے روزمرہ
سے لیے گئے ہیں، یہاں تک کہ دفتر خارجہ کیلئے جو لفظ تھا اور جس کا اطلاق بعد میں حکومت
کے تمام دفتروں پر ہونے لگا یعنی "دیوان" یہ بھی آرامی یعنی فلسطین کے شمال مشرقی خطہ
کی زبان کا لفظ ہے کیونکہ خلیفہ ثانی نے مفتوحہ ممالک میں محکمہ کو جس طرح پایا تھا بغیر
کسی قسم کے تغیر کے بحال خود رہنے دیا اور اسے اپنی ضروریات کے لئے نافع بنا لیا۔

فوجی امور میں عربوں نے بہت کچھ عجمیوں سے لیا۔ لیکن اسقدر یقینی ہے کہ حضرت عمرؓ کے
بعد ابتداءً ان کا طریق جنگ بالکل بدوی فرقوں سے ملتا جلتا تھا، لیکن بہت جلد وہ ایک
ترقی یافتہ فوجی تنظیم کے فوائد سے آگاہ ہو گئے۔ خلفائے امیہ نے اس صیغہ پر خاص توجہ دی۔ رومیوں
کے تمام ضروری آئین اختیار کر لیئے جن سے شہنشاہان مشرق کی لڑائی میں انھوں نے واقفیت
حاصل کی تھی، فوجی مستقل چھاؤنیوں کا دستور اوائل ہی میں جاری ہو گیا تھا، رومیوں کی
طرح عرب کے جنرل بھی روزانہ کوچ کے بعد جہاں اپنے خیمے نصب کرتے تھے، خندق اور
حصاروں سے ان کی مورچہ بندی کر لیتے تھے، پہلے عربوں کا قاعدہ تھا کہ نماز کی سی سیدھی صفوں
میں ہو کر لڑتے تھے، پھر تعبیہ کی حیثیت سے انھوں نے صف آرائی شروع کی، یعنی ایک فوج مربع
کی شکل اختیار کرتی جسے یونانی زبان میں کرادیس کہتے ہیں، فوج کی صف آرائی بیشتر قبیلہ وار ہوتی
تھی۔ پھر بلا امتیاز قبائل فوج حیثیت سے اس کے علیحدہ علیحدہ دستے کر دیئے گئے۔ ہر دس
آدمی پر ایک افسر ہوتا تھا جسے عریف کہتے تھے، پچاس پر ایک خلیفہ اور سو سپاہیوں پر ایک
قائد ہوتا تھا۔ سب سے قدیم طریقہ صف آرائی یہ تھا کہ فوج کی ترتیب میمنہ، میسرہ اور
قلب الجیس کے لحاظ سے ہوتی تھی۔ بعد میں مقدمہ اور ساقہ کا اضافہ ہوا، رومیوں
کے اثر کا اس سے بھی زیادہ تر اندازہ ان آلات حرب سے ہوتا ہے جن کو عرب محاصرہ
کے وقت استعمال کرتے تھے، یعنی منجنیق یا عرادہ، یہ ایک آلہ حاذف تھا جو قلعہ شکنی

کے کام میں لایا جاتا تھا، کیش سے حصار کو منہدم کرتے تھے اور دبابہ کی پناہ میں محاصرین
شہر پناہ تک پہنچ جاتے تھے۔ چونکہ میرا قصد ہے کہ دوسرے موقع پر تفصیل کے ساتھ خلافت
کے فوجی نظام پر بحث کروں، اسلئے میں اس کتاب میں جزئیات متعلق کی تصریح زائد سے
دست کش ہوتا ہوں، میں نے اس بحث کو اس لئے بیچ چھیڑا ہے کہ ان واقعات کی طرف اوروں
توجہ مائل کر سکوں اور یہ دکھا سکوں کہ محققانہ تفتیش و تلاش کیلئے کس قدر وسیع
اور نتیجہ خیز جولانگاہ موجود ہے ہم کو آئندہ پورے طور پر ٹھنڈے دل سے ان واقعات
پر نظر ڈالنی ہوگی جن سے اسلامی تمدن کی تاریخ کی عقدہ کشائی ہوتی ہے، اور صرف اسی
طریقے سے ہم ان دلچسپ اور اہم مسائل کی نسبت تیقن کی حالت پیدا کر سکیں گے آج
ایک محقق جیالوجی جس طرح مختلف طبقات ارضی کی ترتیب سے اشیاء مدفون کے زمانہ
کی تعین کر سکتا ہے یا جس طرح ایک ماہر السنہ قطعیت کے ساتھ یہ بتا سکتا ہے کہ کسی
زبان کے اجزاء میں قدیمی حصہ کے ساتھ باہری میل کتنا ہے ہم کو بھی کوشش کر کے اپنے
تاریخی فن کو اسی سطح ارتفاعی پر لانا چاہیے۔

اسلام کی مذہبی اور تمدنی تاریخ اگر ہم اس کے وطنی اور بیرونی عناصر کا تجزیہ
کر سکے تو وہ جس قسم کی امید افزاء اور صحیح منظر ہمارے سامنے پیش کرے گی وہ اس سے
بالکل مختلف ہوگا، جو آج کل ہمارے خیال میں رہا ہے، اسلئے میں نے تاریخ اسلامی
کی ان ہی خصوصیات کو ابھار کر دکھایا ہے جن میں بیرونی اثرات زیادہ تر محسوس
ہوتے ہیں اور جن میں قدیم تر تمدنوں کے باقیات الصالحات نے گرد و غبار میں ملنے کے
بعد بھی مٹے مٹے نقش یا چھوڑے ہیں اس طرح سطح کاغذ پر گویا ایک قسم کی پچی کاری ہو
گئی ہے گو سچ یہ ہے کہ جو مرقع میں نے اس رسالے کی مختصر وسعت میں کھینچنا چاہا ہے تیسری

حیثیتوں سے وہ بمشکل کامل کہا جاسکتا ہے۔ میں نے صرف دورِ خلافت تک اپنی تحقیقات محدود رکھی ہے اور ارتقا مذہبی کے ساتھ ان معاشرتی تغیرات کے دکھانے کی بھی کوشش کی ہے جو بیرونی اثرات سے وقوع میں آئے۔

نزولِ قرآن کی تاریخ کے متعلق ڈاکٹر اسپرنگر نے مفصل بحث کی ہے، اسلیئے میں اس موضوع پر اپنے خیالات پیش کرنا نہیں چاہتا، لیکن مختصراً میں نے جو کچھ کہا ہے وہ اس امر کے اظہار کے لئے کافی ہے کہ جس حد تک چاہیئے یہ بحث پورے طور پر طے نہیں کی گئی۔ کتب یہود اور زرتشت کا مطالعہ اگر بالموازنہ نہ، نہ کیا جائے اور عیسائیوں کے ابتدائی لٹریچر کیساتھ فرقہ ہائے عیسوی اور یہود کی تاریخوں پر ایک گہری نظر ڈالی جائے تو میرا خیال ہے بڑے بڑے نتائج حاصل ہو سکتے ہیں، میرا موضوع بحث آئندہ زمانہ میں ایک مدت تک کا عروج و زوال ہوگا اور میں یہ امید کرنا چاہتا ہوں کہ اس قسم کے رسالہ مختص، الموضوع کے ذریعہ سے جو ایک محدود حلقہ، علماء کے مذاق کی چیز ہوگا، مشرقی زندگی کے دائرہ میں نے سر سے ایک طرح کی دلچسپی پیدا ہو جائے گی اور اس زمانے کی صحیح واقفیت کے شوق کو ترقی ہوگی۔

یہ کہنا غالباً تحصیل حاصل ہے کہ اسلام کی پوری سیاسی تاریخ لازماً اس وقت تک عسیر الفہم اور لیس پردہ رہے گی۔ جب تک تمدنی تاریخ اس سے علحدہ رکھی جائے گی۔"

رسالہ مخزن دسمبر ۱۹۰۶ء

افادات وان کریمر

متعلق

تمدن اسلام

(۲)

اشاعت اسلام کی ابتدائی رو نے عربی قبائل کے بہتیرے جتھوں کو صحرائے عرب سے نکالا جس کے حدود عرب کے شمالی اور مشرقی حصہ سے لے کر شام اور سواحل فرات تک پھیلے ہوئے تھے، مال غنیمت اور فتوحات کے شوق نے ان وحشی

لہ مجھ کو افسوس ہے کہ اقتباس کا یہ حصہ علامہ شبلی کی نظر سے نہ گذر سکا۔ ابھی معلوم ہوا ہے کہ اتفاقیہ بندوق کے چل جانے سے ممدوح کا پائے مبارک زخمی ہوا جسکے کاٹنے کی نوبت آئی۔ آج دنیا میں جو کچھ دم ہے سو آپ کی ذات سے ہے۔ نہایت افسردگی کے حالات میں اسے بھیج رہا ہوں پچھلے نمبر میں جو نوٹ دیئے گئے تھے ممدوح کی ایما سے لکھے گئے تھے۔

عربی اصطلاحات کے لئے میں مولانا عنایت کرامت حسین بیرسٹرایٹ لا کا ممنون ہوں جنھوں نے نہایت مہربانی سے مجھے قیمتی امداد دی ورنہ لٹریچر اس قدر سخت تھا کہ ترجمہ ظاہراً اردو کی استطاعت سے باہر معلوم ہوتا تھا۔

(ایم - ایچ)

قبائل کو اپنے افعال میں متحد الغایت بنا دیا اور زیادہ دن گذرنے نہیں پائے تھے کہ شام اور بابل کی سلطنتیں خلیفہ وقت کے قبضہ اقتدار میں آگئیں، ان دونوں ممالک میں اس وقت ایسی قومیں آباد تھیں جن کے پاس قدیم ترین زمانہ سے ایک حد تک اعلیٰ سے اعلیٰ تمدن موجود تھا۔ اس لیے عربوں کو ان دماغی عناصر سے سابقہ پڑا جو ان کے لئے بالکل ہی نئے تھے اور جن کی پوری قوت کا اندازہ بھی بحیثیت موجودہ مشکل سے کر سکتے تھے۔ ملک شام میں اسلام کو ایک ایسا مذہبی نظام ملا جس میں نمو سے اختراعی موجود تھا اور جس کی بنیاد منطقی اصول پر ایک عرصۂ دراز سے منصولانہ مباحث و اختلافات کے بعد پڑی تھی، بابل میں بہت سے مذاہب پہلو بہ پہلو ایسے موجود تھے جنکی باہمی رواداری قدیم جاہلیت کے نظامات مذہبی کے لئے مایۂ ناز تھی۔ اسلام نے ان قدیم معتقدات سے ایک سخت ٹکر کھائی جس سے وافر ترکیبات اور نتائج متنوعہ حاصل ہوئے اور اس دماغی کشمکش اور خیالات کی کایا پلٹ نے جو طبعاً پیدا ہوتی گئی، مشرق کی مذہبی تاریخ مابعد پر نہایت ہی گہرا۔۔۔ اثر ڈالا۔

ہم راویان عرب کی غیر منقطع کوششوں کے ممنون ہیں کہ ان کی بدولت آج ہم کو اس زمانہ کی فوجی و سیاسی تاریخ کا علم حاصل ہے جو اتنا ہی صحیح ہے جس کی توقع بارہ صدیوں کے طولانی زمانہ کے بعد کی جا سکتی ہے لیکن اس نادر الوجود عہد کی اندرونی تاریخ اور یہ کہ ایک جدید اور غیر شائستہ مذہب نے کیونکر ان قدیم اور اعلیٰ درجہ کی ترقی یافتہ نظامات مذہب کا مقابلہ کیا، ایک راز ہے جس کے متعلق معمولی جزئیات بھی معلوم نہیں ہیں۔

اس لئے یہاں میں ان واقعات سے بحث کرنے کی کوشش کروں گا، جو آزادانہ

تحقیقات پر مبنی ہونے کے سوا پہلے پہل صفحۂ تاریخ پر لائے جائیں گے، ان واقعات سے اسلام اور عربی تمدن پر بیرونی اثرات کا اندازہ ہوگا، اور ایک کامل مرقع آپ کے پیش نظر ہو جائے گا۔

مذہب عیسوی پہلا نظام تھا جس سے اسلام کی مڈھ بھیڑ ہوئی دمشق کسی زمانہ میں خلفائے بنی امیہ کا مسکن تھا، اور واقعی وہاں مذہبی درسگاہیں اس پایہ کی موجود تھیں جن سے مشرقی چرچ کے بڑے بڑے فاضل پیدا ہوئے، دارالخلافت میں دماغی شاغل زوروں پر تھے، مسلمان اور عیسائی فاضلین میں طرح طرح کے روابط و تعلقات رہتے ہونگے۔ یہ یقین ہے کہ ان میں مذہبی مباحثے ہوتے رہتے تھے۔ گو ان کی تقریریں محفوظ نہیں رکھی گئیں، یہاں تک کہ جان دمشقی اور تھیوڈور، ابوقرہ کی تحریرات بھی ان سے خالی نہیں۔ ان ہی مباحث سے احتمال غالب یہ ہے کہ اسلام کے وہ ابتدائی مذہبی فرقے پیدا ہوئے جو آگے چل کر مرجیہ اور قادریہ کہلائے۔

خلفائے بنی امیہ جو صرف عیش کے بندے تھے ان میں سے اکثر عیسائیوں اور غیر مسلموں کے ساتھ، غیر متعصبانہ پیش آتے تھے، عیسائی محض دربار شاہی تک آزادانہ گھس پیٹھ نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کو سلطنت کے نہایت معتمد اور ضروری عہدے بھی ملتے رہتے تھے۔ سرجیس جان دمشقی کا باپ خلیفہ عبدالملک کے دربار میں مشیر اول کا درجہ رکھتا تھا اس کے بعد ان کے بیٹے نے یہ جگہ پائی، ایک عیسائی خلفائے امیہ کا درباری شاعر بھی تھا۔ زمانہ عیسائیوں کے اس قدر موافق تھا کہ بغیر کسی اندیشے کے مسجدوں میں بھی بار پاتے تھے اور عام طور پر طلائی صلیب زیب تن کئے پھرتے تھے اس بے تعصبی نے جو خلفاء کی طرف سے برتی جاتی تھی لازماً مسلمانوں کے ساتھ عیسائیوں

کی راہ ورسم بڑھائی ہوگی یونانی ادیبوں کی صحبت میں جو فن مناظرہ میں لطیف دستگاہ رکھتے تھے، عربوں نے فلسفیانہ مباحثے سیکھے، جس کی بعد میں انہوں نے اتنی قدر کی ان ہی سے پھر مسلمانوں نے پہلا سبق لطائف منقولی" میں حاصل کیا، یہ ایک ایسا فن تھا جس میں علمائے مشرق ڈوبے ہوئے تھے، اسی طریقہ پر اس غیر معمولی مماثلت کی توجیہ ہوسکتی ہے جو ہم مشرقی عیسائیت اور اسلامی منقولات کی خاص خاص صورتوں میں محسوس ہوتی ہے۔

اولاً خدا کی ذات و صفات کے متعلق تحقیقات کی گئی، جس نے یونانی اور نہایت قدیم عربی علما کی تصنیفات میں سب سے پہلے جگہ پائی ہے قدیم ترین علمائے اسلام اور کلیسائے یونان کے ربی جبر و قدر کے مسئلہ میں بہت منہمک معلوم ہوتے ہیں" مغربی چرچ کے خلاف کلیسائے یونان کے علماء" خلود فی النار" کے مسئلہ سے متفق نہیں تھے اور یہی خیال اسلام کے اس قدیم فرقہ کا تھا جس کو مرجیہ کہتے ہیں۔

اس کا بہت افسوس ہے کہ اس فرقے کے متعلق ہم بہت ہی کم صحیح معلومات رکھتے ہیں کیونکہ اسی نے بھی اس زمانہ کی تقدیر میں حصہ لیا عہد بنی امیہ کی تاریخیں بالکل ہی فنا ہوچکی ہیں اور سب سے پرانی تاریخ جو ہم تک پہنچی ہے عہد عباسیہ کی ہے مرجیہ کے متعلق جو کچھ اطلاع ہم کو ملی ہے وہ ان منتشر روایات کی بنا پر ہے جو متاخرین کی تصنیفات میں ملتی ہیں قدیم سے قدیم تحریر جس میں اس کا بیان ہے ایک نظم ہے جس پر آج تک توجہ نہیں کی گئی یہ خلیفہ عبدالملک کے زمانہ میں لکھی گئی تھی اس نظم کا مضمون جو بہت پرانا ہے اور جو آج تک غیر معلوم حالت میں تھا، مرجیہ کے خیالات کے

متعلق جو کچھ حتیٰ آخرین سے معلوم ہوا ہے اس سے پوری مطابقت رکھتا ہے، مرجیہ بمقابلہ قدیم فرقہ شدید العقائد اور متعصب خارجیوں کے، زندگی موجودہ اور آئندہ کے امید وثوق کی نظر ڈالتے تھے خاص کران کو خلود فی النار سے قطعاً انکار تھا اس مسئلہ میں وہ یونانی ربیوں سے بالکل ہی مختلف ہوگئے تھے کیونکہ جیسا کہ معلوم ہے کلیسائے مشرق میں، اوائل ہی سے نہایت سختی کے ساتھ مغربی علما کی رائے کے خلاف یہ قائم ہوگیا تھا کہ "خلود فی النار" کا عقیدہ صحیح ہے۔

اریجن مضبوطی سے سزائے خاتم کا قائل تھا۔ اور اس مسئلہ میں تمام اہل اسکندریہ اس سے متفق ہیں، یہاں تک کہ اساتذہ کلیسائے انیٹی اوک (انطاکیہ) ڈایدروس آف تارسس (طرسوس) اور تھیوڈور آف مالپسواسٹیا گو اور امور میں اریجن کے ہم خیال نہیں ہیں لیکن اس مسئلہ میں اعتقاداً اس کے شریک ہیں وہ "خلود فی النار" کے مسئلہ پر بھی بحث کرتے تھے ایک دوسرا امر جو کلیسائے یونانی اور اسلام میں متفق علیہ ہے یہ ہے کہ یونانی چرچ کی طرح اسلام بھی کفارہ سے کوئی واقفیت نہیں رکھتا

مرجیہ کی نرمی عقائد میں (بمقابلہ اس ہیبت وخوف جو قرن اول کے واسخ الاعتقاد مسلمانوں پر چھایا ہوا تھا) ایک طرح کا سکون اعتدال دلی پائی جاتی تھی جو جان دمشقی کی تعلیمات سے بالکل ہی ملتی جلتی ہے جو اس فرقہ کی ابتدائی نشوونما کے وقت مذہبی غور وخوض میں مصروف رہتا تھا اور جس نے بنی امیہ کے دارالخلافت میں اچھی خاصی شہرت حاصل کی تھی، وہ کہتا ہے کہ اس امر میں جاننا ضروری ہے کہ خدا اپنے اصلی اور پیش بین ارادہ کے مطابق ہم سب سے چاہتا ہے کہ اس کی بادشاہت میں حصہ لیں اس نے ہم کو سزا کے لئے نہیں پیدا کیا وہ مہربان ہے اسلئے

ہم کو اس کی فیاضی سے مستفیض ہونا چاہئے، گنہگاروں کو وہ سزا دیتا ہے کیونکہ وہ منصف ہے۔

مرجیہ کے بہت سے خیالات آگے چل کر اسلام میں داخل ہوئے، مذہب حنفی جس نے بہت زیادہ رواج پایا، جس کا بیرو ترکی مسلمانوں کا حصہ غالب ہے مرجیہ کی بنیاد پر قائم ہوا ہے اس کے بانی نے مرجیہ کے نہایت ضروری مسائل کو تسلیم کیا اور جہاں تک قدیم تاریخی اسناد کا تعلق ہے خود مرجیہ کہلایا، ماسوا اس کے عربی لٹریچر میں سب سے قدیم مورخ مذہب یعنی ابن حزم مرجیہ کی نسبت کہتا ہے کہ یہ ایک ایسا فرقہ تھا جو پابندی شرع سے ذرا ادھر ادھر نہیں ہوتا تھا مذاہب اربعہ میں حنفی ہمیشہ نہایت متحمل اور غیر متعصب رہے ہیں، خدا کی تنزیہ و تقدیس کا تخم ایک ہزار سال ہوئے کہ بویا گیا تھا اور تقدیر انسانی صدیوں کی سختیاں اور صعوبات جھیل کر ہمارے عہد تک پہنچی ہے۔

بہر حال یہ ایک ایسا مظہر ہے جس پر خالص توجہ کی ضرورت ہے یعنی دو عظیم فرقہ ہائے اسلام حنفی اور شافعی میں پہلا جہاں نہایت متحملانہ ہے دوسرے میں تعصب اور تشدد فی المذہب پایا جاتا ہے پہلے نے عالمگیر وسعت پائی دوسرے میں برابر انحطاط آتا گیا، جب میں ان واقعات متذکرہ پر نظر ڈالتا ہوں تو اپنی اس رائے کے اظہار سے باز نہیں رہ سکتا کہ مرجیہ اپنی اصلیت اور ہیئت کذائی کے لئے کلیسائے یونانی کے مذہبی فلسفہ کے ممنون ہیں اس کے متعلق کامل تصریحات پیش نہیں کی جاسکتی ہیں کیونکہ باستثناء دو ایک قطعات کے مرجیہ کی تحریرات قریباً بالکل فنا ہو چکی ہیں اور ان کے ساتھ وہ مواد بھی جاتا رہا جس سے ان کی تعلیمات کا پورا پورا موازنہ بیان یونانی کے ساتھ ہو سکتا۔

اور لیجیے اسلام کا ایک دوسرا ابتدائی فرقہ عیسائیت کے ساتھ اور بھی مشابہت اور اتحاد قریبہ رکھتا ہے، میری غرض قادریہ سے ہے جو خیر سے اسلام میں آزاد خیال ہیں اور جنہوں نے آگے چل کر معتزلہ کے نام سے ایک ممتاز درجہ حاصل کیا اس خیال کے بہتیرے سبب ہیں کہ قادریہ کے مذہبی عقائد عیسائیت سے ماخوذ ہیں اور اس سے کچھ کم متاثر نہیں ہیں، یہ امر لائق لحاظ ہے ان کے تصورات بالتخصیص خدا کی ذات وصفات کی طرف مائل رہتے تھے۔

یہی رجحان بیان یونانی میں بھی پایا جاتا ہے ان کے ہاں بھی خدا کی ذات وصفات کا مسئلہ پیش پیش تھا، مسئلہ اختیار کو عربوں کے ملک شام فتح کرنے کے تھوڑے ہی دن بعد علمائے عیسوی نے پیش کیا تھا۔ جو دمشق کے رہنے والے تھے اور عربوں سے ملتے جلتے رہتے تھے میری مراد جان دمشقی اور تھیوڈورابوقرہ سے ہے۔ اول الذکر نہایت استحکام کے ساتھ اس رائے پر قائم تھا کہ خدا صرف اچھائی چاہتا ہے اور اچھائی کا مخرج ہے .... وہ کہتا ہے کہ جس طرح روشنی آفتاب سے نکلتی ہے، اچھائی خدا سے ظہور میں آتی ہے ہم دیکھتے ہیں کہ جان دمشقی کی تحریرات میں معتزلہ کا ایک مسئلہ بہت پہلے بیان کر دیا گیا ہے یعنی خدا کی طرف سے جزا وسزا اعمالِ انسانی کے لحاظ سے ہوتی ہے اس نے انسان کو اس لئے نہیں پیدا کیا کہ وہ ان کو تلف کر دے یا تلون مزاجی کے ساتھ انکو بیرحمی کا شکار بنائے یہ مسئلہ معتزلہ کے ہاں خدا کے ادراک کا اصل الاصول ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرجیہ نے بھی اسے تسلیم کر لیا ہے اسی طرح بہتیرے مباحث ہیں جن پر مسلمان علماء نے تفصیل کے ساتھ طبع آزمائی کی ہے، لیکن جن کا ہیولیٰ ربیان یونانی کی

تحریر میں پایا جاتا ہے میں صرف ایک لفظ یعنی "تعطیل" کا ذکر کروں گا جو علمائے عرب نے کنوسش ( ) کے لئے وضع کیا جو عیسائیوں کے مذہبی لٹریچر میں خدا کے ادراک کو تمام صفاتِ انسانی سے منزہ کرنے کے معنی میں آیا ہے قدیم ترین نسخہ عربی یعنی فقہ الاکبر میں جو ایک مختصر سی کتاب ہے، ظاہرا بہیتری باتیں ایسی ملتی ہیں جو رہبانِ یونانی کو یاد دلاتی ہیں،

فرقہ معتزلہ کا بھی عیسائیت سے متاثر ہونا پایا جاتا ہے اور ہم اس خیال کے لئے کافی وجوہ رکھتے ہیں جو نیا ہو تو ہو، تاہم بے بنیاد نہیں ہے کہ ابتدائی اسلام کے مذہبی فرقوں کا نمونہ اور کلیاتِ منقولی جو ارتقاء ان سے ظہور میں آئے وہ خاص کر عیسوی خیالات کے زیر اثر واقع ہوئے تھے اس طرح مسائل مرجیہ اور قادریہ کا تعلق براہ راست کلیسائے یونانی کے اجتہادات سے پایا جاتا ہے جو علمائے دمشق کی تحریرات میں ملتے ہیں، معتزلہ مسائل جن کا سلسلہ غالباً دمشق یعنی خلفائے بنی امیہ کے مسکن تک پہنچتا ہے، بہت بڑی ترقی: بالا متیاز بصرہ کوفہ اور بغداد میں حاصل کی اور یہ ان سیاسی تشنجات کی پناہ میں حاصل ہوئی جنہوں نے اسلامی سلطنت کے مرکز ثقل کو دفعۃً دمشق سے بابل کی طرف منتقل کر دیا اس فرقہ کی تقدیر مابعد جو عربوں کی تمام دماغی حرکت پر عمیق اثر رکھتی تھی ہمارے موجودہ دائرہ تحقیقات سے باہر ہے۔

بجائے اس کے ہم ان اقطاع ارضی کی طرف متوجہ ہوں گے جو سواحل فرات پر واقع ہیں، جہاں اسلام نے بیرونی عناصر سے جن سے سابقہ پڑا بالکل ہی جداگانہ نوعیت کے اثرات حاصل کئے وہ خوبصورت خطہائے ارضی جن پر فطرت کی خاص

عنایت تھی اور جو لب دجلہ و فرات واقع تھے، ان میں عربی فتوحات کے وقت پہلو بہ پہلو ایسی قومیں آباد تھیں جو مذاہب مختلف کی پیرو تھیں حکمران عجمی مذہب زرتشت رکھتے تھے عیسائیت نے خاصی ترقی کی تھی اور بعض شہروں میں اسے غلبہ حاصل تھا، تمام بدوی قبائل جنہوں نے عراقِ عرب کو اپنی چراگاہ بنا رکھا تھا، ایک دم سے آغوش کلیسا میں پہنچ گئے تھے۔ اسی کے ساتھ مذہب مانوی کے پیرو بھی موجود تھے جو عقائد زرتشت کے ساتھ عیسوی اور ہندی خیالات کے اختلاط سے پیدا ہوا تھا، آخر آخر میں بھی مذاہب جاہلیت کے ماننے والے کچھ کم نہیں تھے جن میں سب سے آخری جماعت صابئین حرآن کی تھی جو عہد اوسط تک زندہ بچ گئی۔

جاہلیت کی بہت سی رسمیں یعنی "سنت الاولین" عرصہ تک جاری رہیں، مثلاً دعوت عنقود (ایڈونس) بعض خاندانوں کی معبدانہ پرستش جس کی ایک نظیر ہم کو ساتویں صدی ہجری میں بھی ملتی ہے۔

فاتح مسلمان جو مفتوحہ اقوام سے خدا کا سا برتاو کرتے تھے اور ان پر نہایت سخت قسم کے محاصل کا بار ڈالتے تھے ان کی فوجی نخوت اور نیز خلیفہ ثانی کے اصول کی سختی اور ایک رنگی نے جنہوں نے قطعاً عربوں کو زمینداری اور کاشتکاری سے روک دیا تھا، تاکہ وہ غیر مشترک طور پر صرف فوج کے ہو کر رہیں گے یہ نتائج پیدا کئے کہ ہر طرف لوگ مسلمان ہونے لگے ارض مفتوحہ کے بہت سے پرانے باشندے غلام کی حیثیت سے بیچے گئے اور اس وقت آزاد کئے گئے جب وہ مسلمان ہوئے اور اپنے آقاؤں کے ساتھ انہوں نے بحیثیت موالی تعلقات پیدا کئے جب ہم خیال کرتے ہیں کہ عربی اصولِ قانون کے مطابق ایک موالی کی اولاد

آقا کی اولاد کے مقابلہ میں وہی درجہ رکھتی ہے جو اصلی مولا کو اصلی آقا کے لحاظ سے حاصل ہے تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ کیونکہ مخلوط النسل اشخاص کی تعداد اس قدر تیزی سے بڑھتی گئی جو ممالک مفتوحہ سے لیئے گئے تھے اور جو قبائل عرب سے موالی کا تعلق رکھتے تھے، یوں تو مسلموں کا روز افزوں دائرہ بڑھتا گیا، ان کا کچھ حصہ تو باطناً اپنے قدیم معتقدات مذہبی کو صحیح سمجھتا تھا لیکن بہت سے واقعی ایسے تھے جن میں اسلام کی تعلیمات نے ملہمانہ سرگرمی پیدا کردی تھی جنکی حیرت انگیز کامیابی نے ان کی صداقت اور خلوص کا اعلان کردیا یہ ایک مذہب کی بندش عامہ تھی جس نے مختلف اور متفرق عناصر کو یکجا کر دیا لیکن یہ رشتۂ اتفاق چونکہ ضعیف وکمزور تھا پہلے ہی صدمہ کی تاب نہ لا سکا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ گیا،

یہ صورت اس وقت پیش آئی جب علیؓ اور معاویہؓ نے ملکی جنگ چھیڑی ہوئی تھی ایک شائق جمہوریت پارٹی قائم ہو گئی تھی جس میں خاص کر اصلی عربی عناصر شریک تھے جو دونوں مدعیانِ تخت کے خلاف تھے علیؓ کے گرد ایک شدید العقائد گروہ کثیر جمع ہو گیا، جو ان کو پیغمبرؐ کا وارثِ جائز سمجھتا تھا، اور جو قدیم عجمی خیال کے مطابق سلطنت ربانی کو ان کی طرف منسوب کرنا چاہتا تھا یہاں تک کہ اس نے علیؓ اور ان کی اولاد کو پیغمبر کی طرح پرستش کی، اس سے شیعیان علیؓ کا ایک بہت بڑا فرقہ مذہبی عالم وجود میں آیا جو مشرق کی تاریخ مابعد میں اس قدر ضروری نکلا جس کی انتہائی پروازی یہ تھی کہ وہ علیؓ کو خدا سمجھتے تھے، جو ذرا معتدل خیال کے تھے وہ علیؓ کے جانشینوں کو دنیادی اور روحانی امور میں جائز پیشوایان اسلام خیال کرتے تھے۔

شیعوں کے وجود کے سبب اولیٰ کو صرف قدیم مشرقی، یا شاید عجمی خیالات کی طرف منسوب کرنا ایک ناانصافی ہوگی، کیونکہ ہم متقدمین پیروان علی رضی عربی نسل کے ممتاز آدمیوں کو دیکھتے ہیں، یہ شیعی اس لیئے ہوئے کہ اس بڑی کشمکش میں جو تخت کے لیے علی رض اور معاویہ میں پیش آئی تھی انہوں نے علی رض کا ساتھ دیا، جن کی رفاقت میں بہت سے عجمی اور خارجی اشخاص تھے جن کے مذہبی خیالات نے شیعوں میں بتدریج قبولیت حاصل کی تھی۔

قدیم عربی شیعوں میں ہم کو ایک ایسا عقیدہ ملتا ہے جو غیر عربی عنصر یعنے سنت الاولین کا صاف اور غیر مشتبہ نقش معلوم ہوتا ہے اور جو کسی طرح وطنی پیداوار نہیں سمجھا جا سکتا، یہ وہ مسئلہ ہے جس کا ذکر عربی تحریرات میں الرجعۃ یعنی مسئلہ "واپسی" کے نام سے آتا ہے عقیدۃ الرجعۃ اس زمانہ کی زبان میں یہ خیال ظاہر کرتا تھا کہ شیعگان علی رض مرنے کے بعد پھر زندہ ہوں گے اور تمام آدمی ایک مدت کے بعد جو چالیس دن سے کم نہ ہوگی جی اٹھیں گے اس مسئلہ نے معتقدین میں ایک خاص طرح کی باطنی گمراہی پیدا کر دی کیونکہ اس نے ان لوگوں میں موت کی غیر معمولی تحقیر کو ترقی دی تھی ایک عربی شیعی جس کا نام خندق تھا اس قدر راسخ العقیدہ تھا کہ اس نے اپنے دوستوں کو یقین دلایا تھا کہ اگر اس کے خاندان کی کوئی کفالت کرے تو وہ اعراض عام کے لیئے اپنی جان دینے کو بالکل تیار تھا، ایک دوست نے اسے اطمینان مطلوبہ دلایا اور وہ مکہ چلا گیا، جہاں اس نے بآواز بلند اہل مکہ پر گالیوں کی بوچھار کی اور یہ الزام لگایا کہ انہوں نے خاندان رسالت کو جو اسلام کے جائز بیٹھنے والے مذہبی تھے چھوڑ رکھا تھا، شیعوں میں واقعی بہیتر سے سخت خیال ایسے موجود تھے جن کا عقیدہ تھا کہ خلافت

صرف اولاد علیؓ کا حق تھا، ان کو پختہ یقین تھا کہ جلد جی اٹھیں گے اس لئے بے تکلف موت سے ہم آغوش ہوتے تھے اور آج بھی شیعیانِ عجم میں عقیدہ رجعۃ موجود ہے جس کے شواہد بابلیوں کے ہنگامہ کی تاریخ میں بکثرت ملتے ہیں، نصیریوں میں بھی یہی مذہبی خیال آج تک چلا آیا ہے، کیونکہ وہ اپنے عقیدہ میں مسئلہ رجعت کو یوں چھپایا کرتے ہیں کہ ظہور الوہیت بار بار انسانی صورت میں ہوتا رہتا ہے اس کے سوا ایک عربی شیعی یعنی شاعر کثیرؒ کی نسبت (جو فرقہ قیسانیہ یا خشبیہ سے تھا) کہا جاتا ہے کہ وہ تناسخ اور مختلف صورتوں میں خدا کے تجسم کے مسئلہ کی تلقین کرتا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسائل مذہبی مانوی سے ماخوذ ہیں، مسئلہ الرجعۃ اور حشر و نشر یہود و نصاریٰ سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے جیساکہ حضرت عیسیٰؑ کے دوبارہ زندہ ہونے کی روایت سے پایا جاتا ہے، یہ صاف ظاہر ہے کہ عقیدہ رجعۃ اس وقت بلکہ اس پہلے مشہور ہو چکا تھا، عام عقیدے کے مطابق پیغمبران یونسؑ و الیاسؑ مرے نہیں تھے بلکہ ان کے زندہ اجسام حران کی قبروں میں دقف استراحت تھے ۴۰ دن کی مدت عیسوی روات میں اس طرح پائی جاتی ہے جس طرح ان فرقہ ہائے اسلام میں اس خیال کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کے دنیوی زندگی کی مدت دوبارہ زندہ ہونے کے بعد تاریخ حواریئین میں چالیس۴۰ دن کی قرار دی گئی ہے " اعمالِ حواریئین" کے ایک فقرہ میں مسئلہ رجعۃ کا ذکر ہے جہاں تمام چیزوں کے دوبارہ پیدا کرنے کا بیان آیا ہے، اسی سے عہد عیسوی کی پہلی صدی میں اس " ہزار رسالہ مدت " کا خیال پیدا ہوا جس میں مسیح پھر آکر سلطنت کریں گے۔

یہ تنقیدات تمثیلاً ان اہم تغیرات کے دکھانے کے لئے کافی ہیں جو

بیرونی تمدن کے اثر سے اسلام پر طاری ہوئے لیکن یہ موثرات صرف مذہبی اور ہی میں پوری قوت کے ساتھ اپنا کام نہیں کر رہے تھے بلکہ اجتماعی (سوشل) دائرہ ان سے کہیں زیادہ متاثر ہو رہا تھا۔ (باقی وارد)

(مخزن جون ۱۹۰۷ء)

البیان

ایک ماہوار ادبی رسالہ

ملک میں "الندوہ" کے سوا یہی ایک رسالہ ہے جس کا موضوعِ سخن عالمانہ اُردو کے ساتھ عربی لٹریچر کے مذاق کی تجدید ہے، یہ وہ خصوصیت ہے جس کی وجہ سے ادبی رسالوں میں یہ علانیہ ممتاز ہے لیکن مجھے افسوس ہے کہ یہ رسالہ بھی کچھ عرصہ سے سسک سسک کر نکل رہا ہے اور وہ وقت غالباً کچھ دور نہیں معلوم ہوتا کہ معارف کی طرح یہ بھی ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جائے، مرض وہی ہے ملک کے وقیع پرچوں کو آئے دن لاحق رہتا ہے، یعنی خریدار نہیں ملتے، جو ملتے ہیں، وہ قیمت نہیں دیتے فرمایئے یہ تو مادیت کا دور دورہ ہے، نرے توکل سے تو کام چلنے سے رہا،

سرسید کے زمانہ کو ابھی کئے دن ہوئے کل کی بات ہے کہ نئے پرانے ہر خیال کے آدمیوں میں دفعتاً پڑھنے لکھنے کی ایک قوی تحریک پیدا ہو گئی تھی جس کو دیکھ دیکھ کر اہل نظر سمجھنے لگے تھے کہ مسلمانوں میں ارتقائے دماغی شروع ہوا چاہتا ہے یعنی ملک میں ادبی (لٹریری) مذاق کا رنگ اگر عام طور پر رچ گیا تو وہ حالت ہم پر طاری ہو کر رہے گی جو جاپان میں عملی ترقیات سے پہلے دیکھی گئی لیکن وہ

کایا پلٹ کچھ سمجھ میں نہیں آتی کہ آج کل سرے سے کوئی پڑھنا ہی نہیں چاہتا۔
اہل صرف کی طرح زمانے کے تین حصے کیجیے ماضی، حال، استقبال، فلسفیوں
کا خیال ہے کہ مستقبل ہمیشہ ہماری حالت گذشتہ اور موجودہ ایک نتیجہ ہوتا ہے، لیکن
میں آئندہ قطع نظر کر کے پہلے یہ دیکھتا ہوں کہ حال اگر ماضی کا بیٹا یعنی اس کا پیدا کردہ
ہے تو آخر اس قدر ناخلف کیوں ہے؟ وراثت طبعی کے لحاظ سے کچھ تو پچھلے اور موجودہ
وقت میں خصائص مشترک ہونے تھے۔ یہ کیا کہ باوا اچھے خاصے پڑھے لکھے اور بیٹے
اس قدر کورے کہ الف کے نام سے نہیں جانتے، آخر دور موجودہ ادبی حیثیت سے
اتنا گیا گذرا کیوں ہے؟ یہی لیل و نہار ہیں تو پوتے یعنی مستقبل کی قطعاً خیر نہیں!
دنیا میں ہر چیز لمقامات مقررہ کے سلسلے میں جکڑی ہوئی ہے گذشتہ دماغی تحریک
کے ساتھ موجودہ بے حسی کو ربط دیجیے تو نتیجہ کیا ہوگا؟ ایک طرح کی ناگزیر ادبی موت
جس کے خیال سے دم گھٹتا ہے۔ موت کیا ہے؟ صرف قولے جس کا جانا ہے!
یہ تو قطعی ہے کہ نئے تعلیم یافتہ کچھ نہیں پڑھتے، یعنی ان میں خالص علمی
مذاق، ہیئت اجتماعی نہ پیدا ہوا ہے نہ آئندہ پیدا ہونے کے منطقی آثار ہیں، بڑی
مصیبت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی زبان بگاڑی ہے، ایک صاحب جو خاصے گریجویٹ
ہیں اور جن کو کہنا یہ منظور تھا کہ "بیوی کا انتقال ہوگیا" مزاج پرسی پر نہایت سنجیدگی
سے فرمانے لگے کہ

میری وائف کا ڈیتھ ہوگیا ہے۔

میں ان کا منہ دیکھنے لگا، اور مجبوراً عرض کرنا پڑا کہ حادثہ سے اظہار خیال
کے طریقے پر افسوس ہے! یہ نمونہ ہے اس ٹکسالی زبان کا جو آج کل ہماری

تربیت گاہوں میں زوروں کے ساتھ رائج ہے اچھے اچھوں کو دیکھا پورہ فقرہ اپنی مادری زبان کا بغیر اختلاط انگریزی نہیں بول سکتے ایک خاص طرح کا روزمرہ ایجاد ہوا ہے جس میں آدھے سے زیادہ بے ضرورت انگریزی کی بھرتی ہوتی ہے، گوروں کی بگڑی اردو بیگانگی زبان کی وجہ سے پھر بھی لائق درگذر ہے لیکن یہ نئی بات ہے کہ اہل زبان اور گونگے! یعنی ادائے خیال پر اس وقت تک قادر نہیں جب تک زبان غیر کی پیوند کاری نہ ہو جس پر ہر شخص گویا مٹا ہوا ہے داعی پر عشق اور ماں سے بیگانگی" یہ وہ پیمانہ شائستگی ہے جو مادرِ زبان کے لیئے حذلت سے خالی نہیں، اس پر ستم ظریفی یہ ہے کہ کسی کو اصلاح کا احساس تک نہیں ورنہ آج "البیان" ہاتھوں ہاتھ ہوتا۔

ہم مولانا عبداللہ عمادی کے ممنون ہیں کہ وہ اس کس مپرسی میں بھی دادِ سخن دیتے رہتے ہیں، علم الصنائع اور کیمیائے اسلام پر جو کچھ لکھا گیا، فاضل عمادی کے سوا کس کا یوں اٹھ سکتا تھا، یہ مضامین اور جو آج کل ان کے قلم سے نکل رہے ہیں، اس پایہ کے ہیں جن سے اردو لٹریچر کا مرتبہ معلوم ہوتا ہے، اور سچ یہ ہے کہ معلم شبلی کے بعد مستشرقانہ حیثیت سے کچھ لکھنا پڑھنا وہ بھی یورپ سے دور یہاں کی غیر متحرک آب وہوا میں جامع کمال عمادی کا حصہ ہے، جن کو تعلیم یافتہ طبقہ بھی اچھی طرح نہیں جانتا ان کے ذاتی اجتہادات کے سوا ایک نظر میری مصری لٹریچر بھی ہے جو اس قدر ترقی کر گیا ہے کہ کسی طرح جی نہیں مانتا، ہم اس سے بیگانہ ہو کر رہیں، ہماری بدمذاقی خود سفارشی ہے کہ البیان اپنی وضعداری کو ہاتھ سے نہ دے اور وہ مرقعے پیش کرتا رہے جن میں گراں پایہ ادبی مضامین کے سوا پرزور معقولات کا بھی ایک کافی حصہ ہو، معقولات پر توجہ کی ضرورت اس وجہ سے بھی ہے کہ جن مسائل کو

ہمارے لٹریچر اور روزمرہ کا ایک جزو ہوتا تھا اب بھی وہ اتنے اہم ہیں کہ مستقل
عنوانوں پر اظہار خیال کی ضرورت ہوتی ہے، پچھلے دنوں ایک صاحب جن کی
رواجی عربیت خاصی معلوم ہوتی تھی، علامہ شبلی کے منھ اس لیے آئے تھے کہ ممدوح
نے مسئلہ ارتقاء پر عملی حیثیت سے نظر ڈالی تھی، لیکن ان کو مولانا کے انتقاد سے
اس قدر بحث نہیں تھی، جس قدر نفس مسئلہ یعنی اصول ارتقا کی تردید پر اصرار تھا
نہ جاننا مزے کی بات ہے، غریب کو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کس حد تک
جہل مرکب کا حامی ہے! بہر حال "البیان" میں سیوطی کے فلسفیانہ مضامین کو
عنصر غالب ہونا چاہیے۔ یہاں یہ بات بھی جتا دینے کی ہے کہ ہمارا مذہبی لٹریچر
مصریوں سے گرا ہوا نہیں ہے اس لیے منقولات اور ان میں بھی ایسے اقتباسات
جن سے کسی بحث کا خاتمہ نہ ہوتا ہو گو دلچسپ ہوں، تاہم وقت کی چیز نہیں۔
آخر میں مولانا عمادی کو جس امر کی طرف بالتخصیص متوجہ کرنا چاہتا ہوں اور
جو دراصل ان چند سطروں کا موضوع اصلی ہے وہ یہ ہے کہ "البیان" کے دو ایک
کالم اصطلاحات جدیدہ کے لئے وقف کر دیے جائیں یہ ایک ضرورت ہے، جس کو
تعلیم یافتہ طبقہ عرصہ سے محسوس کر رہا ہے اور جس پر اردو لٹریچر کی آئندہ ترقی کا
بہت کچھ انحصار ہے وہ اس قدر کہی گذری نہیں جتنی ہماری "علمی ناداری" اسے
ذلیل کر رہی ہے، سچ یہ ہے کوئی مغربی خیال اردو میں شائستگی سے ادا نہیں
ہو سکتا جب اس کے لئے اصطلاحات پہلے سے موجود نہ ہوں اور چونکہ انگریزی اصطلاحات
صرف عربی قالب میں ڈھل سکتی ہیں جس کی ترکیب ایسی واقع ہوئی ہے کہ علمی حیثیت سے
وہ ہماری زبان کی کفیل ہو سکتی ہے اس کے لئے جدید عربی میں معمولی آگہی سے زیادہ

دستگاہ پیدا کرنی ہوگا، اور یہ ہر شخص کے بس کی چیز نہیں، اس لئے "البیان" میرا خیال ہے بہت احسان کرے گا اگر مصر سے وہ ہمارے لئے ذخیرہ اصطلاحات بہم پہنچاتا ہے، یہ اس قدر ضروری مسئلہ ہے کہ "البیان" کے مقاصد میں اسے سرفہرست ہونا تھا، لیکن مولانا عمادی جو اس فن کے اختصاصی (اسپشلسٹ) ہیں، دبی زبان سے فرما رہے ہیں کہ: "جو آگ برف کے ٹکڑوں پر سلگائی جائے وہ جلی چکی! زمانہ میں کہیں علمی مذاق نہیں، لٹریچر سے لگاؤ کا نام نہیں پھر یہ کاوش ددردسری آخر کس لئے؟ یہ بار گراں (پرچہ کا خرچ) چلے گا کیونکر؟

یہ حالت جس قدر مایوس کن ہے اس سے زیادہ لائق افسوس ہے مگر ایک مشہور انشاء پرداز کا خیال سن رکھیے کہ جس طرح ہر شغلہ محبت مصیبت کا گھر ہے شغلہ سخن سب سے بڑھ کر ہے حسن کلام کے مارے ہوئے پنپتے نہ دیکھے سارا اہل قلم بری طرح جیئے اور عمر بھر روٹیوں ہی کے محتاج رہے، اور بہت کم ہیں جو اپنے قلم سے زندگی بسر کر سکے۔

"مصائب اہل تصنیف" دیکھئے جو اس موضوع پر ایک مستقل کتاب ہے تو معلوم ہوگا خلاقین سخن پر کیا کیا سختیاں گذریں اور گو یکتائے روزگار ہوئے مگر مصیبتیں وہ وہ اٹھائیں کہ ان کا دل ہی جانتا ہوگا۔"

لیکن دنیا میں جب کسی قوم نے ترقی کی تو اس کے ادب و انشا یعنی لٹریچر کو ضرور ترقی ہوئی اور اس کی ذلت اس قوم کی نحوست کا سبب رہی ہے عرب کے اس وقت لٹریچر کو دیکھئے جب یہ تمام دنیا کے فتح کر کا حوصلہ رکھتے تھے، اندلس جو تمدن کے لحاظ سے تمام دنیا کا مرکز شائستگی تھا، ادبی حیثیت سے مجمع الفصحا،

اکیڈمی ہو رہا تھا، یورپ کو آج جو عظمت و کمال حاصل ہے کم کسی زمانہ میں
نصیب ہوا ہوگا۔ اس لیئے ان کے لٹریچر کو بھی دیکھئے کس مرتبہ کو پہنچا ہوا ہے،
اخباروں اور کتابوں کا ایک ایک کارخانہ بجائے خود گویا عظیم الشان
ریاست ہے جہاں معاوضہ تصنیف کی تعداد لاکھوں روپیئے پہنچ جاتی ہے۔
ہر شخص کو لٹریچر کی طرف ایسی توجہ ہے کہ مشہور اہل کمال شاہانہ زندگی بسر کرتے ہیں
ہر شخص کو لٹریچر کی طرف ایسی توجہ ہے کہ مشہور اہل کمال شاہانہ زندگی بسر کرتے ہیں،
ایشیا کے اہل قلم میں مجھ کو حضرت شبلی کے ساتھ ایک خاص حسن عقیدت
ہے کبھی کبھی خیال ہوتا ہے کہ بمبئی سے دور کالے کوسوں یورپ میں یہ پیدا ہوئے ہوتے
تو ان کے کمالات کی قدر ہوتی، داد سی داد ہے کہ کوئی کافر ادا کمرے میں
بے تکلف چلی آتی ہے اور کہتی ہے "میں تمہاری کتاب پڑھتے پڑھتے آئی ہوں،
میں تمہاری"، اور یہ دولت تمہاری ساتھ ہی ساتھ آٹھ دس لاکھ کے نوٹ
سنبھال دیئے اور ہاتھ گلے میں ڈال دیئے ؎

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
جس کے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

جس سے ایک ندوہ کیا، لکھنؤ میں مشرقی یونیورسٹی قائم ہو سکتی ہے لیکن لوگوں کا
دل و دماغ خوش کرنے کے لیئے کتنی ہی محنت کیجیئے یہ نصیب ہمارے ابھی کہاں!
یہاں ہر چیز کی قدر ہے اسی کی نہیں اس لئے عمادی کو بھی سردست اپنی ادبی
خدمات کے محض فلسفیانہ صلہ پر قناعت کرنی ہوگی تسکین کے لئے یہ کافی ہے کہ
ہر فعل خود اپنی مکافات ہے۔
میں یہ کہہ چکا ہوں کہ عموماً طبائع میں اس قدر سکون و انجماد ہے کہ پڑھنے لکھنے کا

مشغلہ ضروریات زندگی میں داخل نہیں ہے لیکن خوش نصیبی سے لائق التفات لٹریچر کا مقدار کا اوسط بھی بہت ہی کم ہے یعنی سال میں ایک کتاب بھی مشکل سے شائع ہوتی ہے جس کی خریداری سے گرانباری جیب کا احتمال ہو مثلاً نظام الملک طوسی کی لائف کو لیجئے،

مؤلف "البرامکہ" کی طرف سے کم وبیش پانچ برس ہوئے اس کی اشاعت کا اشتہار دیا گیا۔

مدت ہوئی ایک معتدبہ حصہ چھپ چکا ہے، کچھ اجزا باقی ہیں جن کے لیے برسوں سے کاتب نہیں ملتا، پریس شاکی ہے کہ مسودہ نہیں ملتا، لائق مولف اب دور ہیں کہ وہاں سے کوئی آواز نہیں آتی، نتیجہ یہ ہے کہ ایک غیر محدود زمانہ تک اس کی اشاعت کا بالکل خوف نہیں! حال میں ایک نہایت قابل قدر تالیف ایک اچھے پریس کو اس لیے نہ دی جاسکی کہ کم سے کم دو سال امیدواری کرنی پڑتی اس تیز رفتاری کے ساتھ ہماری عقل ترقیات کا کیا ٹھکانا ہے صدیاں بھی کافی نہیں! جن صاحبوں کو ہمارے نحوست کے دور کرنے کی فکر ہے وہ دیکھیں گے کہ جو قوم اپنے لٹریچر کی طرف سے غافل رہی وہ کبھی نہیں پنپتی اسلیئے ہم کم سے کم یہ تو کر سکتے ہیں کہ دو ایک موقت الشیوع پرچے باالالتزام دیکھتے رہیں، خاص کر "البیان" جس کی طرف خاص کو متوجہ کرنا منظور ہے اگر تین روپے بیشگی ایک وقت گرہ سے نہیں نکل سکتے تو کچھ الزام نہیں، کیونکہ ہمارے ہاں اونچے لوگوں میں بھی "بدل الاشتراک" (یعنی قیمت اخبار) ایک امر غیر عادی ہے، مگر یہ تو ممکن ہے کہ چار آنے کے ٹکٹ ہر مہینے دفتر بھیجدیئے جائیں اور رسالہ ملتا رہے،

یورپ میں جہاں علمی مشاغل بہت زیادہ ہیں اور جہاں مضطرب طبائع نچلی نہیں بیٹھ سکتی ہیں اور چھوٹی آمدنی والے یہی کرتے ہیں کہ روز کے روز اور مہینے کے مہینے خاص خاص پرچوں اور رسالوں کے نمبر لے لئے اس طرح سے چند آنوں میں یہ متعدد پرچے نظر سے گذر جاتے ہیں، اور دائرہ معلومات بڑھتا رہتا ہے" البشیر" خاص پسند ہے، میں ناظرین کو اس سستی اور چلتی ہوئی ترکیب کی آزمائش کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں، اگر لاکھوں پڑھے لکھے مسلمانوں میں ایک ہزار بھی ایسے نکل آئیں جو چند آنے ماہوار دل کڑا کر کے صرف کر گزریں تو دو ایک پرچوں کا زندہ رکھنا کچھ بڑی بات نہیں، ہم میں اتنا افلاس نہیں جس قدر کاہلی اور بے ہمتی ہے اور سچ یہ ہے کہ اس روداد کے ساتھ میں نہیں جانتا بیسویں صدی میں ہم کو دنیا میں رہنے کا کیا حق حاصل ہے۔

(مشرق - ستمبر ۱۹۰۸ء)

ایک خط

پیارے جناب،

یاد فرمائی کا شکریہ! میں نے بہت خوشی کے ساتھ "مشرق" کا ایک نمبر دیکھا لیکن آپ معاف فرمائیں گے، آپ کو دیر میں میرا خیال آیا اور یہ ایک حد تک میری لٹریری حق تلفی تھی،

صفحۂ دوم سے "مشرق" جہاں تک میں دیکھ سکا ملک کے رائج الوقت پرچوں کی ایک "ارتقائی" صورت ہے اور امید ہے آپ کے قلم کے سایہ میں وہ جرائد عصریہ میں ایک نصابی پرچہ ہو کر رہے گا۔

آج کل مہذب ممالک میں جتنے نموذ کے پرچے ہیں ان میں لٹریچر یعنی ادب کے ساتھ سیاسیات کا پہلو قوی تر ہوتا ہے اور میرے خیال میں کسی پرچے کی تکمیل کے لیے جن اجزائے ترکیبی یا تخصیص توجہ کی ضرورت ہے وہ یہی دونوں عناصر ہیں، یعنی ادب و سیاسیات جنھیں اخبار کی روح رواں یا دل و دماغ جو چاہیے کہیے، آپ کا مذاق سلیم خود ان سے طبعی مناسبت رکھتا ہے، اس لئے میرا کچھ کہنا سننا "حکمت بہ لقمان آموختن" سے بھی زیادہ گیا گذرا ہوگا، پالٹکس تو وقت کی چیز ہے، آپ مسائل موثر پر سنجیدگی سے لکھتے رہتے ہیں، ہاں مصری لٹریچر پر

ایک نگاہ رہے، آپ کی عربیت خاصی ہے، اقتباسات میں امتیازی جھلک ہونی چاہیئے، جو رفتہ رفتہ آپ کے پرچہ کا خاصہ ہو جائے۔

آپ نے اپنے عنایت نامہ "چندے" کا کچھ ذکر نہیں کیا' ہمارے ہاں اونچے طبقوں میں بھی "بدل اشتراک" ایک امیر غیر عادی ہے' یعنی ادائے قیمت کا دستور نہیں!

اخبار صرف توکل پہ چلتے ہیں، لیکن میری نیت میں فتور نہیں ہے گو اس وقت باتیں بنانے پر اکتفا کر سکا اور جب تک چندہ نہ ادا ہو جائے میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میری بہترین خواہشات آپ کے ساتھ ہیں،

مشرق۔ ۱۹۰۹ء

مشرق
اور
انشا پردازی کا دور جدید

پیارے پریم! میں دیکھتا ہوں "مشرق" موضوع اخباری کے لحاظ سے نسبتًہ اور پرچوں کے مقابلہ میں اس قدر سطح فائقہ پر ہے کہ میں نہیں جانتا غور کرنے پر بھی کوئی نئی بات کہہ سکوں گا جس کی وجہ غالبًا یہ ہے کہ آپ اس کے قوام میں بہتر سے بہتر اجزائے سے مدد لیتے ہیں جو لائق حصول ہو سکتے ہیں۔

لیکن اس وقت مجھے اس کی ایک حیثیت اضافی یعنے انشا پردازی پر مختصرًا کچھ عرض کرنا ہے، کچھ دنوں سے آپ نے لٹریچر کے بعض نازک مسائل چھیڑ دیئے ہیں آپ کے دل چسپ عالمانہ تنقیدات کے سوا اشہری کا پچھلا مضمون نہایت قابلیت سے لکھا گیا تھا، اس لئے ضرورت ہے کہ "مشرق" میں ایک مستقل عنوان یعنی دائرہ ادبیہ" قائم کیا جائے جس کے تحت میں شائقین قلم کی نکتہ سنجیاں جگہ پاتی رہیں آپ کے ساتھ اگر اور صاحبوں نے بھی توجہ کی تو اس سلسلہ کا جاری رکھنا بڑی بات نہیں۔

میں اس لحاظ سے کہ آپ میری تحریک کو محض زبانی جمع وخرچ نہ سمجھیں

اپنے خیالات کی پہلی قسط بھیجتا ہوں جس کا موضوع سخن "ناصر علی کا اردو لٹریچر" ہے
جن کی پاکیزہ خیالی اور خوش بیانی کی نسبت مجھے اصرار ہے کہ ملک کی انشا پردازی
میں امتیاز خاص رکھتی ہے، اور ظلم ہے اگر اردو کے آشنائے ازلی کے کمالات
کی داد نہ دی جائے جس کا فیاضانہ اعتراف خود لٹریچر کے فرائض میں سے ہے
آپ نے میری ایک سرسری تحریر کو پچھلی دفعہ اس قدر چمکایا کہ میں دیکھتا
ہوں مجھے یہ تکلف بننا پڑا جس کے آثار آپ کو ان اوراق پریشاں میں ملیں گے
جو بھیج رہا ہوں

(مشرق ۱۹۰۹ء)

دائرہ ادبیّہ

کھلی چھٹی

بخدمت جناب خان بہادر سید ناصر علی صاحب بالقابہ ایڈیٹر صلائے عام" دہلی

جناب من! یاد فرمائی کا شکریہ! پرچہ دیکھتے مدت کی چوٹ جو دل کا چور بنی ہوئی تھی ابھر آئی، میں آپ کے لٹریچر کا اس وقت سے دلدادہ ہوں جب لٹریچر کا صحیح مفہوم بھی میرے ذہن میں نہیں تھا، کم و بیش بیس برس ہوئے جب آپ نے ایک وضع خاص پر لکھنے پڑھنے کا مشغلہ جاری کیا یعنی تیرھویں صدی میں دادِ سخن دی" تہذیب الاخلاق" کے ساتھ ساتھ آپ نے جس ٹھاٹھ سے دھواں دھار مضامین لکھے اور سرسید کے لٹریچر پر جس سلیقہ اور سخن گسترانہ شوخیوں سے آپ نے انتقادات کی ٹھہرائی سچ یہ ہے اور اردو لٹریچر کی جان میں آج سنجیدگی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ میں نہیں جانتا ملک کے نامور اہل قلم آپ کے گذشتہ کمالات کی داد دیں گے۔ لیکن میں کھل کر کہنا چاہتا ہوں کہ آپ نے اس وقت انشا پردازی کو چمکایا جب بہتوں نے قلم بھی ہاتھ میں نہیں لئے تھے، آپ کا ادبی مذاق اور ہر طرح کا مادۂ اختراعی (اوریجینٹی) دراصل آپ کے اولیات میں داخل ہونے کے لائق ہے۔

موجودہ نسل تمام تر "تہذیب الاخلاق" کے ادبی دور کی پیدا کردہ ہے جب
آپ کے لٹریچر کا شباب تھا اور یہیں سے اپنا مرتبہ دیکھ لیجئے "یا تیرھویں صدی میں
بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں آپ کا عنصر غیر فانی ہے لیکن افسوس ہے آپ کو یہ
خیال نہ آیا کہ جس سے پچھلے دنوں اتنے دماغی سابقے رہے وہ بحیثیت مجموعی کتابی صورت
میں جلوہ گری کا حق رکھتے ہیں پاکیزہ مجموعے کی ترتیب سے اردو ادب العالیہ (کلاسکس)
میں آپ کی طرف سے مستقلاً قیمتی اضافہ ہوتا جو یادگار زمانہ رہتا آپ معاف فرمائیں گے
یہ بدترین حق تلفی تھی جو آپ اپنی کر سکتے تھے، یہ خیال قطعاً صحیح نہیں ہے کہ ملک میں
اچھے لکھنے والے پیدا ہو گئے ہیں نئی نسل کو آپ کی اردو سے کچھ واسطہ نہیں ہے
نہ بحیثیت موجودہ کسی میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ آئندہ کچھ کر سکے، صاف بات
یہ ہے کہ جس لٹریچر پر آپ مٹے ہوئے ہیں۔ سرے سے اس کی جان ہی کے
لالے ہیں، جس زبان کی حیات طبعی بوڑھے نذیر احمد اور حالی شبلی کے دم تک ہو
وہ سسک سسک کر کب تک چل سکتی ہے! آپ سے کچھ امیدیں تھیں مگر اس وقت
تک آپ کا صحیح مصرف کچھ معلوم نہ ہو سکا سکتا تھا، لٹریچر بڑھاپے میں جوان ہوتا ہے
لیکن میں دیکھتا ہوں آپ کے ساتھ آپ کی طبیعت کا رنگ بھی کچھ بدل سا گیا ہے۔
یعنی خیالات میں ایک طرح کی بے نمکی پائی جاتی ہے اور وہ بات نہیں رہی جو
کبھی پہلے تھی، شاید اس لئے کہ "تہذیب الاخلاق" کی طرح کوئی اچھا ذہن پیدا
کرنے والی نہیں رہی، یعنی جذبات کے اکسانے کا سامان نہیں رہا۔

ملک میں اچھے لکھنے والے کم ہیں ان میں بھی تھوڑے ہی ایسے ہیں جو آپ کے
رنگ میں دو سطریں بھی لکھ سکیں، مرحوم ریاض (خدا اُسے مدتوں زندہ رکھے!)

اور برہم واشہری کے دل سے پوچھیے "ناصر علی بھر کہاں؟ صلائے عام کی ترکیب باوصف حسنِ ظن کے جوآپ کی طرف سے ہے کچھ پسند نہ آئی ناس سے تو ناصری اچھا تھا" خاصے کی چیز" اور وقف عام"! ایک طرح کا بے تکا پن ہے اس سے آپ کے مذاق انشا پردازی پر نکتہ چینی منظور نہیں، بلکہ آپ کو اپنے ڈھب پر لانا ہے! بلیسویں صدی میں جو پرچہ آپ سے باکمال کے قلم کے سایہ میں اور وہ بھی عروس سخن کے میکے یعنی" دلی" سے نکل رہا ہو اس کا نام میں آپ کی جگہ ہوتا تو بے سوچے سمجھے۔

ارتقار

رکھدیتا نام اتنا باکیف تو ہو جس سے پرچے کی علت غائی یعنی آپ کے ادبی تخیل (لٹریری آئڈیل) کا پتہ چل سکے، تقطیع بھی مجھے پسند نہیں، ولایت کے نامی رسالے تو آپ کے پیش نظر ہوں گے، دور کیوں جائیے؟ "الندوہ" کی نصابی تقطیع اختیار کیجیے جو نہایت موزوں ہے، بیتیوں کا بھی کھاتہ ٹھیک نہیں! یہ لکھ رہا ہوں اور سمجھ میں نہیں آتا آپ کے قدرداں کہاں سے آئیں گے، موجودہ نسل آپ کو نہیں جانتی یا کم سے کم میری طرح نہیں جانتی اور یہ آپ ہی کا قصور ہے لیکن "ہر فعل خود اپنی مکافات" ہے۔ دنیا میں رہنے اور اچھی طرح رہنے کا اس قدر حق ہے کہ جس طرح ہو اپنی مستقل یادگار چھوڑیئے اس کی چلتی ہوئی ترکیب یہ ہے کہ تیرھویں صدی اور متفرق پرچوں میں آپ نے جو کچھ لکھا لکھایا ہے، اہتمام کے ساتھ ایک دم سے شائع کر دیجیے لیکن مضامین غیر نہ ہوں ہر داں میں گاڑھے کا پیوند بے جوڑ رہے گا۔ اگر یہ نہ ہوا تو سمجھو نگا میرے منہ میں خاک! آپ جیتے جی مر گئے اور لٹریچر کے خون ناحق کا بار گراں پر رہا ہو وہ علیحدہ یہ اصرار آپ کے خاص مرتبہ

انشاء پردازی کے لحاظ سے ہے آپ کی زبان اپنے مخصوص النوع صفات کے ساتھ کسی اور کے بس کی چیز نہیں اور سچ یہ ہے کہ آپ اپنے فن کی اختصاصی (اسپشلسٹ) ہیں یہاں آپ میں یونانیوں کی سی لطافت خیال پاتا ہوں، آپ کی چشم سخن، جہاں "جنس لطیف" اور اس کے متعلقات کی طرف اشارے کرتی ہے وہ نزاکت خیال کی آخری حد ہے، تیرھویں صدی میں بہتیرے نشتر ہیں جو آج تک دل میں چبھ رہے ہیں، ابھی ابھی ایک فقرہ نظر سے گزرا۔

"یہ پان ان کے لئے ہے"

بے اختیار جی بھر آیا، اگلے پچھلے قصے پیش ہو گئے پوچھئے تو بتا نہیں سکتا لیکن کچھ تو ہے جو دل پر چوٹ لگی رکھ رکھاؤ اتنا تو ہو ایک چھوٹا سا فقرہ اور عطر زندگی دیوڑھے حالی جو شاعر ہیں جذبات کے ساتھ بھی عورت تو خیر "چھوٹے کپڑے" سے گھبراتے ہیں اس قسم کی نزاکت خیال کو پسند نہیں کرتے، لیکن انشاء پردازی ان سے کبھی قطعی نظر نہیں کر سکتے شوق کی مثنویوں میں سے اگر زائد کو نکال ڈالئے تو جو کچھ بچ رہے گا، فلسفہ اخلاق کی جان ہوگا،

یاد اپنی تمہیں دلاتے جائیں — پان کل کے لئے بناتے جائیں

ان سیدھے سادھے مصرعوں میں جو کچھ رکھ رکھاؤ ہے کسی راز و فطرت سے پوچھئے کیا دنیا کی شاعری اس کی نظیر پیش کر سکتی ہے؟ یورپ میں جو آج بڑے بڑے پایہ کے لکھنے والے ہیں ان میں مذاق حسن پرستی اس قدر رچ گیا ہے کہ قریب قریب ان کی ہستی کا ایک جزو ہو رہا ہے عورت جیسے "خواب طفلی" اور "آرزو دے" "کہئے

"ہر بات تری فسانۂ حسن"

ہیئت اجتماعی (یعنی سوسائٹی) کی روح رواں ہو رہی ہے جس کو کوئی شائستہ لٹریچر دست بردار نہیں ہو سکتا، آپ ان نزاکتوں سے خوب واقف ہیں اور یہی وجہ ہے کہ

"عکس رُخ موتیوں کے دانوں میں"

"صنف نازک" آپ کے دائرہ تحریر میں کسی نہ کسی ممبلی کسی حیثیت سے ہی جاتی ہے۔ مہر النساء کا وہ واقعہ کس قدر دلچسپ ہے جب اس نے باغ کی ایک روش پر جہانگیر کے ہاتھ سے کبوتر لے کر چھوڑ دیئے تھے، پروفیسر آزاد نے جس خوبصورتی سے اسے دکھایا ہے، انشا پردازی گو آج تک اس سے بہتر الفاظ نہ مل سکے آپ وہ سماں دکھایئے جب مہر النسا "جوان بیوہ" کی حیثیت سے شاہی محل میں رہنے سہنے لگی ہے۔ لیکن ہائے وہ حسن افسردہ جو خود اپنی قوتوں سے واقف ہو خوب جانتی تھی بجلی کدھر گرے گی۔

شب امید بہ از روز عید می گردد گر آن غنچہ تمنائے آشنا خفتہ است

جہانگیر ایک روز اس کے کمرہ میں جا نکلا جو ضیائے حسن سے شیش محل ہو رہا تھا۔ جدوش کنیزوں کے حلقہ میں زرق برق لباس آنکھوں کو خیرہ کئے دیتے تھے فطرت کی لاڈلی "ہمہ غمزہ ہمہ عشوہ ہمہ ناز" نہایت سادے سفید باریک لباس میں تھی لیکن شیشے کی طرح صاف و شفاف جسم جھلک رہا تھا،

کلائی وہ نازک سی ہیرا تراش وہ محرم سر لپیٹہ اک راز فاش

"مقیاس الشباب" کی سرکشی بنا رہی ہے کہ وہ دستانے کی طرح چپھی ہوئی محرم سے زیادہ اودی اودی رگوں کے پیچ و خم اور اعصاب کی قدرتی کھینچ تان کی ممنون ہے

اس پردہ کافوری برہنہ حصہ افقی! خیال کے لئے باقی رہا، غرض مہر النساء
عالم تصویر بنی ہوئی تھی، شاہی نگاہیں جم کر حسن عریانی کا جائزہ بھی نہ لینے پائی تھی
کہ ایک کہربائی قوت نے بجلی کے تاروں میں جہین یا زلف عنبریں کے پیچوں میں
"جہاں پناہ" کو جکڑنا شروع کیا شاہانہ تمکنت سے دیکھتے دیکھتے حسن گلوسوز
سے شکست کھائی جہانگیر سے ضبط نہ ہو سکا دل کا چور زبان پر آیا:۔

"تمہارے اور تمہاری لونڈیوں کے لباس میں کیوں فرق ہے؟"

اس کا جواب جو کچھ ملا اسی کا حصہ تھا جو آگے چل کر "نور جہاں" ہونے والی تھی
"جی میرا لباس لازماً اوروں سے مختلف ہوگا کیونکہ اسے شاہی خواہشات کے
زیر اثر ہونا چاہیے۔ ذرا دیکھئے! کیا کہہ گئی! جتنا کہہ نہیں اس سے زیادہ تخیل
کے لئے گنجائش چھوڑی۔

ایک فلسفی نے کیا چبھتی ہوئی بات کہی کہ دنیا میں جہاں کہیں حسین عورت ہے
میری رشتہ دار ازلی ہے، یہ تعلق فرد انسانی میں ہمیشہ سے ہے اور وراثت طبعی کے
قاعدے سے ہے ہمیشہ رہے گا، ہماری تمہاری خاک سے اور اٹھیں گے اور یہ
سلسلہ قائم رہے گا، وہ کہتا ہے "مجھ کو صرف ایک تخیل کی ضرورت ہے جو فانی
زندگی کا ایک سہارا ہو اور اسی پر نہایت خوشی سے قانع رہوں گا کیونکہ معلوم ہے
دنیا کے دیکھنے کے لئے برتنے کے لئے نہیں ہے"

او اس قسم کے بہتیرے نکتے ہیں، مگر دکھائے کون؟ "آزاد" جیتے جی مر گئے۔ آپ
باتوں باتوں میں ٹالنا چاہتے ہیں، کیا اچھا تھا اگر آپ "بیسویں صدی کا مناظرہ
لکھتے "اخوان الصفا" کے رنگ میں ایک خیالی مجمع الفصحا (لٹریری اکیڈمی)

ترتیب دیجیے، پورا دائرہ ہوا۔ لیکن بحث یعنی اخلاقی، مذہبی، مادی، اقتصادی) اور فلسفی وغیرہ مختلف الموضوع عناصر اگر جمع ہو گئے اور ان سبھوں میں آپس میں دفاعی ٹکر ہوئی تو لطف آجائے گا کچھ نہ سہی خیام کے فلسفہ پر ریویو کر ڈالیے اور جو پتے پتے کی کہہ گیا ہے، نا آشنایان حقیقت کو سمجھا دیجیے۔ بیچارہ یورپ کے ہاتھوں بچی رہا ہے ایشیا میں بے طرح اس کی مٹی خراب ہے، ثقہ لوگ اسے ہاتھ بھی نہیں لگاتے نہ جاننا بھی ایک مزے کی بات ہے اسی قسم کی سرد مہریاں لٹریچر پر ایک بدنما داغ ہیں۔

آج کل سرمایہ دار وہی سمجھا جاتا ہے جو پچھلوں کے جمع کردہ مواد میں تصرف بیجا یا بجا کر سکے، آپ میں مادہ اختراعی کی کمی نہیں، مواد موجود ہے یورپ سے لیجیے اور خیالات کو پھیلا کر سمیٹیے اور لکھیے غزالی اور ابن رشد کا محاکمہ بہت دلچسپ تھا لیکن ضرورت تھی کہ زیادہ پھیلا ؤ ہوتا اور لگے لپٹے مسائل میں سے کچھ نہ رہ جاتا یہ کہ جس پیمانہ پر آپ لکھ رہے ہیں میرے توقعات اس سے کہیں بڑھے ہوئے ہیں۔ اور یہ امر آپ کی عظمت کے ثبوت میں ہے، تری باتوں سے خواہ وہ کتنی ہی پیاری ہوں اگر بار بار دہرایئے تو جی اکتا جاتا ہے متعدد ادھورے مضامین کی جگہ ایک آدھ لکھیے ذرا دل لگا کر کم سے کم ایک مضمون خالص فلسفیانہ رنگ میں جسے جامعیت اور رکھ رکھاؤ کی حیثیت سے آپ اختراع فائقہ (ماسٹر پیس) کہہ سکیں۔

نئے گروہ سے کچھ امید نہ کیجیے ان کے ہاں اس وقت تک صحیح علمی مذاق کا پتہ نہیں، نہ پڑھنا لکھنا ضروریات زندگی میں داخل ہے قومی لٹریچر سے بیگانگی جیسا اس سے پہلے کسی موقع پر لکھ چکا ہوں، ایک طرح کی نوکھی جاتی ہے اور

سچ یہ ہے کہ انگریزی شاید کچھ آتی بھی ہو اردو تو خیر سے قطعاً نہیں آتی انگریزی کی
غیر ضروری آمیزش نے روزمرہ کا جس طرح خون کر رکھا ہے آپ دیکھ رہے ہیں
اس پر ستم ظریفی یہ ہے کہ کسی کو ایک نہیں مغربی تمدن اور شائستگی کے دلدادہ جہاں
یورپ کی تقلید پر مٹے ہوئے ہیں ایک خاص مسئلہ میں اجتہاد سے نہیں چوکتے
"یعنی، تکلفات زندگی کے اسراف کے ساتھ بھی قومی لٹریچر کے صرف کرنا جرم
ہی نہیں بلکہ ایسا گناہ ہے جس کی بازپرس ہو کر رہے گی۔ ایسے افراد کہاں تک
آپ کی توقعات پورے کر سکیں گے"؟

بہرحال آپ سے جو کچھ ہو سکے کیے جائیے اور یہ تو میں تفصیلی سے عرض
کر چکا کہ آپ سے کیا چاہتا ہوں! مغربیت کے اثر سے نئے نئے عنوان زندگی
پیدا ہو گئے ہیں، ان میں سے کسی بحث کو چھیڑیے آج کل عوید رسمیہ (ایٹی کیٹ)
اور ارتقائے لباس پر جو نہایت اہم مسائل ہیں کچھ لکھیے لکھائیے تو سب سے پہلے
آپ کے دل و دماغ کے نتائج کی داد جس سے ملے گی وہ میں ہوں۔

(صلائے عام سنہ ۱۹۱۰ء)

خوابِ طفلی

اور

آرزوے شباب

آپ کے خیال میں صنفِ نازک یعنی عورت کو کیا ہونا چاہیئے۔
"صرف خوبصورت! جس کی سرسری جلوہ گری یعنی ایک جھلک اچھے اچھوں کے لیئے صاعقہ جانسوز سے کم نہ ہو" ایک مغربی شاعر کہتا ہے۔
عورت اور عورت تو مجسم عشوہ گری ہے! اور دنیا میں بے فوج کی سلطنت کرسکتی ہے" میرے فتوحات خالص اخلاقی ہیں یعنی تو دلوں پر حکومت کرنے والی ہے۔ میرا خیال ہے اس پر کچھ اضافہ کی ضرورت ہے۔
سچ کہیئے، عذرا واقعی بہت حسین ہے! حسین تو ایک معمولی اور سرسری لفظ ہے۔ عورتیں بھی اپنی اپنی جگہ حسین ہوتی ہیں لیکن میں اپنے تخیل میں اوروں سے اس قدر مختلف ہوں کہ صرف گوشت پوست سے کام نہیں چلتا، عذرا میرا عذرا تو نظم زندگی یعنی پوری شاعری ہے اس کی آواز کامل موسیقی، اس کا تبسم میرا عنصر حیات ہے وہ قطعاً تو بہ شکن اور کافر ایمان! ناممکن ہے کہ نظر پڑتے ہی اس پر قابو حاصل کرنے کو جی چاہتا ہے جہاں آنکھیں ملیں، بس یہ معلوم ہوتا ہے تمام

جسم میں بجلی دوڑ گئی مدت ہوئی جب میں پہلی نظر میں شہید ہوا دل سے آواز آئی "
خدایا خیر! جس کا نتیجہ آج تک بھگت رہا ہوں، مجھ پر اتنا سخت وار کبھی نہیں ہوا
کچھ تو ہے جس کی وجہ سے مٹا ہوا ہوں ، میری آنکھوں سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔
لیکن خود مجھے معلوم نہیں کس ادائے خاص کا دلدادہ ہوں پچھلی دفعہ بہت اتری ہوئی
حالت میں دیکھا پھر بھی ایک بات تھی، آج تک عالم تصویر آنکھوں میں پھر رہی ہے!
کیا عذرا آپ کے دل کا "راز" جانتی ہے؟ ہاں ہاں خوب جانتی ہے کہ میں اس پر
مٹا ہوا ہوں لیکن تم کو ہندوستانی سوسائٹی کی حالت معلوم ہے ہمارے ہاں جائز
عشق کا پتہ نہیں نہ جذبات قوت سے فعل میں آسکتے ہیں، یہ بات مہذب اقوام
میں ہے کہ عقد سے پہلے بیگانگی نہیں رہتی اس کا افسوس ہے کہ میں نے عذرا کے
لئے ایک نئی خلش پیدا کر دی اور ایک ایسی فضائے بسیط پیش کر دی جس میں
کانٹے ہی کانٹے ہیں۔ برسوں کے فتنہ خوابیدہ کو چھینٹے دے کر جگانا صریحی
ظلم تھا، حصول آرزو جسے شعرا اپنی اصطلاح میں "وصل" کہتے ہیں ایک طرح کی
خودغرضی ہے، انتظار و ناکامی میں ایک لذت خاص ہے اور چونکہ مجھ کو عذرا کے
ساتھ خالص روحانی تعلق ہے اسلئے گو وہ مجھے گلے کا ہار نہ بنا سکے تاہم اسکی
پرستش سے جیتے جی کبھی دست بردار نہ ہوسکوں گا وقت گذر جائیگا قصے رہ جائیں
خیر سے سن کیا ہوگا؟ یہ نہ پوچھیں وہ پھل چاہتا ہوں جو ڈال میں ٹپکا اور پکا پکایا
ہوا ادھر گرے یعنے ثمر خام کی ضرورت نہیں نہ پال ڈالنے کی فرصت، عذرا کا
موجودہ سن و سال عطر زندگی ہے اور عشق و محبت کے ولولے اسی زمانے میں زیادہ
ہوتے ہیں، سو بات کی ایک بات یہ ہے کہ مجھ کو پسند ہے اور وہ مدتوں اتنی رہے گی کہ

مجھ پر فتوحات حاصل کرتی رہے مجھے اس کے ہوتے دنیا میں کسی اور کی ضرورت نہیں، بعضوں کا خیال ہے جنت میں حوریں ملیں گی جن کو ملیں گی ان ہی کو مبارک میں ادھار پر نقد کو ترجیح دیتا ہوں اور ڈنکے کی چوٹ "خیام کا ہم خیال ہوں جھونپڑوں میں محلوں کا خواب دیکھنا نہیں چاہتا کسی سبزہ زار یا بہتے ہوئے چشمے کے کنارے عذرا کی مخمور آنکھیں اور ایک جام شراب میری اصلی غایت زندگی ہے جسکے سوا دنیا سے کچھ نہیں چاہتا" میں بہیئت موجودہ دوبارہ نہیں پیدا ہوں گا اس لئے کس قدر ضرورت تھی کہ دو چار برس جو لطف سے کٹنے تھے بیکار نہ جاتے، کل کی بات ہے میں نے شاہی کھوئی ہے پھولوں کی سیج یاد ہے کاش عذرا مل جاتی وہ میری نور جہاں اور زندگی کے تمام صیغوں کی حکمرانی ہوتی، اسے دنیا کے سامنے شائستگی اور زندہ دلی کا نمونہ بنا کر پیش کرتا اسکی موزونیت سے طرح طرح کے فائدے اٹھاتا، بہر حال خدا جانے کیا کیا کرنا چاہتا ہوں، لیکن کوئی چیز جذبات کی اکسانے والی تو ہو؟ عذرا میری اسسٹنٹ ہو تو اردو لٹریچر میں جان آجائے گی لیکن لوگ نہیں سمجھے اور سمجھیں گے کیونکہ ان کے ہاں جنس لطیف کا مصرف یہ ہے کہ ہانڈی چولھے کے لئے وقف رہے، گول کھاتے میں چوکھنٹی چیز کس قدر بے تکا پن ہے افسوس! مجھے سرے سے مطلب براری کی امید نہیں، دیکھنا محض عالم خیال سے سروکار رہا، شروع سے میرا حصہ رسدی اتنا ہی تھا! دنیا میں غایت زندگی کیا ہے؟ صرف حصول مسرت! اور یہ ایک خیالی چیز ہے جاگے تو کسی خیال سے اور سوئے تو اس طرح سے

شب امید بہ انہ لعوز عیدی گذرد   کہ آشنا بہ تمنائے آشنا خفتہ است

غرض اٹھتے بیٹھے ہر وقت ایک "عالمِ تصویر" خیال میں ہو جس سے جینا تو جینا
مرنا کس قدر آسان ہو جاتا ہے۔
فلسفیوں سے آج تک "حسن" کی جامع تعریف نہ ہو سکی بہت زور لگا کر بھی
اس قدر کہہ سکے کہ حسن ایک طرح کے تناسب اعضا کا نام ہے لیکن آؤ میں تمہیں بتاؤں
یہ جو گوری چٹی کشیدہ قامت چھریرے بدن کی کچھ چرائے چھپائے بچتی ہوئی آ رہی ہے
ذرا غور سے دیکھنا! اندھیرے میں بھی اس کا چہرہ کتنا چمک رہا ہے یہ چلتی جاگتی
"زہرۂ شب" تمہارے دل میں جگہ پائے گی، کچھ معلوم بھی ہے کون ہے، غور سے
دیکھو، وہ بہترین عطیۂ فطرت، جسے شعراء "دفینۂ حسن" کہتے ہیں، اور آج کل کی
اصطلاح میں آپ "مخزنِ جذبات" (یعنی بیٹری) کہیے۔

بیخود تھے شراب پینے والے　　　مستی میں الٹ دیئے پیالے

جس سے برقی رو تمام جسم میں دوڑ جاتی ہے اسے امنگوں کی طرح یہ باہوش سینہ سے
لگائے ہوئے ہے! ذرا پردے پردے میں جوانی کی سرکشی دیکھیے گا پھبتے ہوئے
کپڑے گویا خود سانچے میں ڈھل گئے جس کا جائزہ آنکھوں آنکھوں میں بھی عیش حاصل
سے کم نہیں فطرت کا یہ نازک تر لطیف تر شیریں تر "رس" دراصل فلسفۂ حسن کا
عنوان اولین ہے، یہاں ہوس سے کام نہیں چلنے کا، اس چیز کی تلاش ہے
جو فطرت کی عام فیاضیوں کے ساتھ بھی نایاب ہے کیوں میں حسن صاف شفاف
سینہ کو سینے سے لگانا چاہتا ہوں ضرورت ہے کہ پہلو میں وہ ایک شریفانہ دل
رکھتا ہو "رفیقِ زندگی" ہونے کی پوری صلاحیت کے ساتھ ہمدرد و ہم خیال ہو
یعنی دائرہ اوصاف کے لئے کچھ باقی نہ رہے، کتنا اچھوتا تخیل (آئیڈیل) ہے

فلسفۂ اخلاق سے جانچیے" اقتضائے نفس" ایک دم سے "شایانِ حال" ہو جاتا ہے! بڑے بڑے زاہد و مرتاض عمراں کے ریاض اور مکاشفہ کے بعد بھی "راز ہستی" کو نہ سمجھے، نہ کسی نے زندگی کو "از گہوارہ تا گور" نظرِ غائر سے دیکھا مقصودِ اصلی کی تلاش تو خیر! ابھی سرے سے یہی نہیں معلوم "زندگی کیا ہے؟ کہاں سے آئے؟ کیوں آئے"؟ کہاں جائیں گے؟ اور یہ چند روزہ ہستی فنا سے پہلے کیا چاہتی ہے؟ ہستی موجودہ بری ہو یا بھلی اس کے حقوق کا اقتضا کیا ہے؟ بس یہی کہ کسی کو گلے سے لگائیے" بڑے سے بڑا فلسفۂ زندگی یہی ہے یعنی "حصول مسرت کے سوا کوئی غایت ہستی نہیں، یہاں کی ہو یا آپ کے حسنِ ظن کے مطابق کہیں اور کی بات ایک ہی ہے، ہم یہاں نبٹے لیتے ہیں آپ وہاں سمجھ لیجیے گا بشرطیکہ یہاں وہاں دونوں جگہ احمق نہ رہیے! یہ صاف صاف اسلیے کہہ رہا ہوں کہ میرے ہاں دل اور زبان ایک چیز کے دو نام ہیں دوسرے چھپاتے ہیں، یعنی وہ نہیں کہتے جیسے دل چاہتا ہے۔

بھئی کہتے تو ٹھیک ہو، ایک بات اور بتا دوں کیا عذرا تم کو چاہتی ہے بوڑھے بچے! یہ اس کا راز ہے تم نہ پوچھتے تو اچھا تھا! (دل کی بے قراری آنسو بن کر آنکھوں سے ٹپک پڑی، ہاں وہ دل سے چاہتی ہے، خیالی کانوں سے سنو! دبی زبان سے کھڑی کیا کہہ رہی ہے)

دل تو نذر کر چکی جان باقی ہے وہ بھی قربان کر دوں گی، آپ کہتے تھے عذرا چور ہے لیکن چوری کی اچھی سزا مجھے ملی راتیں رو رو کر کاٹتی ہوں، خدا جانے کیا روگ ہو گیا ہے۔ کھانے پینے کی طرف رغبت نہیں، نہ کسی بات کی

جی لگتا ہے، کوئی پوچھتا ہے تو ٹال دیتی ہوں کہ طبیعت اچھی نہیں مصیبت یہ ہے کہ میں آپ سے کچھ نہیں چاہتی صرف گنہگار محبت ہوں!

دل تو مدت ہوئی کھو چکی، ہاتھ بھی اب حاضر ہے کیونکہ اب اس لائق ہو گئی ہوں، آپ اطمینان رکھیں، عذرا اور بے وفائی؟

خدا اس دن کے لئے نہ رکھے! بیوی بنوں گی تو آپ کی، ورنہ عمر بھر یونہی گذار دوں گی، یاد رکھئے میں آپ کی ہو چکی! ذرا دل میں، وہم نہ لائیگا اسے پتھر کی لکیر بلکہ نوشتۂ تقدیر سمجھئے آپ کی اور صرف آپ کی،

سیرتِ صورت پرستاں اور ہے ——— مذہب الفت پرستاں اور ہے

دُرد ہے جس میں وہ صہبا اور ہے ——— نادۂ ناب مصفّا اور ہے

جس کے ہم جویاں ہیں وہ شئے اور ہے ——— گوہر ہم جس سے ہیں وہ شے اور ہے

مے ہے اپنی اور پیمانہ ہے اور ——— عشق کے مستوں کا میخانہ ہے اور

جب سے دیکھا اس کا جلوہ آنکھ سے ——— غیر عذرا کچھ نہ دیکھا آنکھ سے

سامنا ہے آفتابِ عشق سے ——— مست و بیخود ہوں شرابِ عشق سے

راقم

ہم ہنسی کھیل سمجھے تھے لگانا دل کا ——— اب یہ جانا کہ اسے کہتے ہیں آنا دل کا

(صلائے عام)

سنہ ۱۹۱۰ء

شعرالعجم
پر
ایک فلسفیانہ نظر

آج کل کے معیارِ زندگی میں بڑی مصیبت یہ ہے کہ "دوم درجہ" کوئی چیز نہیں یا تو صرف "لنگوٹی" ہو! جہاں اس سے بڑھے پھر بیچ میں رکنے کی گنجائش نہیں ایک دم سے "اول درجہ" اختیار کرنا ہوگا، اصولِ ارتقاء کی تدریجی رفتار سے کام نہیں چلتا، درمیانی کڑیاں ملائیں، یعنی اپنی طرف سے کچھ "ایجاد" بندہ "گی اور گئے! ذلیل ہوئے وہ علیٰحدہ! بہر حال یہ مغربیت کا ایک راز ہے جس سے کسی طرح مفر نہیں ہزار پیچیدہ "چلائیے" "بخر" سے کام نہیں چلنے کا! "گدھا شوق سے رکھئے پھر بھی یکرنگی (یعنی اریجنلیٹی) ہے مگر جہاں ایک قدم آگے بڑھایا یا درکھئے قطعاً "عرب" رکھنا ہوگا! یہ فقرۂ معترضہ خود ایک مستقل عنوان چاہتا ہے جسے پھر کبھی دیکھیے گا۔

یہاں میری غرض "دوم درجہ" کے اظہارِ خیال یعنی "شعرالعجم" پر ایک غیر ستایشی جنبشِ لب سے ہے

ایک صاحب نے اپنے دوستوں کے اصرار سے "شعرالعجم" تنقید نہیں بلکہ ڈنکے کی چوٹ صرف تنقیص کی ٹھہرائی ہے اور بزعم خود "تصویر کا رخ تاریک" دکھائی ہے لیکن

ان گمے خودرو خیالات کا بیشتر حصہ اہل تنقید (یعنی کرٹیک) کی قلم آزمائی کیلئے بجائے خود ترغیب دے مواد ہے۔ ملک میں اچھے لکھنے والے دو چار سے زیادہ نہیں ہیں ان میں بھی تھوڑے ہی ایسے ہیں جو کسی موضوع پر "تنقید عالیہ" (یعنی ہائر کریٹی سزم) کی صلاحیت رکھتے ہوں، شیکسپیر کا وقیع ریویو ڈاکٹر جانسن لکھ سکا جو باعتبار وسعت معلومات اور مذاق ادب القدما یعنی کلاسیکل حیثیت) دنیا کے سب سے بڑے شاعر گویا ملأ اعلیٰ تھا۔

میرا خیال ہے ملک میں ایسے نفوس قدسی صدیوں میں پیدا ہوں گے جو منصفانہ تنقید اور تنقیص بیجا یعنی عیب گیری کی حد فاصل کا احساس کر سکیں اس لئے بے محل جنبش لب سے خاموشی اچھی آپ خیر سے گونگے ہوں تو اعتراض کی بات نہیں لیکن بولئے اور آدمی کی طرح نہ بولئے تو مجھے ضرور شکایت اس خلوص اور سچ کا کیا ٹھکانا ہے کہ "شعر العجم" کے جن کی عیوب بھی ریویونگار کے خیال میں اتنے ہیں کہ اگر وہ ابھار کر دکھائے جائیں تو ایک دوسری کتاب تیار ہو سکتی ہے۔

حضرت کی نیت کی طرف سے اگر شروع ہی میں مجھے شبہہ پیدا ہو گیا اور آگے چل کر میں ان کا ساتھ نہ دے سکوں تو یہ میرا قصور نہیں! خود انکے دل کا کھوٹ ہے جو بگڑی ہوئی زبان پر آگئی گیا اور جس سے ایک کافی حد تک ان کی پاک طینتی کی غمازی ہوتی ہے۔

(۱) اسلم کا یہ اعتراض کہ ہر زمانہ کی شاعری کے جداگانہ دور نہیں قائم کئے گئے صرف فصاحت کا ایک ڈھونگ ہے شعر العجم کے تین حصے اس وقت تک شائع ہو چکے ہیں اور جہاں تک میں دیکھ سکا پہلے حصے میں متقدمین کے کلام پر تفصیلی نظر ڈالی گئی ہے

دوسرے میں متوسطین اور تیسرے حصے میں شاعری کے آخری دور یعنی متاخرین سے بحث کی گئی ہے۔ کتاب کی اجمالی ترتیب جیسا کہ خود علامہ شبلی نے تصریح کردی ہے یہی ہے اور میں نہیں جانتا، ادبی حیثیت سے جو کہ فاضل مؤلف کے پیش نظر تھا۔ اس میں "ایجاد بندہ" کی کہاں تک گنجائش ہے۔

مجھ کو معلوم ہے پروفیسر براؤن نے مسلمانوں کی دماغی تاریخ لکھی ہے اس کے دور سیاسی اور ملکی حیثیت سے قائم کئے ہیں، ہر دور کے ادبی توقیعات وہ ساتھ ساتھ دکھاتا گیا ہے اور عجمی عنصر کو الگ کرتا گیا ہے لیکن اسی کے ساتھ میں کیمبرج کے ایک دوسرے پروفیسر کی جدید تالیف سے بھی واقف ہوں جو عربی لٹریچر کی ایک جامع تاریخ ہے لیکن مؤلف نے صرف ادبی دور سے غرض رکھی اور دیباچہ میں صاف لکھا ہے کہ اس کا موضوع بحث "عربوں کے ارتقائے خیال" کے سوا کچھ نہیں ہے۔

"شعر العجم" کی ترغیب بھی نفس لٹریچر کے لحاظ سے ہے لیکن اسلم کی "یہ شیرانہ" چشم پوشی ہے کہ وہ چار آنکھیں رکھ کر بھی دیکھ نہیں سکتے، یا شاید دیکھنا بھی نہیں چاہتے اور بڑی متانت سے فرماتے ہیں کہ "مولانا شبلی اپنے فرض اولین تک کا احساس نہ کرسکے" یہ ہے ہر دور کی خصوصیات اور ان کے اسباب یعنی شاعری کے ارتقائے تدریجی کی موشگافیاں اس نکتہ کو شبلی اسلم سے زیادہ سمجھتے ہیں۔

شبلی ملک میں پہلے شخص ہیں جن کو تاریخ و فلسفہ میں ربط باہمی کا خیال پیدا ہوا اور وہ ان جواہر عقلی کی تحلیل و ترکیب کیمیائی اس طرح کرسکے جس سے لٹریچر میں ایک خاص امتزاج پیدا ہوگیا ہے، انھوں نے اپنے متعدد قیمتی تصنیفات میں ہمیشہ اپنا درجہ قائم رکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ آج کل کے ترقی یافتہ مذاق ادبی کے مطابق

وسیع سلسلہ تحقیقات اور زبردست قوت استقرائی سے اسباب و نتائج تعریفات فلسفیانہ
میں کس طرح کام لیا جاسکتا ہے، مجھ کو اصرار ہے کہ شبلی کی تحقیقات سے جو ان کے
ادبیات میں داخل ہونے کے لائق ہے ہندوستان کے علمی قلمرو میں ایک نیا تاریخی دور
شروع ہو گیا اسکیم کا سلیقہ و تحریر میرے دعوی کے ثبوت میں ہے گو اس کا افسوس ہے کہ
وہ تاریخ کے "معلم اول" سے جس پر ملک کو فخر کرنا چاہیے بری طرح پیش آئے
بہرحال شبلی چوتھے حصہ میں نہایت تفصیل سے شاعری پر فلسفیانہ نظر ڈالیں گے
اور یہی حصہ ان کی طبع آزمائی کا اصلی جولانگاہ ہوگا۔

(۲) شبلی نے بعض نمود کے شاعروں کو چھوڑ دیا ہے اور بعضوں کا خیال ہے کہ
یہ اسی قسم کی فروگذاشت ہے جو آزاد سے "آبحیات" میں ہوئی لیکن یہ قاصر النظری
نہیں ہے بلکہ ایک مجتہدانہ فعل ہے جس کی تصریح ایک صاحب نے کر دی ہے
اور جس کے اعادے کی ضرورت یہاں نہیں ہے تاہم اسلم کی خاطر سے کم سے کم یہ چاہیئے
تھا کہ ہر دور کے شعرا کے نام ان کو گنوا دیئے جاتے اور جو مفصل تنقید کے لائق نہیں
تھے ان پر کم سے کم مختصر نوٹ ہوتے یعنی ارتقائے شاعری کے مستقل ارکان یعنی اصلی
صورتوں کے ساتھ ان کا ہیولیٰ بھی نظرانداز نہ ہوتا یا منطق کی اصطلاح میں یوں کہیے
کہ جوہروں کے ساتھ اغراض متعلقہ بھی لگے لپٹے رہتے بات ذرا لگتی ہوتی ہے لیکن
مجھ کو معلوم ہے کہ چوتھے حصہ میں یہ سب کچھ ہوگا اور شبلی کی جدت اجتہاد نے جن شعرا
کو ترجیح دی ہے یا جن کو چھوڑا ہے ان کے وجوہ تفصیل سے دکھائے جائیں گے
ترجیح دی ہے یا جن کو چھوڑا ہے ان کے وجوہ تفصیل سے دکھائے جائیں گے

(۳) یہ تو بالکل ہی غیر صحیح ہے کہ ہر شاعر کا کلام مولانا اس قدر نقل کرتے ہیں کہ
جی اکتا جاتا ہے، میرا خیال ہے جس قدر اقتباسات کیے گئے ہیں ضرورت سے کم ہیں

فارسی لٹریچر مہذب دنیا میں ادب العالیہ یعنی کلاسیکس کا ایک ضروری عنصر سمجھا جاتا ہے لیکن آج کل کی کاروباری زندگی میں جب ہم کو مشرقی لٹریچر کی طرف توجہ کرنے کی بالکل فرصت نہیں ہے صرف یہی ایک طریقہ ہے کہ فارسی لٹریچر کے بہترین اجزاء فلسفیانہ تنقید و تقریظ کے ساتھ نئی نسل کے سامنے پیش کیے جائیں اس طرح قدیم لٹریچر کا وہ حصہ جو جاننے کے لائق ہے ہمیشہ کیلیے محفوظ رہ جائے گا لیکن اسلم نہیں سمجھتے

(۴)، اسلم کی "غیر سعادت مندانہ" ایچ میں سب سے زیادہ مجھے جو بات پر لطف آیا وہ "حکمت بہ لقمان آموختن" کی جدّتِ بے محل ہے، شبلی کی وسیع النظری اور ان کے لائق رشک ذرائع معلومات پر منہ آنا! سچ یہ ہے "سورج کو چراغ دکھانا!" ہے لیکن اگر "گھر کی مرغی کو ساگ کے برابر" نہ سمجھیے تو مجھ کو مجبوراً اعادہ کرنا پڑتا ہے کہ شبلی کا دائرۂ تحقیقات اتنا وسیع ہے کہ وہ یورپ کے مورخین کی صف اول میں جگہ پا سکتے ہیں، فارسی لٹریچر کے متعلق جن مغربی تصنیفات کی طرف اسلم نے اشارہ کیا ہے وہ ایک ایک کر کے شبلی کے ناخنوں میں ہیں اسلم نے علی گڈھ کے صدقہ میں ایک آدھ کتاب کا صرف نام سن پایا، یا طاہر ہمدانی کے ہیران ایلین ایڈیشن کو کہیں دور سے دیکھ لیا، لیکن مجھ کو معلوم ہے کہ خود ہیرن ایلین جس نے رباعیات خیام متعدد مطبوعات خاصہ شائع کیے اور جن میں سے ایک نہایت قیمتی ایڈیشن صرف دو سو ممبروں کے لیے چھاپا گیا تھا اور جو قطعاً اسلم کی نظر سے نہیں گذرا شبلی کی ایک سرسری تحقیقات سے بے نیاز نہ رہ سکا، جس میں فارسی کے "مسلم الثبوت استاد" پروفیسر ڈینی سن راس نے بھی ٹھوکر کھائی تھی لیکن اس کی تصریح کا یہ موقع نہیں بہر حال مجھ کو اصرار ہے کہ فارسی اور عربی لٹریچر کے متعلق جس قدر مواد آج موجود ہے وہ سب شبلی کے

پیش نظر ہی نہیں بلکہ جس طرح ولادت سے پہلے جنین کا پتہ چل جاتا ہے شبلی کے دائرہ میں بات بھی رہتی ہے کہ انقطاع دماغی کہاں کہاں نئی داغ بیل پڑنے والی ہے اور ایشیا میں تو کچھ دم نہیں رہا، مگر یورپ دنیا کے معلومات میں کیا کیا اضافہ کرنے والا ہے؟ اسلم اگر اپنی تنگ نظری کے ساتھ شبلی کے مستشرقانہ کمالات کا اندازہ نہیں کر سکتے تو ہم ان کو معذور سمجھنے کے لیے تیار ہیں لیکن مجھے جو کچھ شکایت ہے یہ ہے کہ "وہ نہیں جانتے کہ کچھ نہیں جانتے" آج کسی غیر ذمہ دار قلم نے شبلی کی یوں حق تلفی ہوتی تو خود اسلم کہہ اٹھتے کہ گولر کا بھنگا فضائے دہر پر معترض ہوا، برساتی کیڑا زمانہ کے حدوث قدم پر رائے زنی کرے تو اچھا نہیں معلوم ہوتا! لیکن میرا خیال ہے میرے معصوم دوست نے جو کچھ خامہ فرسائی کی وہ محض قصور اس تعداد ہے اس لیے ہم شبلی سے سفارش کرتے ہیں کہ مشرقی لٹریچر کے متعلق مطبوعات یورپ جن کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی ہے ان کی ایک فہرست اسلم کو بھیجدیں ہندوستان میں بیٹھ کر یہ کیا کم ہے کہ ان کو اکثر بہت سے نام تو معلوم ہو جائیں گے۔

(۵) شبلی کی مسلم الثبوت فارسیت کا اعتراف کرنا مولانا حالی کے ساتھ حسن ظن کے افراط کو صرف "تحسین ناشناس" ثابت کرتا ہے، ملک میں پروفیسر آزاد کے بعد صرف شبلی ہیں جو فارسیت کا وجدانی مذاق رکھتے ہیں، فارسیت سے میری غرض اس فارسی سے نہیں ہے جو بابو انگلش کی طرح اسلم نے بچپن میں پڑھی ہوگی، بلکہ میری غرض دنیا کی سب سے شیریں زبان سے ہے جو اس قوم کی زندہ یادگار ہے جو بلحاظ گذشتہ عظمت و ترقیات کے دنیا قدیم متمدن اقوام میں بھی خاص تاریخی وقعت رکھتی ہے۔

انگلستان مستشرقانہ مشاغل کے لحاظ سے یورپ کے اور ممالک سے بہت پیچھے ہے

تاہم وہاں ایک جماعت موجود ہے جو السنہ مشرقی میں اہلِ زبان کی سی مہارت رکھتی ہے
جس میں پروفیسر براؤن آج کل بہت پیش پیش ہیں یورپ کی ایک خاص طرح کی وسیع النظری
میں کلام نہیں یعنی اصولِ ارتقائے نے تحقیقات کے راستے اس قدر صاف کردیئے ہیں
کہ ہر شئے کے مدارج اور طبقاتِ ترتیبی کی کڑیاں ملتی جاتی ہیں لٹریچر بھی اس کلیے سے
کہ ہر شئے کے مدارج اور طبقاتِ ترتیبی کی کڑیاں ملتی جاتی ہیں لٹریچر بھی اس کلیے سے
مستثنیٰ نہیں، تاہم مذاقِ سخن میں جو ایک ذوقی چیز ہے ان فلسفیانہ اکتشافات سے
کیا مدد مل سکتی ہے؟ شبلی جو کچھ لکھتے ہیں آشنائے فن ہوکر لکھتے ہیں اس لئے ان کے
تالیفات مغربی معاصرانہ تصنیفات سے جہاں تک ادبی مذاق کا تعلق ہے نسبتہً ہمیشہ
فائق رہیں گے اور یہاں مجھے صرف یہی دکھلانا تھا۔

(نمبر ۶-۷-۸) یہ بھی صحیح نہیں کہ شبلی کو موازنۂ انیس و دبیر میں کامیابی
نہیں ہوئی" سوز خواں" طبقہ جو چاہے کہے لیکن "موازنہ" میں جو تعلیم یافتہ فرقہ شبلی کا
مخاطب صحیح ہے وہ اس کتاب کو مؤلف کے کمالات میں اختراع فائقہ (یعنی ماسٹر پیس)
نہ سہی! تاہم اس میں کچھ شک نہیں کہ اردو ادب میں وہ ایک قیمتی اضافہ سمجھتا ہے
اور جس طرح شبلی کی پیداوار دماغی عموماً باستحقاق "صفِ اول" میں جگہ پاتی رہتی
ہے "موازنہ" بھی تنقید ادبی کی حیثیت سے ایک نصابی (اسٹنڈرڈ) چیز ہے اور
وہ میرے آپ کے اعتراف کا محتاج نہیں۔

ایک بزرگ سے جو ملک میں لکھنے پڑھنے کا نہایت صحیح مذاق رکھتے ہیں،
"موازنہ" کا ذکر آیا وہ کچھ چپ سے ہوگئے" مجھے مجبوراً عرض کرنا پڑا کہ موازنہ میں جو
کچھ نقص ہے یہ ہے کہ آپ کے قلم کا نتیجہ نہیں ہے اس برجستہ گرفت پر وہ پھڑک گئے
اور ان کو اقرار کرنا پڑا کہ موازنہ سے اہلِ قلم کو جو شکایت ہو سکتی ہے اسی قبیل کی ہے

دہلی لکھنو والوں سے قطع نظر کئے لیتا ہوں کیونکہ وہ سمجھے ہوں گے شبلی کی طرف سے "ارض ممنوعہ" یعنی ان کی قلمرو میں مداخلت بیجا کی گئی۔

اگر اشعار کی لطافت اور خوبی ایک وجدانی چیز ہے اور اس کا سمجھنا ذوق صحیح پر منحصر ہے اور ان خوبیوں کا دکھانا بڑے اہل کمال کا کام ہے" تو میں خوش ہوں کہ شبلی حضرت حالی کے حریف مقابل نہ سہی تاہم وہ شاعری کے ملکہ راسخہ اور ادبی نکتہ سنجیوں کے لحاظ سے اتنی اونچی سطح پر ہیں کہ بڑے بڑے مستشرقین یورپ بھی ان کی گرد کو نہیں پہنچ سکتے۔

یہ بھی غلط ہے کہ شبلی کو تصوّف سے مناسبت نہیں ہے میں کہیں لکھ چکا ہوں کہ تصوف جیساکہ اکثروں کا خیال ہے ایک طرف کا خبط متعارف نہیں ہے بلکہ جیساکہ خود شبلی نے تصریح کی ہے دراصل "تصحیح خیال" کا نام ہے جو اخلاق کی طرح فلسفہ کی ایک مستقل شاخ ہے لیکن جس طرح توکل کا مصداق ایک طرح کی گداگری ہو رہی ہے تصوف کی صورت بھی اتنی بگڑ گئی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ بیٹ کا ایک مشغلہ رہ گیا ہے، ہم تصوف کو صرف اس نظر سے دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس میں ذوقی اور وجدانی کیفیت کے ساتھ ایک ادبی پہلو بھی موجود ہے، اگر وہ کوئی راز ہے جو سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا چلا آیا ہے تو ہم کو بیسویں صدی میں اس کی طرف متوجہ ہونے کی بالکل فرصت نہیں بہرحال تصوف اگر ایک خاص طرح کی لطافت جذبات کا نام ہے جو حکیمانہ رنگ میں ڈوبی ہوئی ہو اور خیام و حافظ اس میں رنگے ہوئے تھے تو شبلی پر بھی اس کی چھینٹیں پڑی ہیں، صوفیانہ ریاضت و اعمال جو قطعاً غیر فطری ہیں بے وقت کی شہنائی سے کم نہیں! ہم مردوں میں "ہسٹریا" یعنی اختناق الرحم کے

خواص پیدا کرنا نہیں چاہتے نہ تشنج اعصابی اور حرکاتِ رقاصی کے لیے بوڑھے شبلی کہیں سے موزوں ہیں! اسلم اور اُن کے یارانِ طریقت کو یہ ناچ ناچنا (افعال صوفیانہ) مبارک دیکھیے یہ نہ کہیے گا ؎

اے کہ آگاہ نۂ حالتِ درویشاں را — تو چہ دانی کہ چہ سودا بہ سرِ ست ایشاں را

ایک چیز پر آپ اس لیے سر دھنتے ہیں کہ وہ آپ کے ساتھ آپ کے اچھے اچھوں کی سمجھ میں نہیں آتی، بڑے بڑوں کو ارمان ہی رہا، ہم اس لیے اس سے بچیا چھڑاتے ہیں کہ ہمیں اس خبط میں پڑنا منظور نہیں، نہ ہماری اخلاقی زندگی کی تکمیل کے لیے کہیں سے اس کی ضرورت ہے، آپ تزکیہ باطن کے پیچھے پڑے ہیں ہم کہتے ہیں کہ نفس خود پاک ہے، ذرا دعوئی کی شرافت دیکھیے گا! یہ اگر جہالت ہے تو دنیا نے بڑے بڑے "مستشرق" "اپنی بیگانہ وشی" پر ناز کر سکتے ہیں، جنھوں نے تصوف پر نہایت شرح وبسط سے فلسفیانہ بحث کی ہے۔

یہ بھی غلط ہے کہ شبلی بزرگانِ اسلام کا احترام نہیں کرتے، وہ ان کو لائق ادب" انسان" سمجھتے ہیں جس طرح میرا منشا متجمع صفات کمالیہ انسانی سے ہے جو سچی تعریف کی آخری حد ہے اسلم یا ان کے اور ہم مشربوں کی طرح ہر کس و ناکس کے ساتھ شبلی اس فیاضی سے پیش نہیں آتے کہ " بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر" پڑھے لکھے آدمیوں میں" عزت" کا خیال اس قدر بڑھ رہا ہے کہ جہاں ہم خود صرف "انسان" ہونا چاہتے ہیں دوسروں کو بھی اس سے زیادہ بڑھانا نہیں چاہتے آج کل کے عوامد رسمیہ (یعنی ایٹی کیٹ) کی رو سے غیر ضروری حسن ظن کی افراط صرف "متروکات" میں داخل ہونے کے لائق نہیں، بلکہ ایک طرح کی وہم پرستی اور بیکار دردِ سری ہے

جو تقویم پارینہ کی طرح بیجا پھڑانے کی چیز ہے۔

خیام بیچارہ یورپ پہنچ کچھ غیر ثقہ سنا ہو گیا' لیکن حافظ کی بات ایشیا میں اس قدر بنی کہ چھوٹے پیمانے کے "پیغمبر" سمجھے جاتے ہیں' حالانکہ رندانہ تو بہ صوفیانہ "خیالات موزوں" کے لحاظ سے ان کو صرف شاعر ہونا تھا' شبلی تو پھر بھی ان کو رئیس الشعرا سمجھتے ہیں۔

خیام کی مصطلحے نوشی کی ضمن میں شبلی کی یہ شاعرانہ شوخی کہ

"افسوس ہے کہ وہ فلسفی اور حکیم تھا' صوفی نہ تھا ورنہ حافظ کی طرح"

"یہی شراب' شراب معرفت بن جاتی"

ادبی نکتہ سنجی کی آخری حد ہے' شعر العجم میں یہی ایک فقرہ تو ہے جو اس قدر "بالکیف" اور صوفیانہ رنگ میں ہے کہ دیکھتے ہی بس یہ معلوم ہوتا ہے جسم میں ایک برقی رو دوڑ گئی یہ اسلم کے بھونڈے مذاق کا بھوہڑپن ہے کہ وہ اس نزاکت خیال سے لطف نہ اٹھا سکے اور ستم ظریفی یہ ہے کہ میری بد نصیبی سے ان کو سوجھی بھی تو اعتراض کی سوجھی!

اسی سلسلہ میں محمود کی غیر ضروری ثقاہت پر جہاں اسلم کو اصرار ہے آپ نہایت بلند آہنگی سے فرماتے ہیں کہ شبلی محمود اور اس کے زمانہ کی تاریخ ہی سے ناواقف نہیں بلکہ ان کو تاریخ کا صحیح مذاق بھی نہیں ملا ہے غریب اسلم کو معلوم نہیں کہ شاہانہ معیار اخلاق بالکل ایک جداگانہ چیز ہے' یورپ میں جو ہیئت اجتماعی یعنی سوسائٹی کی مساوات کا مدعی ہے' حلقہ شاہی آج بھی ایک عرضی شے یعنی اپنے خصائص کے لحاظ سے بالکل الگ تھلگ خیال کیا جاتا ہے' اوسط تو خیر اعلیٰ بھی بلحاظ خصائل اس سے اس قدر مختلف ہے کہ دونوں ایک قوم کے افراد مشترک نہیں معلوم ہوتے' لیکن ان شاہی حلقوں کا "جلوہ پس پردہ" دیکھئے تو معلوم ہو کہ

موقع بموقع سے کیا کچھ ہوتا رہتا ہے، مسلمان بھی اپنے "عہد زرین" میں نرے زاہد خشک نہیں تھے۔ "الف لیلہ" کیا ہے؟ اس زمانہ کے شاہی گہوارۂ عیش (رائل کورٹ) اور اس وقت کی اونچی سوسائٹی کی خلوت آرائیوں کا اصلی مرقع ہے، ہارون رشید تو علانیہ رند مشرب تھا لیکن محمود کی ایک رخی تصویر جو اسلم دکھانا چاہتے ہیں وہ ان کے دائق رحم دوم درجہ کے معلومات کا نتیجہ ہے، ایک مورخ کو جو طبائع نباض ہو محمود پر اگر وہ تاریخی وقعت رکھتا ہے، گہری نظر ڈالنی ہوگی اور یہ ناممکن سا ہے کہ خصائل کے مختلف پہلو دائرہ نظر میں نہ آئیں محمود میں اوصاف کے ساتھ کمزوریاں بھی تھیں، وہ انسان تھا، فرشتہ نہیں تھا،

میں اس بے تکی بحث کے سلسلہ میں یہ بھی دکھانا چاہتا ہوں کہ "ایاز" کا وجود خیالی اسلم کے وجود یقینی سے زیادہ غیر مشتبہ ہے اسلم جن باتوں کو بازاری گپیں فرماتے ہیں۔ وہ انسانی سلسلۂ روایات اور "افسانہائے کہن" کی ضروری کڑیاں ہیں جن سے ہم ایک منٹ کے لئے بھی دست بردار نہیں ہو سکتے، یورپ کا ایک زبردست مستشرق ایسی سرد اور بے غایت تحقیقات کو نظر حقارت سے دیکھتا ہے جو کسی لطیف انسانی تخیل (آئیڈیل) کو جو وراثۃً زمانہ ہائے دراز میں منتقل ہوتا ہوا ہم تک پہنچا ہے، بغیر کسی کافی معاوضہ کے دفعتہً چھین لے" وہ کہتا ہے کہ مغربی سرد مہریاں یعنی نرے مادے اور سائنٹیفک اکتشافات، مشرق کے وسیع عالم خیال اور اسکے لازوال دلچسپیوں اور نزاکتوں کی قائم مقامی نہیں کر سکتے جن میں ایک خاص طرح کی گرمجوشی اور ایسی قوت اخلاقی موجود ہے جو سخت سے سخت مصائب انسانی میں ہمارے آنسو پوچھتی رہتی ہے، ہم ہر مادی پیش قدمی کے ساتھ کچھ نہ کچھ کھوتے ہیں جسکی بنا کسی

شریف تر اور اعلیٰ تر اصول خیال پر ازل ہی میں پڑ چکی تھی۔

خیر یہ بات اسلم کے دل و دماغ سے مناسبت نہیں رکھتیں، یونانیوں کی سی لطافت خیال اور مذاق حسن پرستی کی ضرورت ہے جو ہندوستان کے حکمائے ادب (ڈاکٹر آف لٹریچر) میں صرف شبلی کا حصہ ہے۔

میرا خیال ہے اب مجھے کچھ زیادہ کہنا نہیں ہے، ایک فقرہ رہ گیا تھا وہ بھی لیجیے "شبلی پر یہ الزام ہے کہ وہ جوش میں آکر ایک شاعر کو دوسرے پر بیجا فوقیت دیتے ہیں یا جس کے حالات لکھتے ہیں اسی کے ہو رہتے ہیں" اسلم کو معلوم نہیں کہ اس قسم کا جوش خاصہ انسانی ہے، ایک انشا پرداز جہاں کسی اہل قلم کے وصف غالب کو ابھار کر دکھاتا ہے وہاں تنقید کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ دوسرے جزئیات پر بھی نظر ڈالے اس طرح جب مختلف شعراء پر جو قریب قریب ایک ہی سطح پر ہوں نظر ڈالی جائے گی تو لازماً صفات مشترک میں تصادم ہو جائے گا ان کا تجزیہ کرنا ان کو بیچ بیچ کر اس طرح دکھانا کہ ایک کا دوسرے سے امتیاز ہے اور ساتھ ہی صفت غالباً آنکھوں کے سامنے آجائے ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ اسلم نے ساری عمر میں لے دے کر "حیات حافظ" لکھی اور اس وقت لکھی ...... جب شعر العجم کے اجزاء متعلق علی گڈھ پریس میں ان کے پیش نظر تھے وہ تصنیف کی اہم ذمہ داریوں سے ناآشنا سے ہیں، ورنہ یوں شبلی کے منہ نہ آتے۔

"شعر العجم" میں "حیات سعدی" سے علیحدہ ہو کر سعدیؒ پر اور خاصکر فردوسی پر جس قدر نفاست سے تفصیلی نظر ڈالی گئی ہے وہ بجائے خود ادبی فتوحات میں داخل ہونے کے لائق ہے، لیکن "چہ کنم کہ چشم بدبیں نکند بروں نگاہے"۔

مجھ کو افسوس ہے کہ اسلم کو ذرا سختی سے ٹوکنا پڑا لیکن یہ سختی ان کی طرزِ انشاء پردازی کے لحاظ سے ہے جس کی ذمہ داران کی غیر ضروری اپج ہے:

شعر العجم کی تنقیص سے جس میں انھوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے، انھوں نے شبلی سے زیادہ لٹریچر کی حق تلفی کی خاصکر اس لحاظ سے کہ ملک میں پڑھے لکھوں کی تعداد کسرات سے آگے نہیں بڑھتی، ان میں بھی تھوڑے ہی ایسے ہیں جو اردو ادب کا مذاق صحیح رکھتے ہیں، جن میں اظہار خیال سے پہلے صحیح رائے قائم کرنے کا سلیقہ ہو ایسی حالت میں اسلم کی تنقیص بجائے رہنمائی کی جگہ صریحاً گمراہی کا سبب ہو گی، ادبی حیثیت سے عبد السلام ندوی، اسلم کا توڑ کر چکے ہیں، میں نے جو کچھ لکھا ہے صرف ترکی بہ ترکی کی حیثیت ہے، جس کی غایت بھشیا دی کی توتو میں میں سے زیادہ نہیں ہے لیکن برا ماننے کی بات نہیں ہے، میں نے صرف معاوضہ بالمثل سے کام لیا ہے جس کی نظیر میرے سامنے موجود تھی۔

یہ چند سطریں مجھے امید ہے ایک بے "ادب" کے لئے جو مذہبی مذاق رکھتا ہو محتسب کے درے ہیں جو حدودِ اخلاق کے توڑنے کا شرعی علاج ہے، اچھا ہوتا اگر اسلم میری خاطر سے آئندہ اس فقرے کو عنوانِ زندگی بنا لیتے "ایاز قدرِ خود بشناس"

اسی سلسلہ میں آج کل شبلی کی "الکلام" پہ جو لے دے ہو رہی ہے اور جو میرے موجودہ موضوعِ بحث سے خارج ہے کچھ سرسری ریمارک کرنا چاہتا ہوں کسی آئندہ موقع پہ مستقلاً نظر ڈالوں گا۔

"تنقید الکلام" میں لائق "معلم" نے نہایت قابلیت سے سائنس اور فلسفہ حال کے معرکۃ الآرا، مسائل سے بحث کی ہے۔ اس طرح اس سے پہلے "راز" نے

کبھی پردہ نہیں اٹھایا گیا لیکن صاحب تنقید کو یاد رکھنا چاہیے کہ ان کے علمیاتی مذہب (یعنی ایگناسٹک خیالات) کی زد پر صرف شبلی نہیں ہیں بلکہ خود مذہب مسائل مختلف فیہ کا ذمہ دار ہے۔ شبلی سے اگر غلطی ہوئی تو صرف اس قدر کہ انھوں نے مذہب کو آج کل کے عقلیات سے ٹکرایا یہ غلطی اس سے پہلے بھی جب مسلمانوں کے اچھے دن تھے ہو چکی ہے اور علم کلام کو عباسی دور کے دماغی ترقیات کے لحاظ سے "یادایام" سمجھئے جو عقائد اسلام اور فلسفۂ قدیم کے گذشتہ اختلاط کی ادبی تاریخ ہے لیکن ان زمانہ میں اسلام کو صرف فلسفہ یعنی ایک حد تک محض اصول نظری سے سابقہ تھا اسلئے جس طرح لحاف کی تیاری میں کچھ استر سے لیا اور کچھ ابرہ سے اور دونوں کا جھول جھال لے کر برابر کر دیا، دونوں حریف جو چھری کٹار ہو رہی ہے تھے گلے ملوا دیئے گئے لیکن آج مذہب کو ایسے دشمن ازلی یعنی سائینس کا مقابلہ کرنا ہے جو قوی تر حریف ہے اور جو اپنے سوا دنیا میں کسی کو دیکھنا نہیں چاہتا، مذہب کے اولیات کا انحصار کلیۃً امور غیر مادی یعنی ایسی چیزوں پر ہے جو سر سے مدرکات انسانی سے باہر ہیں یعنی ہمارے قوائے فطری ان کو سمجھنے بوجھنے سے عاری ہیں اور سائینس صرف مادیت سے غرض نہیں رکھتا بلکہ اس کا دعویٰ ہے کہ عالم غیر کا خیر سے وجود ہی نہیں جس پر ہم آپ اس قدر مٹے ہوئے ہیں، بہرحال فلسفہ پھر بھی اتنا برا نہیں کہ سنی سنائی کبھی مان لیتا ہے لیکن سائینس اتنا کمبخت ہے کہ جب تک آنکھوں دیکھی" نہ ہو ہزار کتنے ہی بڑے بڑے جبہ" اور دستار پیش کیجیے مذہب کی دہائی دیجیے ایک نہیں سنتا ! ظاہر ہے کہ اتنا بڑا کافر بر خود غلط کسی "شریعت سہلہ" کی گرفت میں کہاں تک آسکتا ہے ؟

لیکن کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم مذہب سے عموماً دست بردار ہو جائیں ؟ اس کا

فیصلہ میں انسان کی اگلی پچھلی اخلاقی تاریخ پر چھوڑتا ہوں جس کی تکمیل کی نسبت خود فلسفہ کا یہ دعویٰ ہے کہ بغیر مذہب کے ہو ہی نہیں سکتی۔ شبلی نے الکلام میں نفس موضوع کے لحاظ سے جو روش اختیار کی اس کے سوا چارہ کار ہی کیا تھا آپ کسی کے ہاتھ پر بیعت کرنی چاہیں تو پہلے ضرورت ہے کہ بڑے میاں سے آپ کو حسن ظن بھی ہو یہ نہیں کہ ایک دم سے پگڑی اتار لی اور دعویٰ یہ کہ ہم آپ کے خالص بہی خواہ ہیں لگی لپٹی نہیں رکھتے۔

طبائع انسانی کے لئے اگر مذہب کی ندرت ہے تو اس کے مسلمات اعتقاد جیسے ایک طرح کی مجبوری کہیے تسلیم کرنے ہوں گے رہی معقول و منقول کی تطبیق یہاں تک مذہب میں استطاعت ہے آپ دونوں کو ٹکرا سکتے ہیں۔ علم کلام کا اتنا ہی فرض ہے شبلی حکیمانہ خیالات کے ساتھ پھر بھی مذاق مذہبی رکھتے ہیں اور "مولویت کو اپنی کسر شان نہیں سمجھتے،" اور انھوں نے جو کچھ لکھا ہے حمایت مذہب میں لکھا ہے لیکن اس پر بھی جہاں لائق متعلم سائنس کے اکتشافات عالیہ کے مقابلہ میں خالی الذہن ہو کر فلسفیانہ استدلال سے مذہب کی دھجیاں اڑا رہا ہے لکھنؤ کے ایک مشہور انشا پرداز شبلی کی مذہبی تحریرات سے عام سوءظن پیدا کرنا چاہتے ہیں، نہ جاننا بھی حرج کی بات ہے حضرت کو "اعتزال کی فکر ہے جس میں پھر بھی ایک مذہبی رنگ ہے۔ لیکن یہ معلوم نہیں کہ اس زمانہ میں سرے سے مذہب کی جان ہی کے لالے پڑے ہیں آج کسی مذہب آسمانی میں اتنی قوت نہیں کہ وہ منحرف سائنس کو زیر کر سکے۔

میں شعر العجم پر لکھتے لکھتے جانے کہاں سے کہاں بہک گیا۔ ان بے ربط خیالات کی تلافی اس وقت ہو رہے گی جب شبلی کے "تذکرہ شعرا" کا چوتھا حصہ شائع ہو رہے گا

جس کے لئے ابھی سے تیار رہے شبلی دنیا کی عام شاعری پر مفصل تنقید کی نظر ڈالیں گے
اور دکھائیں گے کہ فارسی شاعری ارتقائے ادبی کے لحاظ سے کیا درجہ رکھتی ہے یہ
بحث جس قدر دلچسپ ہے اس سے زیادہ مشکل ہے پروفیسر براؤن سا محقق بھی
اسے ٹال گیا۔ لیکن شبلی لکھیں گے اور اچھی طرح لکھیں گے۔

یہ چند سطریں ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے خوش ذائقہ بریانی کی جگہ ابالے
ہوئے سادے خشکے یعنی ماحضر کی حیثیت سے ہیں تاہم ادبی چاشنی سے خالی نہیں!
پر تکلف سامان انشاءاللہ آئندہ جس کے لئے ابھی سے وعدہ ہے۔

(مشرق - ۱۹۱۰ء)

فلسفۂ حسن و عشق

(یونانیوں کے نقطۂ خیال سے)

عورت کیا ہے؟ وہ دنیا میں کیوں آئی؟ اس کی ہستی کی علت غائی یعنی اس کا موضوع اصلی کیا ہے؟ یہ اور اس قسم کے بہتیرے سوالات ہیں جو ایک شائستہ دماغ کو متوجہ کر سکتے ہیں اور جن پر ہر زمانہ میں کچھ نہ کچھ غور ہوا ہے لیکن ان سب کا مختصر اور جامع جواب: یہ ہے کہ وہ محبت کی چیز ہے اور دنیا میں محض اسی لئے آئی"

محبت کیا ہے؟ ایک مقناطیسی کشش ہے! عورت بغیر چاہنے والے کے رہ نہیں سکتی اس کی نزاکت فطری چاہتی ہے کہ کسی کا سہارا ہو یعنی دو ایک ہو کر رہیں۔ جہاں یہ خود جان دینے کو تیار رہے، یہ چاہتی ہے کہ کوئی اس پر بھی مرتا ہو، دنیا میں یہ صرف محبت کے لئے آئی اور گلے کا ہار بنانے کے لئے پھولوں کی سیج پیا کی بہار دیکھئے کہ تھوڑی دیر کے لئے افکار دنیا بھلا کر رہتی ہے۔

عالم خیال عورت کی ایک وسیع دنیا ہے جہاں وہ اپنے جذبات کو فضائے بسیط میں چھوڑ دیتی ہے اور جو باتیں در اصل اسکو حاصل نہیں ہیں انکا بھی لطف اٹھا لیتی ہے، اس کی ساری زندگی حسن و عشق کا فسانہ ہے، وہ خود کسی پر مرتی ہو گی یا کوئی اس پر جان دیتا ہو گا! عورت پھنسی ذرا مشکل سے ہے لیکن جہاں پھنسی اس سے چھٹکارا

پسند نہیں کرتی اس کی اصلی غایت زندگی دوسرے کی پھانس ہے لیکن اسے معلوم
نہیں کہ جال ڈالنے سے پہلے وہ خود شکار ہو چکی ہے۔

عورت کتنی ہی پاکیزہ وش ہو اس خیال سے خالی نہیں ہوتی کہ کوئی اسکی کافرادائی کا
شیدائی ہو' اس کی "فتوحات" اس کا سرمایہ نشاط ہیں جن سے اس کے دل کو راحت
ملتی ہے اور جن سے وہ جیتے جی کبھی دست بردار نہیں ہو سکتی " وہ وار کرکے رہے گی
کیونکہ یہ امر اس کی فطرت میں داخل ہے! شانہ سے آنچل خود نہ گرائے لیکن اگر اتفاق
سے گر جائے تو وہ دل میں خوش ہو گی۔ یہ اس کی فطرت کا راز ہے جسے وہی خوب سمجھتی ہے۔
دہرائے ہوئے آنچل میں در اصل اسے سینے کا ابھار غائب کرنا منظور نہیں بلکہ وہ
چاہتی ہے کہ اور نظر جما کر دیکھے! محرم کا جائزہ نظری ایک طرح کی داد حسن ہے جو
ہزار پارسائی کے ساتھ بھی وہ آپ سے لے کر رہے گی۔ اسی لئے جوانی کی آرائشوں میں
چھپی ہوئی چیز اسے دل سے پسند ہے جس میں یہ "ان سرکشوں" کو قید رکھتی ہے جنہیں
عورت کے "ارمان مجسم" کہیے!

"اے دو آتشہ" وہ بھی شباب کی جب کھینچ کھینچا کر قدرتی کنٹرول میں بھری ہو تو
کون ہے جو ان کیف مستی اور بیخودی کے مجسموں کی "پرستش کا دلدادہ نہ ہوگا! ترکیب
عناصر ہی تو ہے" ذرا فطرت" کی شوخی دیکھیے گا! فتنہ قیامت زا کے لئے
گنجائش نکالی بھی تو کہاں؟

دنیا میں معیار حسن ہمیشہ مختلف رہا ہے اور آج بھی اختلاف مذاق کے لحاظ
سے حسن کے لئے کوئی نصاب مشترک قائم نہ ہو سکا تاہم ہر زمانہ میں عورت کا مقیاس
الشباب دائرہ حسن کا مرکز عام رہا ہے آج تک سننے میں نہیں آیا کہ اہل چین کی چپٹی ناک کی طرح

"سپاٹ" سینہ بھی کہیں پسند طبائع ہے۔

موجودہ قیصر جرمنی کو اپنی غیر معمولی شخصیت کیساتھ بھی عورت کی شہنشاہی کے آگے جھکنا پڑا آپ صنف نازک کے سائق ہیں، لیکن اس کے جو خوبصورت ہاتھوں کے ساتھ ابھرا ہوا، اور قائم بالذات سینہ رکھتی ہو۔

اسی لیے حکماء مجرد حسن کے اس زور دار تموج کو بہترین عطیہ فطرت کہتے ہیں۔ آپ نسائیت کا اصلی زیور کہیے اس میں کالی، گوری کی تخصیص نہیں کوئی ہو کہیں ہو صرف جمانی کے آلہ "حرب" سے اچھی طرح مسلح ہونے کی ضرورت ہے پھر تو اسکے "فتوحات" کے لیے فضائے کائنات بھی کافی نہیں، دنیا اسکے قدموں کے نیچے ہوگی۔

عورت مرد کے مقابلہ میں زیادہ باکیف ہوتی ہے، اور جن نزاکتوں کی طرف مرد کا ذہن بھی منتقل نہیں ہوتا۔ یہ ان کو سمجھتی بوجھتی اور قوت فعل میں لانا چاہتی ہے جیسے جیسا کسی خوبصورت عورت کی پرستش کا موقع ملے تو سمجھیے خدا جانے دنیا میں وہ چیز دی جو بڑے سے بڑے زاہدوں کو عمر بسر کرتے کے بعد بھی نصیب نہیں بہشت کا بھی وعدہ ہے چاہنے والی عورت سے بڑھ کر جو پاکباز ہو دنیا میں کوئی چیز نہیں لیکن قابو میں لانے کے بعد یہ ایک سکنڈ کے لیے چھوڑنے کے لائق نہیں۔

وہ انتہا درجہ کی حساس اور نازک مزاج بھی ہوتی ہے، دنیا میں اس سے کسی سے بیر ہے تو چاہنے والے سے ڈوپٹہ میلا ہے تو سمجھ لیجیے چاہنے والے کا قصور ہے عورت کہتی یہی ہے کہ ان ہی کو پروا نہیں تو بدلیں کس کے لئے! وہ خوش ہیں۔ تو بات بات میں بانکپن دیکھ لیجیے کنگھی چوٹی کا درد سر اسی وقت بھلا معلوم ہوتا ہے جب دل سے دل ملا ہوا ور اسی کی مانگ ہو! عورت کے بناؤ سنگار یعنی آرائش کی چھوٹی چھوٹی

باتیں اس کے دل کی حالت کی غمازی ہوتی ہیں کسی نے آنکھ بدلی اور یہاں صورت بگڑ گئی وہاں دلداری ہے تو ادھر بھی دل آرائی دیکھ لیجیے۔ محرم کے بند اگر کھینچ کر بندھے ہوں تو سمجھ لیجیے "زد" پر کوئی ہے، جس کے لئے یہ سینے کو دہرے پایہ پر رکھنا چاہتی ہے"!

حسین عورت کے لئے رکھینی لازمی نہیں کہ چڑھتی دوپہر سے ڈھلتی چھاؤں زیادہ خوشگوار ہوتی ہے فلسفہ حسن وعشق کا یہ نہایت باریک نکتہ ہے جو لائق غور ہے عورت وہی باکیف ہوگی جو لذت آشنا ہو۔ اور حسین میں لذت احساس کامل ہو یہ عالم فطرت کی نیرنگیاں ہیں شراب کی طرح کہ جتنی پرانی ہو مزیدار ہوتی ہے عورت کی عمر کا وہ حصہ جو تیز روشنی کی جگہ تاروں کی چھاؤں یا پچھلے پہر کی چاندنی سے مشابہ ہے جان دے دینے کے لائق ہوتا ہے، ۲۵، ۲۶ برس کی حسین عورت جو صورت کے ساتھ حسن سیرت بھی رکھتی ہو اور جس میں نسائیت کوٹ کوٹ کر بھری ہو انسانی تخیل کا بہترین مرقع ہے۔

عورت باعتبار جذبات ایک خوبصورت گلدستہ ہے جس کی ساخت میں نہایت نازک پھول پتیاں صرف ہوئی ہیں جس طرح پھول کی پتیوں میں نازک رگیں نفیس اور باریک نقش و نگار ہوتے ہیں۔ عورت کا دل و دماغ بھی ہر طرح کی لطافتوں اور نزاکتوں کا مخزن ہوتا ہے جس کے بیل بوٹے قدرت کی بہترین نقاشی ہیں ان میں باریک حسیات اور جذبات کا ابھارنا اور ان کے نشو و ارتقائے تدریجی کے سلسلہ کو قائم رکھنا چاہنے والے کا اصل فرض ہے۔

عورت ہماری زندگی کے ہر صیغہ کو مس کرنا چاہتی ہے وہ ہماری عقلی اور

اخلاقی قوتوں کی حرکت میں لاتی ہے لیکن ایک شائستہ عورت پر وہی قابو حاصل کر سکتا ہے جس میں عورت کے فطری اوصاف کے مقابلہ کی قابلیت موجود ہے جسکے قوی تر جذبات عورت کی قدرتی نزاکتوں اور لطافتوں سے ہم آغوش ہو سکیں۔

اس کے خیال میں صرف آرزوئے "وصل" جس پر ہمارے شعرا سر دھنتے ہیں۔ نری حیوانیت ہے، وہ خوش عیشی" کے مقابلہ میں فلسفہ "ناکامی" میں کہیں زیادہ لذت پائی ہے جو اس کے نازک سے نازک جذبات اور حسیات کو تحریک میں لائے عورت کی ایک آہ جو دل سے نکلی ہو، ہزار صوفیانہ ریاض د اعمال پر بھاری ہے جسمیں شائبہ خلوص ہو۔

یہ دنیا میں فطرت کی تکمیل کے لیے آئی اور اسی لئے مہذب دنیا میں اسے انسان کا "نصف بہتر حصہ" کہتے ہیں، محبت دلسوزی، خلوص وہمدردی اس کا خاصہ فطری ہے، یہ جہاں ہماری خوش دلی کو بڑھاتی ہے رنج وغم کو بانٹ لیتی ہے صحت میں یہ رفیق زندگی، علالت میں خوش سلیقہ دایا اور موت کے بعد ہماری خوبصورت سوگوار ہے جس کی ہیر اتموانی کلائی میں پھنسی ہوئی سیاہ چوڑیاں اور کھلے ہوئے لمبے بال وہ علامات ماتم ہیں جنھیں جیتے جی دیکھنے کو دل چاہتا ہے

آہ عورت! فسانہ زندگی ہے تو جس طرح ایک جھونپڑے کو اپنی صاف شفاف ہستی سے شش محل بنا سکتی ہے بڑے سے بڑے ایوان عیش کی تکمیل اس وقت تک ممکن نہیں جب تک تیری موجودگی کے آثار اس میں نہ پائے جائیں!

اس کے لیے چھڑوں کی جھنکار ضروری نہیں، محض تیرا ایس پردہ ہونا کہیں ہو کسی کے لیے ہو کافی ہے! شیکسپیر نے سچ کہا ہے کہ تو مجسم عشوہ گری ہے اور دنیا میں بے فوج کی سلطنت تیرا اور صرف تیرا حصہ ہے!"

یہاں تک تو "حسن" اور اس کے لطیف تعلقات پر شاعرانہ نکتہ سنجیاں تھیں لیکن مجھے دیکھنا ہے کہ عشق کیا چیز ہے حکما کی رائے کے مطابق یہ ایک جوہر وجدانی ہے انسانی اجسام، انسانی حافظے، انسانی خواہشات فنا ہو جائیں گی۔ لیکن یہ جوہر غیر فانی یعنی عشق ہمیشہ باقی رہنے والی چیز ہے۔

"تصوف" صرف مذہب عشق ہے، آپ فرط سنجیدگی سے "حقیقت" کے پیچھے پڑے اور چلے آئے تھے، ستر، اسی برس کے ریاضیات و مجاہدات کے بعد بھی کورے گئے! میں نے آنکھ کھولی تو کچھ نہ دیکھ سکا اس لیے آپ کی اصطلاح میں صرف "عشق مجازی" سے غرض رکھی یعنی اپنا "معبود" خود پیدا کر لیا اور تھوڑی سی عمر جو لے کر آیا تھا اس خیال میں گزار دی۔

خدا اسر دے تو سودا دے تری زلف پریشاں کا
جو آنکھیں ہوں تو نظارہ ہو ایسے شبستاں کا

گوشوارہ پر آپ دیکھیں گے میرا پاکیزہ تخیل بڑے بڑے زاہدوں کے صعوبات لاطائل سے کتنا اچھا رہا وہ عمر بھر روتے رہے اور روتے گئے اور میں نے ہنستے کھیلتے دن کاٹ دیئے!

یہ فقرہ معترضہ تھا اہل سائنس کا خیال ہے کہ عشق چاہنے والوں میں سے کسی کا اختیار نہیں بلکہ ایک جذبۂ اضطراری ہے جو گذشتہ زمانہ کے ہزارہا میلان طبائع نے میراثۃً ہمارے لیے چھوڑا ہے۔ ہم کسی عورت کو اس لیے نہیں چاہتے کہ وہ نازنین ہے پیکر ہے، خوش ادائی اور دلفریبی میں آپ اپنی نظیر ہے بلکہ وہ ہمارے دائرہ پرستش کا مرکز اس لیے بنی ہوئی ہے کہ وہ ایک ناقابل بیان طریقہ سے جنس مقابل یعنی مرد کیلئے

ایک ایسا نغمہ مستانہ "چھیڑتی ہے جسے مرد ہی خوب سمجھتا ہے اور جو ہماری
زندگی کے جوہر خالص یعنی روح کو ان طبقات بالا تک پہنچاتا ہے جہاں خیال کے
سوا کسی چیز کی رسائی نہیں! یہ بحث نہایت دلچسپ ہے! لیکن مستقلاً اظہار خیال چاہتی
ہے یہاں اس کے چھیڑنے کی گنجائش نہیں پھر کبھی دیکھیے گا سر دست ایک مغربی
شاعر کے خیالات سنیئے جو جذبات میں ڈوبا ہوا ہے اور اپنی معشوقہ یعنی اپنی بیوی کے
فراق میں یوں اظہار خیال کر رہا ہے۔

رات کا پچھلا پہر اور دل ہی دل میں کچھ باتیں"

میری ہستی کے ثبات کا سب سے بڑا کارنامہ تیری محبت پر قابو حاصل کرنا تھا
یہ اگر نہ ہوتا تو تو یقیناً غیر مفتوح ہستی یعنی کسی کے بس میں آنے والی نہیں تھی لیکن
دنیا کی کوئی قوت جیتے جی تجھ کو مجھ سے چھڑا سکتی ہے؟ پھر یہ علیحدگی کیسی؟ دلدادگی
استغراق فنا مذہب عشق کی صرف اصطلاحات ہیں، میں تو تجھ میں اس طرح تحلیل
ہو گیا ہوں کہ وجود ذاتی کا سرے سے پتہ نہیں! آخر کیوں؟ کیا تیرا دلفریب حسن،
تیری کافر ادائیاں اس کا باعث ہیں؟ نہیں! تو عشق مجسم ہے! تو مستی شباب کے سوا
جذبات میں اس طرح ڈوبی ہوئی ہے کہ تیری غایت زندگی صرف محبت ہے اور کچھ نہیں!
ہاں تو نے عشق کی کاٹ عشق سے کی اور میں مقابلہ میں ٹھہر نہ سکا یعنی بازی
ہار دی! ہائے کتنی دلچسپ فتح ہے! لیکن آخر مجھے اپنی شکست پر ناز کیوں ہے؟ اس لئے
کہ یہ شکست "دنیا کے اولوالعزموں کے حصے میں کبھی نہیں آئی آرزوئیں اور قصے ہی
رہے! مطلوب کا ملنا دوسری دنیا کے لئے اٹھا رکھا گیا" یہ خیال کہ تو مجھے چاہتی ہے
جان دینے کے لئے کافی ہے!

مجھ کو پایا کرتا ہے۔ تھا کہ بیقراری کچھ کم ہوتی لیکن یہ کیسا روگ ہے جو کسی طرح پنپنے
نہیں دیتا میں دیکھتا ہوں کسی طرح چین نہیں، خاصکر آج کل کی جدائی جلائے جان ہو رہی ہے۔
عرب کی جوشیلی عورت اپنے عاشق سے جدا رہنا پسند نہیں کرتی یعنی وہ فطرتاً ہم آغوشی
وہمبستری کی شایق ہوتی ہے! میری پیاری کیا کم تم پر جوش ہوا تیری رگ رگ میں
کوٹ کوٹ کر بجلی بھری ہے' یہ تیری دبی ہوئی چنگاریاں تھیں جن سے میری زندگی
کی بجھی ہوئی حرارت دبی ہوتی تھی!

پیاسے کو انگاروں پر لٹانا جب چند قطروں سے پیاس بجھتی ہو! یہی شرط وفا ہے؟
تو نے کیوں! مجھے وہ گر سکھائے جن سے آج تک نا آشنا سا رہا تو نے میری ایک سوئی ہوئی قوت
کو جو حاسۂ انسانی میں سب سے زیادہ لطیف دشیریں ہے چھینٹے دے دیکر جگایا یا تیری تطبیق عصابی
اور انگوٹھی پہننگ کی سی موزونیت تیری نفاست اور پاکیزگی فطرت کا ایک لازمہ ہے! سچ
یہ ہے کہ تو یونانیوں کی محض "زہرہ عریاں" نہیں بلکہ حسن وعشق کی مشترک دیوی ہے
جوانانہ خوش فعلیاں ان دنوں خواب خیال ہو رہی ہیں جب سے تو چھوٹی زندگی وہ نہیں رہی!
میری خاک اک دن خاک ہو کر رہے گی لیکن وہ جوہر غیر فانی یعنی تیرا عشق میری یاد دلاتا رہے گا۔
لیکن قبل اسکے کہ یہ صورت پیش آئے آ کر مجھے گلے لگا لے زندگی تو آج کا نام ہے کل
اختیاری نہیں! تیرے ساتھ کے چند گھنٹے ہزار زندگیوں کے برابر ہیں دیکھ! میری عمر کا
بڑھانا تیرے لئے کتنا آسان ہے کیسی مجبوری اور کہاں کا دکھ رکھاؤ! جس کوچہ میں تو نے
قدم رکھا ہے وہاں تیسرے کا گذر نہیں! ان ڈھکوسلوں سے کیا واسطہ؟ عشق کا
فتویٰ تو یہ ہے کہ دو کے سوا تمام دنیا حرف غلط!

(نقاد۔ سنہ ۱۹۱۳ء)

ملک میں تاریخ کا معلّم اوّل

یعنی

شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی

یورپ کے قلمرو میں ایک زندہ دل طبقہ ایسا بھی ہے جو انسان کی دماغی یعنی کتابوں کو علمی حرم" کی حیثیت سے دیکھتا ہے اور ان کا دلدادہ ہے اس کے خیال میں کسی کتب خانہ کا ایک گوشہ جہاں اس کی منظور نظر" نازنینوں کا جھرمٹ ہو اور جو ہمیشہ اس کی فرصت اور مرضی کی منتظر رہتی ہوں، اس شاہی محل سے ہی بڑھ کر ہے جس کے لوازم عیش صرف دور سے دیکھنے کی چیز ہیں بہر حال ایک ایسا گروہ موجود ہے جو علمی دنیا میں درجہ استغراق رکھتا ہے اور زمانہ کے سرد و گرم سے قطعًا بے پرواہ ہے اس کا دائرہ محض خود ایک دنیا ہے۔ جہاں ایسے سامان کی کمی نہیں جس سے قوت احساس ہر طرح کی لذت و انبساط حاصل کرتی رہتی ہے اسی حلقہ میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کی نفاست اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ وہ معمولی مطبوعات کو پسند نہیں کرتے خاص خاص تصنیفات کے قیمتی ایڈیشن شائع کیے جاتے ہیں۔

ہندوستان میں اس قسم کے معزز شواہد بمشکل پیش کیے جا سکتے ہیں لیکن طبقہ اعلیٰ کے مصنفین علامہ شبلی کی تصنیفات کو یہ امتیاز حاصل ہے جو

حسن سیرت کے ساتھ صورت کی بھی اچھی ہوتی ہیں۔ قاعدہ یہ ہے کہ لفافہ اچھا ہو تو ملفوف کو اس سے کہیں زیادہ اچھا ہونا چاہیئے۔

علامہ شبلی اپنے موضوع سخن اور اس لحاظ سے کہ انھوں نے اپنے ملکہ راسخہ یعنی فطری قوت تصنیف سے وہی کام لیا جو ان کے دل و دماغ کا اچھے سے اچھا مصرف ہو سکتا ہے۔ ملک کے مصنفین میں یہ سرفہرست تو تھے ہی، میں دیکھتا ہوں اب بہت آگے نکلے جاتے ہیں، انھوں نے فلسفہ تاریخ کو صرف اس لحاظ سے کہ وقت کی چیز ہے اپنا خاص فن قرار دیا اور ترتیباً جس پیمانہ پر یہ اظہار خیال کرتے رہے وہ ایک منحرف بھی تسلیم کرے گا کہ ان کی قوتوں کا صحیح سے صحیح استعمال تھا جو خیال میں آسکتا ہے ملک کے اچھے لکھنے والوں میں "قوتِ فیصلہ" کی ہمیشہ کمی رہی یعنی دماغوں میں اقتضائے وقت کی رعایت نہیں، وقت ہی آگے چل کر بتائے گا کہ ان کے نتائج فکر ایک طرح کی خود رو پیداوار ہیں، جن کی شادابی صرف ایک موسمی چیز ہے، لیکن علامہ شبلی سے ہم کو اس قسم کی شکایت نہیں، یہ بلا بار تحدید و فرمائش جو کچھ کرتے رہتے ہیں وہ ہمارے متوقعات اور استحقاق سے کہیں زیادہ ہے، حالتوں کا موازنہ آج کل کے عوائد رسمیہ (یعنی ایٹی کیٹ) کو دیکھتے خلاف شائستگی سمجھا جاتا ہے، تاہم یہ تنقید کا ایک ضروری عنصر ہے لیکن میں اس وقت ان کو ان کے دائرہ کے دوسرے خلاقین سخن سے ٹکرانا نہیں چاہتا صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ جس طرح یہ اپنے حلقہ میں غالباً سب سے کم عمر مصنف ہیں، ادبی حیثیت سے نسبتہً اتنے ہی بڑھے ہوئے ہیں اس دماغی فوقیت کا راز صرف یہ ہے کہ خوش نصیب شبلی نے اپنی وہبی اور اکتسابی قوتوں کی رعایت سے جو وسیع موضوع بحث اختیار کیا وہ بلا استثناء اوروں کی دسترس سے باہر تھا اس سے زیادہ موزونیت لائق رشک ہے (تو قو) تمام ان کے ہر حصہ تصنیف کا

ایک خاصہ ہوتی ہے، اسلامی تاریخ لٹریچر فلسفہ واعتقاد سے متعلق جس قدر مواد دیکھا کرسکے
قدیم تاریخ کا نچوڑ ہے۔

تاریخ اسلامی کی نسبت ایک زمانہ میں یورپ نے جس قدر متعصبانہ رائے قائم کی تھی، اب رفتہ رفتہ ان سے دست بردار ہوتا جاتا ہے موجودہ دور میں جو ہر قسم کی دماغی ترقیات کا دور ہے۔ واقعات کا ایک خاص معیار صداقت قائم ہوگیا ہے ہر واقعہ کی جانچ اجتماعی، اخلاقی، اور فلسفیانہ حیثیت سے کی جاتی ہے چنانچہ علمائے مستشرقین کی توجہ سے جدید سلسلۂ اکتشافات میں ایک نیا لٹریچر پیدا ہوگیا ہے جس میں ہمدردانہ التفات کے ساتھ ایک طرح کی سنجیدگی اور بلند نظری پائی جاتی ہے، لیکن باوصف اس حسن ظن کے جو جماعت مستشرقین کی طرف سے پیدا ہو چلا ہے۔[1] ان کے خیالات کا بیشتر حصہ نظر ثانی چاہتا ہے اس قسم کی مثالیں کم نہیں ہیں جن میں مغربی علماء کی اجتہادی لغزشیں اب بھی محسوس ہوتی ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ استخراج نتائج میں عمداً بے پروائی سے کام لیا گیا ہے لیکن علامہ شبلی نے ہم کو غیروں سے قریب قریب بے نیاز کردیا ہے۔ یہ جس طرح قدیم تاریخ اور لٹریچر کے جامع ہیں آج کل کے فلسفیانہ انتقادات اور نکتہ سنجیوں سے آشنا ہی نہیں بلکہ یہ مذاق ان میں اس قدر رچا ہوا ہے کہ ان کے طے کردہ مسائل جو دنیا کے سامنے پیش کئے ہیں اس حد تک کامل ہیں کہ زمانہ آئندہ بلکہ بعید آئندہ میں بھی ان پر کوئی معتدبہ اضافہ نہ ہوسکے گا اسی طرح ان کے اجتہادات کا جن کو تاریخی

---

[1] دیکھئے یورپ کے مورخین ہنان کریمر کی تصنیف مختص الموضوع جس میں دکھایا ہے کہ اسلام اپنی ترکیب و ساخت کیلئے مذاہب ما سبق کا ممنون ہی نہیں بلکہ ادیان سابقہ کی صرف ایک ارتقائی صورت ہے

"الہامات" کہیے۔ بیشتر حصہ میرا خیال ہے مدتوں متروک ہونے کے لائق نہیں ہوگا۔ اس سے زیادہ شبلی کے غیر فانی ہونے کا ثبوت کیا ہوگا۔

اگر موجودہ نسل کے لیئے دماغی اور عقلی ترقی کے ساتھ اخلاقی تکمیل کی بھی ضرورت ہے تو میں خیال کرتا ہوں کہ شبلی نے تاریخی سلسلہ میں جس قدر مذہبی لٹریچر پیدا کر دیا ہے وہ ہمارے لئے کافی سے زیادہ ہے خاص کر اس جدت کے لحاظ سے فاضل شبلی نے ایک طرف تو "بڑے میاں" یعنی مذہب کی پگڑی نہیں اتاری اور ساتھ ہی یورپ کے نوخیز چلبلے پرزوں یعنی فلسفہ و سائنس کے سامنے تیرہ سو برس کے بوڑھے سے ہاتھ نہیں جڑوائے بلکہ دونوں میں مصافحہ کرا دیا۔ یہ معتدل روش جو اس "ادبی نزاع" میں اختیار کی گئی ہے لائق رشک شبلی ہی کا حصہ ہے جو ہمارے متفق علیہ پیشوائے علمی ہیں ان کی ثقاہت نے جہاں مذہب کی حق تلفی نہیں ہونے دی، سائنس و فلسفہ کی مغائرت بھی دور کر دی اور ان کو مذہب کا دست و بازو بنا دیا ہے آئندہ زمانے میں جب ہماری عقلی ترقیات کا شباب ہوگا شبلی کو اپنے مساعی جمیلہ کی پوری داد ملے گی تاہم آج کل کا تعلیم یافتہ طبقہ جو عموماً مذہب سے بے پرواہ ہے۔ مذہب فطری یعنی حکیمانہ اسلام سے دست بردار نہ ہو سکے گا۔ معقول و منقول کی تطبیق کی غایت اس کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے جو شبلی کی دوسری بجائے خود ایک قیمتی صلہ ہے۔

ملک کے روشن خیال طبقہ میں کہیں کہیں ایک طرح کے حکیمانہ "تذبذب فی المذاہب" (یعنی ایگناسٹک خیالات) کی جھلک پائی جاتی ہے، اسلئے شبلی کی "تنقیدات عالیہ" (ہائر کریٹی سزم) کو وہ حمایت مذہب میں چنداں

وقیع نہیں سمجھا، لیکن اس کو یاد رکھنا چاہیے کہ یہ کوئی نئی اپج نہیں ہے شبلی سے اگر غلطی ہوئی تو صرف اس قدر کہ انھوں نے مذہب کو آج کل کے عقلیات سے ٹکرایا، یہ غلطی اس سے پہلے بھی جب مسلمانوں کے دن اچھے تھے، ہو چکی ہے اور علم کلام کو عباسی دور کی دماغی ترقیات کے لحاظ سے "یادایام" سمجھیے جو عقائد اسلام اور فلسفۂ قدیم کے گذشتہ اختلاط کی ادبی تاریخ ہے لیکن اس زمانے میں اسلام کو صرف فلسفہ یعنی ایک حد تک محض اصولِ نظری سے سابقہ تھا اس لیے جس طرح لحاف کی تیاری میں کچھ استر سے لیا کچھ ابرے سے اور دونوں کا جھول جھال لے کر برابر کر دیا، دونوں حریف جو چھری کٹاری ہو رہے تھے گلے ملوا دیئے لیکن آج مذہب کو اپنے دشمن ازلی یعنی سائنس کا مقابلہ کرنا ہے جو قوی تر حریف ہے جو اپنے سوا دنیا میں کسی کو دیکھنا نہیں چاہتا۔

مذہب کے اولیات کا انحصار کلیتہً امور غیر مادّی یعنی ایسی چیزوں پر ہے جو مدرکاتِ انسانی سے باہر ہیں یعنی ہمارے حواس فطری ان کے سمجھنے بوجھنے سے عاری ہیں اور سائنس صرف مادّیت سے غرض رکھتا بلکہ اس کا دعویٰ ہے کہ "عالم غیر" کا سرے سے وجود ہی نہیں ہے جس پہ ہم آپ اس قدر مٹے ہوئے ہیں! بہر حال فلسفہ پھر بھی اتنا بُرا نہیں کہ "سنی سنائی" کبھی کبھی مان لیتا ہے لیکن سائنس اتنا کٹر ہے کہ جب تک "آنکھوں دیکھی" نہ ہو ہزار کہیے کتنے ہی بڑے بڑے جبہ و دستار پیش کیجیے! مذہب کی دہائی دیجیے ایک نہیں سنتا، ظاہر ہے کہ اتنا بڑا کافر بر خود غلط! کسی شریعت سہلہ کی

گرفت میں کہاں تک آ سکتا ہے۔ لیکن کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ ہم مذہب سے
عموماً دست بردار ہو جائیں؟ اس کا فیصلہ میں انسان کی اگلی پچھلی اخلاقی تاریخ پر
چھوڑتا ہوں جس کی تکمیل کی نسبت خود فلسفہ کا یہ دعویٰ ہے کہ بغیر مذہب کے ہو ہی
نہیں سکتی شبلی نے الکلام میں نفس موضوع کے لحاظ سے جس پیمانہ پر اظہار خیال
کیا اس کے سوا چارہ کار ہی کیا تھا آپ کسی کے ہاتھ پر بیعت کرنی چاہیں تو
پہلے ضرورت ہے کہ بڑے میاں سے آپ کو حسن ظن بھی ہو یہ نہیں کہ ایک دم سے
بگڑی آ ناسی اور دعویٰ یہ کہ ہم آپ کے سچے عقیدت کیش ہیں فرط خلوص سے
لگی لپٹی نہیں رکھتے۔

طبائع انسانی کے لیئے اگر مذہب کی ضرورت ہے تو اس کے مسلمات
اعتقادگا جسے ایک طرح کی مجبوری کہیے تسلیم کرنے ہوں گے رہی معقول و منقول
کی تطبیق جہاں تک مذہب میں استطاعت ہے آپ دونوں کو ٹکرا سکتے ہیں
علم کلام کا اتنا ہی فرض ہے۔ شبلی حکیمانہ خیالات کے ساتھ گہرائی مذاق مذہبی
رکھتے ہیں، اور انہوں نے جو کچھ لکھا ہے حکمائے اسلام کی طرح متکلمانہ لکھا
ہے۔ اس پر بھی لکھنؤ کے ایک مشہور انشا پرداز فاضل عصر کی مذہبی تحریرات سے
عام سوء ظن پیدا کرنا چاہتے ہیں حضرت کو "اعتزال" کی فکر ہے جس میں
پھر بھی ایک مذہبی رنگ ہے لیکن یہ معلوم نہیں کہ اس زمانے میں جو سائنس
کے اکتشافات عالیہ کا دور ہے سرے سے مذہب کے جان ہی کے لالے
ہیں اور آج کسی مذہب آسمانی میں اتنی قوت نہیں کہ منحرف سائنس
کو زیر کر سکے۔

میں رو میں سلسلہ سے کسی قدر دور جا پڑا کہنا یہ تھا کہ اُردو لٹریچر کے پیدا کرنے والے تھوڑے ہیں، ان میں بھی تھوڑے ہی ایسے ہیں جو آج کل کے معیار قابلیت کے لحاظ سے اہل قلم کی صف اول میں شامل ہونے کے لائق ہوں۔ شبلیؒ بلحاظ فن میرا خیال ہے صرف ہندوستان نہیں بلکہ تمام اسلامی دنیا میں کسی سے دوسرے درجہ پہ نہیں ہیں اس کو میری قاصر النظری پہ محمول کیجئے فلسفہ تاریخ جو آج کل تمام علوم میں سر فہرست ہے ایک مستقل فن ہو گیا ہے اور اس قدر اہم ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے فاضل مورخانہ موشگافیوں کو بہترین مشغلہ ہستی سمجھتے ہیں، مصری اور ترکی لٹریچر میں تاریخی مذاق جس قدر موجود ہے ہم اس سے ناواقف نہیں ہیں لیکن جن مضامین پہ وہاں سرگرمی سے طبع آزمائیاں ہو رہی ہیں وہ شبلی کے ہاں دست فرسودہ اور مسائل ابتدائی ہیں جن کو فاضل مورخ کی سرسری جنبش قلم مدت ہوئی ایک سے زیادہ موقع پہ طے کر چکی ہے، سچ یہ ہے کہ شبلی بلحاظ جامعیت اور وسیع النظری اور تیز مورخانہ تدقیق اور کمال فن کی حیثیت سے آج یورپ کے بڑے سے بڑے مورخ سے پہلو بہ پہلو ہو سکتے ہیں۔ یورپ کو شکایت ہے کہ مسلمانوں میں متقدمین بلکہ متاخرین میں بھی کوئی شخص ایسا نہیں ہوا جسے صحیح معنوں میں اگر حفظ روایات سے قطع نظر کی جائے تو "مورخ" کہنا درست ہو یعنی استقصائے روایات کے

ؔ یہاں میری غرض تاریخی لٹریچر سے ہے ورنہ ادب اور معقولات پر سرسید کی قلمی فتوحات دراصل ان کی اولیات میں محسوب ہونے کے لائق ہیں جن سے ملک میں کوئی اہل قلم بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

سلسلہ میں جہاں اصلی ماخذوں کی چھان بین کی گئی غیر مرتب مواد سے کسی دور میں ایسے نتائج حاصل نہیں کئے گئے جن میں طبیعت انسانی کے اقتضاء زمانے کے ماحول اور خصائص طبیعی یا قرائن عقلی سے مدد لی گئی ہو۔

ابن خلدون کا نام بار بار لیا جاتا ہے جس نے تاریخ پر فلسفہ کا رنگ چڑھایا مگر خود اس کی تاریخ بتاتی ہے کہ اس کے خیالات قوت سے فعل میں نہ آسکے یہ بالکل صحیح ہے، لیکن آج ہم بیسویں صدی کے ایک فاضل مورخ کو پیش کرتے ہیں جس کا دائرہ معلومات اس قدر وسیع ہے کہ وہ اپنے سلسلہ تحقیقات میں صدیوں کی فروگذاشت کی تلافی کرتا جاتا ہے اور اگر وقت نے مہلت دی اور اس کا تخیل پورا ہو سکا تو تاریخ اسلامی کے مہمات مسائل ایک ایک کر کے طے کر دیئے جائیں گے۔

کہا جاتا ہے کہ دلی اور لکھنو کے گوشوں میں بہتیرے علمائے پڑے ہیں ممکن ہے لیکن کسی شخص کا دماغ دوسروں کے علوم وفنون سے بھرا ہوا اور خود اس میں تحقیق و اختراع کا مادہ نہ ہو تو ایک بیکار سی چیز ہے اسلئے ایک فلسفی کے خیال کے مطابق اصلی قابلیت صرف وہ مسائل یعنی طریقہ استعمال ہے جس سے مواد گذشتہ کار آمد بنایا جا سکے یہی تصرفات ہیں جن کی بنا پر ایک ادیب یا مورخ کو لائق سے لائق شخص پر جو صرف "جامع اللغات" ہو ترجیح فائقہ حاصل ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ ثرے الفاظ موخر الذکر کے کے ہاں کچھ زیادہ ہی ہوتے ہیں۔

انسانی احساسات و خیالات، تحقیقات و اختراعات کی مسلسل تاریخ

ہمارے سامنے موجود ہے، اور کارلائل کہتا ہے کہ جس شخص کو چھپے ہوئے حرفوں کا راز معلوم ہے وہ انھیں قوت آخذہ سے اپنا کر سکتا ہے، صرف صدائے اصلی کی تلاش کا ذوق صحیح ہونا چاہیئے وہاں شبلی فاضل شبلی "نقوشِ حرفی" کے رازدار ہیں انھوں نے اپنے ماخذوں کی چھان بین میں صرف "صدائے اصلی" سے غرض رکھی اور اپنے وسیع سلسلۂ تحقیقات میں زبردست قوت استقرائی کے ساتھ اسباب ونتائج کی تفریعات فلسفیانہ سے آج کل کے ترقی یافتہ مذاق کے مطابق اس طرح کام لے سکے جس سے ان کی آواز بازگشت تمام ملک میں گونج اٹھی اور ہند کے ادبی قلمرو میں ایک نیا تاریخی دور شروع ہوگیا۔

مختصر یہ کہ آج کل کے مصنفین میں علامہ شبلی کو ایک خاص امتیاز حاصل ہے جو ان کے اور ہم عصروں کے حصہ میں نہیں آیا ان کے سخت سے سخت حریفِ مقابل بھی ان کی تحقیقات کی گرد کو نہیں پہنچتے۔

نہ جاننا بھی مزے کی بات ہے اس لئے بعضوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئے گی لیکن ہندوستان کیا اور ممالک میں بھی دو چار سے زیادہ نہیں ہیں جو مذاقِ موجودہ کے مطابق مسائلِ قدیمہ کے طے کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں شبلی ہم میں پہلے شخص ہیں جنھوں نے تاریخ و فلسفہ میں ربط باہمی پیدا کیا اور ان جواہر عقلی کی تحلیل و ترکیب اس طرح کر سکے کہ لٹریچر میں ایک خاص امتزاج پیدا ہوگیا ہے جس کے آثار

ان کے مستقل سرمایہ تصنیفات کے سوا ان کے متفرق مضامین میں بھی ملتے ہیں جو مدتوں ان کے قلم کے سایہ میں مسلسل طور پر وقف عام ہوتے رہے۔

(نقاد۔ ستمبر ۱۹۱۳ء)

تنقیداتِ عالیہ

آج کل معیار فوقیت اس قدر بڑھ رہا ہے کہ جب تک کوئی کام اول درجہ کے پیمانہ پر نہ جاری کیا جائے چل نہیں سکتا۔ محمد علی آکسن نے جس قابلیت اور خوش سلیقگی سے کامریڈ نکالا میرے دعویٰ کے ثبوت میں ہے۔ قوم کے ہاتھ میں انگریزی اخبار ہی کتنے ہیں لیکن جتنے ہیں ان میں ایک بھی نہیں جو کامریڈ کی گرد کو پہونچ سکے ایڈیٹر کی زبردست شخصیت نے پرچہ کو ادبیات اور سیاسیات کا مخزن بنا رکھا ہے۔

زبان تو محمد علی کی گویا "مغربی کنیز" ہے جسے وہ ولایت سے ساتھ لگا لائے لیکن مسائلِ عصریہ پر جب نفاست اور آزادی سے یہ لکھتے رہتے ہیں ان کا حصہ ہے موجودہ دورِ حریت میں جہاں تک جائز مطالبات کا تعلق ہے رُک رُک کر قدم اٹھانا جس طرح ایک اخلاقی کمزوری ہے اسی طرح یہ بھی ٹھیک نہیں کہ بات بات پر جامہ سے باہر ہو رہتے ہیں۔ اور جب دیکھئے آواز کی جگہ منہ سے کف نکل رہا ہے کامریڈ نے دو طرفہ کشمکش سے علیحدہ ہو کر جو مستقل روش اختیار کی ہے وہ دراصل اسکے ادبیات میں داخل ہونے کے لائق ہے۔ اس کی تنقیدات خاص کر طنزیات لٹریچر کی جان ہوتی ہیں، یہ تو معلوم ہے کہ ایڈیٹر انگریز نہیں ہے لیکن سمجھ میں نہیں آتا عربوں کی اصطلاح میں ایک "عجمی" زبان غیر پر کیونکر اس حد تک قادر ہو سکا۔

جس طرح متقدمین کے کلیات میں ہزلیات کا بھی کچھ نہ کچھ حصہ ہوتا تھا۔ کامریڈ نے موقت لٹریچر میں "گپ" کے لئے گنجائش نکالی ہے جیسے میں "مطائبات ادب کہوں گا۔ یہ حصہ اس قدر بلیغ اور دلچسپ ہوتا ہے جس کا اندازہ قدر افزایان سخن ہی کر سکتے ہیں جنہوں نے کسی یونیورسٹی میں صرف مروجہ ڈگری نہیں حاصل کی ہے بلکہ انگریزی لٹریچر کا مذاقِ صحیح بھی رکھتے ہیں۔

میں کامریڈ کے ان معرکۃ الآرا افکار ناموں کو سردست گنانا نہیں چاہتا جن کے مخلصانہ اعتراف کے لیئے ہم کو ملک سے باہر کالے کوسوں جانا پڑے گا۔ اور جو رعایت شہرت سے محتاج بیان نہیں ہیں، یہاں میں محمد علی کی معربیت" کے الثانی ثمرے یعنی "ہمدرد" پر نظر ڈالنا چاہتا ہوں جس نے حال ہی میں دنیا میں قدم رکھا ہے۔

میں کہہ چکا ہوں صرف اول درجہ کی حرکت آجکل کامیاب ہو سکتی ہے محمد علی نے اخباری دنیا کی عام رفتار سے الگ تھلگ "بیروت کے ٹائپ میں" ہمدرد" کو چھاپ کر چھوڑا، اس کے لیئے ان کو جس قدر مشکلات پیش آتی ہوں گی ان کا دل ہی جانتا ہو گا یہ ٹائپ نہایت خوش سواد اور کثیر الزدایا ہے۔ اور مروجہ معمولی ٹائپ کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے اس کے پڑھنے میں بالکل دقت نہیں ہوتی۔ اگر ہو سکتی ہے تو صرف ان لوگوں کو جن کی نگاہیں سرے سے ٹائپ سے مانوس نہیں ہیں۔

جس طرح سانولی صورت جس میں نمک ہو دیسی مذاق ہے۔ رنگ گورا چٹا ہونا چاہیے۔ میں "ہمدرد" کو اس لیئے پسند کرتا ہوں کہ یہ اپنی سج دھج اور خوش وضعی کے لحاظ ملک میں بھی اوروں سے مختلف ہے۔ یہی امتیاز اس کی روح رواں ہے جس سے وہ کسی طرح معمولی میں نہیں آتا، ہم کو پنجاب کے قابل نفرت تاجرانہ لٹریچر کی بھرمار سے

ایک طرح کا امتلائے ادبی "پیدا ہو چلا تھا۔ لیکن "ہمدرد" کا جلوہ کافوری طبیعت کے ٹھہرنے کا سبب ہو گیا۔ اردو اخبار اتنا تو ہو کہ میز پر رکھتے ہوئے شرم نہ آئے۔ لکیات میں ڈال دینے کے لائق جو پیکنگ کے کام بھی نہیں آسکتے یوں تو بہتیرے ہیں۔ تو "ہمدرد" کی مادیت ہوئی جس میں "الہلال" کے سوا وہ کسی سے دوم درجہ نہیں ہے۔ غیر مادی یعنی "ادبی حیثیت سے وہ ایسے اچھے پرچوں سے آگے نکلتا معلوم ہوتا ہے۔ "اتحاد" "ایسا قابل لائق" پر وہ جو کچھ لکھ رہا ہے سیاسی لٹریچر کے انتقادیات عالیہ میں داخل ہونے کے لائق ہے۔ اس کا ایک عنوان یعنی "برقیات" اس کی کافی ضمانت ہے کہ وہ اپنے مذاق تحریر میں مصر کے اعلیٰ درجہ کے اخباروں کے سوا کسی کو لائق تتبع نہیں سمجھتا۔

آج کل سیاسیات پر قلم آزمائی کے لئے جہاں کسی مغربی زبان کی واقفیت لازمی ہے۔ اردو میں ادائے خیال اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ مصری لٹریچر کی اصطلاحات اور اس کی خوش ترکیبوں سے مدد نہ لی جائے۔ اردو اخبار اور موقت رسائل صرف اس وجہ سے دوم درجہ کے معیار کو چھوڑ نہیں سکتے کہ ان غریبوں کے پاس جہاں ذاتی سرمایہ معلومات نہیں، یہ قابلیت بھی نہیں کہ مصر کے سنجیدہ لٹریچر سے کچھ استفادہ کر سکیں، نری باتیں، روزمرہ اور محاورہ کی نزاکتیں اگر ہوں بھی تو آخر کہاں تک؟ ایک تشنہ ادب چند قطرات آب سے کہاں تک سیر ہو سکتا ہے جب اس کے لئے ایک ایسے چشمہ جاریہ کی ضرورت ہے جس میں عمق کے ساتھ وسعت بھی ہو۔ ہندوستان میں سب کچھ ہے یہی نہیں ہے جس سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہ پتھر کی ایک سل لیکر دنیا کی معلومات میں اضافہ کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔

بہر حال ہم کو "ہمدرد" سے بہت کچھ توقعات ہیں، اور ہم امید کرتے ہیں کہ وہ

اپنی امتیازی خصوصیت یہ رکھے گا کہ "الہلال" کی طرح ادبی حیثیت سے وہ ایک مصری پرچہ معلوم ہو۔

یہاں تک تو صرف شناسانہ اعتراف تھا۔ اب کچھ شکایتیں بھی سُن لیجئے!

(۱) دو صفحے کسی طرح کافی نہیں، مقررہ قالب اسے جلد اختیار کرنا چاہیئے۔

(۲) کاغذ بالکل گھاس کا معلوم ہوتا ہے جہاں سے موڑیئے نکل جائے گا اسے کم سے کم "الہلال" کا سا ہونا تھا۔ سفید تر، چکنا اور نہایت مضبوط اسر وقد تقطیع کا مربد سے بھی کچھ نکلی ہوتی ہے۔ حالانکہ ضرورت نہیں تھی۔

(۳) یائے معروف و مجہول میں لازماً فرق ہونا چاہیئے۔ ٹائپ میں یہ خلط مبحث گراں گذرتا ہے۔

(۴) ایک پرچہ میں یوں چھپا تھا "جس کی ساخت قوت والے امرا کے اجتماع سے بنی تھی"۔ "ساخت" کے ساتھ "ہونا چاہیئے تھا۔ کمپوز کرنے والوں کی غلطی ہے لیکن اس سے زبان کے اعتبار میں فرق آتا ہے۔

(۵) "بے ذریعہ کی تار برقی خبریں" یہ ترکیب کچھ پسند نہ آئی مصر والے "لاسلکی" لکھتے ہیں۔ آپ اسے غیر مانوس سمجھتے ہیں تو "بے تار کی برقی خبریں" لکھیئے۔

میں "گو وہ اردو" سے گھبراتا ہوں۔ ایڈیٹر کو بھی اس کا خیال ہے اور یہی وجہ ہے کہ یا وصف اسکے کہ میں نے "ہمدرد" کے شائع شدہ مختصر اجزا نہایت غور سے دیکھے تاہم اس سرسری گرفت کے سوا جس کی تصریح کر دی گئی ہے، کوئی اہم بات نہ ملی، جس کی طرف لائق ایڈیٹر کی توجہ مائل کی جاتی۔ آج کل انگریزی الفاظ اور اصطلاحات کا استعمال سنجیدہ لٹریچر کے لیئے ساقط المعیار ہو رہا ہے۔ ہم کو مصر سے ذخیرہ الفاظ مل جائیگا۔

زیادہ سے زیادہ یہ کہ اگر کوئی دقیق اور اجنبی اصلاح ہاتھ آئے تو انگریزی مفہوم
قوس میں ضمناً جگہ پا سکتا ہے۔ اور یہی ایک امر "ہمدرد" کی امتیازی روایات کے
قائم رکھنے کے لیے کافی ہوگا۔

(نقاد۔ ۱۹۱۳ء)

نقاد پر غیر ستائشی جنبشِ لب

اُردو میں لائق قدر رسالے اس قدر کم ہیں کہ کوئی مفید اضافہ دراصل لٹریچر کی خدمت ہے جس کا اعتراف نہ کرنا خود انشا پرداز کی حق تلفی ہے۔ حضرت دلگیر نے نقاد سے آگرہ کی لٹریری تاریخ میں ایک ضروری صفحہ بڑھایا ہے جس کی واقعی کمی تھی۔ کسی زمانہ میں یہاں سے "تیرھویں صدی" "زمانہ" اور "فسانہ" "ایام" اچھے اچھے پرچے نکلے۔ آج ان میں سے ایک بھی نہیں صرف یادِ ایام رہ گئی۔

کائنات میں کوئی چیز تلف نہیں ہوتی۔ صرف ہیئت بدلتی رہتی ہے۔ ہم نقاد کو بھی گذشتہ رسائل کا خلف ارتقائی سمجھتے ہیں۔ یہ بھی اسی مٹی سے اپنا خمیر لیکر اٹھا ہے جہاں اسکے بڑوں کی ہڈیاں دبی پڑی ہیں۔ اسلئے ضرور ہے کہ رگوں میں رگوں کے دوڑتے ہوئے خون میں جوہر شرافت بھی موجود ہو۔ جو ولادتاً دلگیر کے لٹریری بچے کا حق ہے جس کی نسبت میں صرف حوصلہ افزا خیالات رکھتا ہوں۔

دلگیر صوفی صافی ہیں اور وسیع دائرۂ احباب رکھتے ہیں اسلئے خیال تھا کہ ان کے ادبی مقاصد سے ہمدردی رکھنے والوں کی تعداد خاصی ہوگی اور میں خوش ہوں کہ یہ خیال غیر صحیح نہیں نکلا۔ لیکن الناظر میں احسن صاحب مارہروی کے خیالات دیکھ کر مجھے نقاد کی کامیابی کی طرف سے ایک طرح کا اطمینان ہوگیا ہے کل کے

بچہ کی بساط ہی کیا ؟ لیکن حاسدانہ نگاہیں پڑنے لگیں اور وہ بھی اس اہتمام کیساتھ کہ کوئی بسائی نہیں جو نقاد کے سر نہ لگائی گئی ہو۔

میرا خیال ہے کہ دوم درجہ کی خلقت عموماً قابل نفرت ہوتی ہے اور زیادہ تر اس کا جہل مرکب جس میں تنگ نظری اور تنقیص بیجا کے سوا منصفانہ تنقید یعنی شائستگی کا کوئی عنصر نہیں ہوتا حضرت مارہروی نے فلسفۂ حسن و عشق کا بھی خاکہ اڑایا ہے۔ اور اسی پر سارا زور ہے۔ ان کا علوم مشرقی و مغربی دونوں سے "امی محض" ہونا ان کی کافی سفارش تھی کہ میں ان کے مقابلہ میں تضیع اوقات پسند نہ کرتا لیکن چونکہ لٹریچر کی حق تلفی کی گئی ہے اس لیے ان کے کانوں تک مجھے دست شوق نہ سہی اپنی آواز تو پہونچانی ہی پڑے گی۔

فلسفۂ حسن کے خیالات کا زیادہ تر حصہ، حضرت کو یہ سنکر مایوسی ہوگی زینوفن کے "مقالات "غیر فانی" سے ماخوذ ہے جو سقراط کا شاگرد رشید تھا۔ یونانیوں میں مذاق حسن اس قدر رچا ہوا تھا کہ وہ عورت اور حسن کو مترادف سمجھتے تھے۔ ان کے جذبات کی نفاست کے اندازے سے آج ہم بھی قاصر ہیں عورت اور اسکے لطیف متعلقات کی نسبت ان کی نازک خیالیاں اتنی اچھوتی اور دنیا سے نرالی تھیں کہ ہم اپنی زبان میں میں ادائے خیال کے لئے الفاظ نہیں پاتے، یہی جذبات و خیالات بتدریج ترقی کرکے ان کی زندگی کے تمام صیغوں میں سرایت کر گئے، جن سے رفتہ رفتہ ان فنون لطیفہ کی بنیاد پڑی جو آج مہذب سے مہذب ملک کیلئے سرمایہ فخر ہیں۔ نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی نے اپنے فصیح ایڈریس میں جو علی گڈھ ایجوکیشنل کانفرنس میں دیا گیا تھا۔ نہایت صحیح فرمایا تھا کہ مسلمانوں نے اہل یونان کے مذاق حسن پرستی اور جذبات سفیہہ سے

کچھ فائدہ نہ اٹھایا، اور جو کچھ اخذ کر سکے وہ یونانیوں کے خوان نعمت کی گویا چھوڑی ہوئی ہڈیاں تھیں۔

یورپ نے جو جذباتی حیثیت سے یونانیوں کا شاگرد رشید ہے "حسن پرستی" کو اتنی ترقی دی کہ اب اس کے استاد اس کے گرد کو بھی نہیں پہنچتے۔ مثلاً "زہرہ" کو لیجئے جو حسن کی دیوی ہے جس کی پرستش کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ بڑے بڑے فلسفی اس کے حلقۂ ماتم سے بے نیاز نہیں ہیں۔ "زہرہ" نہایت خوبصورت ہے لیکن سر سے پاؤں تک ننگی! اودی اودی رگوں کے پیچ و خم نہ جانے کہاں سے کہاں تک پہنچے ہوئے کھلے ہوئے لمبے بالوں سے خوش آب موتیوں کے سے قطرات آب ٹپکتے ہوئے گویا نہا دھو کر سمندر کے کف سے پری نکلی ہے۔ پیکر خیالی جب اس انداز سے مجسم ہو کر لباس عریانی میں جلوہ گر ہو تو تخیل کے لئے کیا باقی رہا؟ اسی طرح مختلف جذبات کی تصویریں ہیں لیکن سب کی سب عریاں! اٹلی میں مرمری مجسمے دیکھئے۔ پیرس سیلس کی سیر کیجیے۔ حسن و جذبات کی پریاں آپ کو بالکل جداگانہ عالم میں نظر آئیں گی! بڑے بڑے فلاسفر، شاعر، حکمائے ادب اپنا اپنا سرمایہ خیال ان سے اخذ کرتے ہیں جن سے لٹریچر میں طرح طرح کی نزاکتیں پیدا ہوتی ہیں۔

لیکن ہندوستان اپنی مفروضہ دماغی ترقیات کے ساتھ بھی ان باریکیوں کو سمجھ نہیں سکتا۔ یہاں چار دن ہوئے قابلیت کا معیار یہ تھا کہ چند کتابیں پرانے سلسلۂ درس کی پڑھیں اور تیلی کے بیل کی طرح جہاں تھے وہیں رہے۔ بہت ہوا تو دو چار دیوان دیکھ ڈالے پہلے کوئی مصرع بے غایت خود رو طریق پر موزوں کیا۔ پھر تک سے تک ملانے کے لیے ایک مصرع ابتدائی کی پیوند کی سوجھی، چلئے شعر ہو گیا، کچھ دنوں کے بعد اس پھیر

میں اچھے خاصے شاعر ہو گئے کچھ اور ترقی کی تو کسی اگلے پچھلے شاعر کے خواہ مخواہ جانشین بن بیٹھے! جس کا یہ مبلغ ہو وہ "فلسفۂ حسن" پر جس حد تک "نقادی" کی صلاحیت رکھتا ہے اسے میں اہل نظر کے ذوق سلیم پر چھوڑتا ہوں۔

حضرت مارہروی کو یہ بھی خلش ہے کہ دوپٹہ آنچل، محرم اور چوڑیاں۔ صاحب فلسفہ کے اختراعات ہیں۔ یونانیوں میں یہ چیزیں کہاں؟ ان کی سمجھ پر کسی کو رونا آئے تو میری خطا نہیں۔ لیکن میں اپنے امّی دوست کو بتانا چاہتا ہوں کہ مہوشانِ یونان ایک طرح کا "سینہ بند" استعمال کرتی تھیں۔ جو "غیر تقسیمی" ہوتا تھا۔ تاہم وہ اپنے وستانے کی طرح جسم میں کھُبھ جاتا تھا۔ بندش کے بھی مدارج تھے کبھی چست اور کبھی چست تر۔ اسی طرح لمبے اسکارف سر پر ڈالے جاتے تھے جنھیں آپ ڈوپٹہ کہئے۔ جس کے دونوں سرے سامنے پڑے ہوتے تھے۔ ایلسی بایڈیز کا قصہ پڑھیے جو یونان میں سب سے زیادہ سجیلا جوان تھا۔ نازنینان ایتھنس اس پر جان دیتی تھیں اور چاہتی تھیں کہ نذرِ "شباب" ہو کر رہیں۔ کیونکہ ان کے خیال میں ایلسی بایڈیز کے حسن کا یہ ادنیٰ اٹیکس تھا۔ وہ جس حلقہ میں ہوتا تھا اسکارف کو ہوا میں جنبش دی جاتی تھی۔ غایت یہ تھی کہ

"حبابے خاستہ از بحرِ کافور"

پیرائے نظر جانے کا موقع ملے۔ اسی طرح کھلے ہوئے بال اور

سیہ چوڑی بدست آں نگارے

بہ شاخِ صندلی پیچیدہ مارے

کا بھی رواج تھا۔ صاحب فلسفہ کی یہ جدت اختراعیہ تھی کہ وہ مضمون کو اپنی زبان کی

خصوصیات کے ساتھ ادا کر سکے۔ مجھ کو اصرار ہے کہ عورت کے ذکر کے ساتھ اس کے
لطیف متعلقات کی تصریح ناگزیر ہے محرم[۱] کی جگہ "قبا" کفر ہی نہیں زبان کا خون
کرنا ہی مجھ کو معلوم ہے۔ ایشیائی شاعری اپنے جذبات میں "مخنث" ہوتی ہے لیکن جس
زبان کی شاعری "بند قبا" کو جائز رکھتی ہو جس کے لائقِ فخر شعراء کسی "معشوقہ" پر نہیں "معشوق
سبزہ آغاز" (یعنی ڈاڑھی مونچھ والے) پر فرضی اور غیر طبعی اظہار عشق کے عادی ہوں جہاں
عورت کے لئے اس کی خصوصیات کے اظہار کے ساتھ بھی فعل مذکر کے استعمال کا رواج
ہو۔ اس زبان کے پھوہڑ پن کیا ٹھکانا ہے؟ اس پر ستم ظریفی یہ ہے کہ اس "خجریت"
کا نام "سنجیدگی" ہے۔

لیکن اس معیار لطافت سے علیٰحدہ ہو کر اگر مغربی رنگ میں داد سخن دی جائے
تو بے سمجھے بوجھے کوّے کی کائیں کائیں صرف ثقل مذاق کا ثبوت ہے۔ ہمارے دوست
اگر مغربی لٹریچر اور فلسفہ سے بیگانہ ہیں۔ اگر وہ نہیں جانتے کہ فلسفۂ حسن کا ماخذ اصلی
کیا ہے؟ اگر ان کے دماغ میں یہ مناسبت نہیں ہے کہ وہ ان نازک مسائل کو جذب

۱؎ دنیا کی متمدن اقوام کی عورتوں میں ہمیشہ بالائی حصہ جسم کیلئے پوشش خاص کا رواج رہا ہے آج
بھی مہوشان فرنگ میں طرح طرح کے لباس ہیں جو جسم سے متصل پہنے جاتے ہیں۔ یہ آرائش جوانی کے
سوا صحت نسوانی کے لئے بھی ضروری ہیں اختلاف خوش وضعی کے ساتھ ان کے مختلف نام ہیں اور ان
ناموں کی تصریح سوسائٹی کے طبقاتِ اعلیٰ میں بھی غیر سنجیدگی نہیں سمجھی جاتی۔

دراصل "محرم" بھی اتنا شائستہ اور مہذب لفظ ہے کہ دنیا کی کوئی چیز اس
سے زیادہ بہتر اور سنجیدہ تر لفظ پیش نہیں کر سکتی، ہاں ایک جاہل نے اس کا ترجمہ
کر کے صرف اپنی نفرت انگیز "سوقیت" کا اظہار کیا۔

کہہ سکے، اگر وہ لطائف ادبی اور غیر سنجیدہ خیالات کی حدود میں تمیز نہیں کر سکتے مختصر یہ کہ اگر وہ نہیں جانتے کہ مغربی نزاکت خیال کیا چیز ہے؟ تو ہم انکو ایک کافی حد تک معذور سمجھنے کے لئے تیار تھے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ وہ اپنے چھچھورے اور ذلیل اظہار خیال اور بے باکانہ اظہار رائے سے جس کو خیر سے آپ تنقید سمجھتے ہیں صرف اپنا جہل مرکب ثابت کر سکے۔ عورت سے متعلق نازک خیالی، گر فحش بیانی" ہے تو فلسفہ کی یہ شانت سن رکھئے کہ خود عورت فحش ہے اور اس سے زیادہ ترکیب فحش ہے جو انسان کے عالم وجود میں آنے کا سبب ہوئی جسے اخلاقاً میں صرف "سنجیدگی" کہوں گا۔

سچ یہ ہے کہ جن صاحبوں کی ابتدائی تربیت 'چوک کے کوٹھوں' پر ہوئی ہو، وہ ان نکتوں کو کیا سمجھ سکتے ہیں۔ جو فلسفہ حسن کا مایہ خمیر ہیں جس کی غایت بہارِ عشق کی تنزیل (بہائم صفت) لوگوں کو شدید خواہشات کی اطفائے حرارت کے لئے برانگیختہ کرنا نہیں ہے، بلکہ شریف تر انسانوں کے سامنے جنس لطیف کو مرقع جذبات بنا کر پیش کرنا ہے، جس میں اس لائق رشک "مادیت کے ساتھ ہر طرح" کی اخلاقی اور جذباتی صفات آنکھوں کے سامنے آجائیں۔ آپ فرط سنجیدگی سے اسے "گھونگھٹ کی پردہ دری" کہتے ہیں۔ لیکن غریب کو معلوم نہیں کہ عالم فطرت کی سب سے خوبصورت حکمران" یعنی عورت کی شان اس سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے۔ عورت مادی کیفیات کے ساتھ بھی ایک ایسا مظہر پاکیزہ ہے جس پر خود فطرت سی لطیف چیز کو ہمیشہ ناز رہے گا۔ صرف فضائے عالم میں نکل کر دیکھئے۔ حجروں کی تاریکی میں اگر آپ "شیرانہ" کچھ دیکھ بھی سکے تو آپ کی قاصر النظری رازہائے سربستہ فطرت کو پھر بھی آپ کے لئے سربمہر رکھے گی۔

جناب مارہروی کی اس فریب کاری کو دیکھیے کہ جہاں عورت کی مادیت پہ آپ جامہ سے باہر ہو گئے، اس کی اخلاقی اور جذباتی کیفیات سے جو فلسفہ کی جان ہیں دانستہ آنکھیں پھوڑ لی ہیں۔ آپ نے اپنی پاک طینتی کا ثبوت اقتباسات پیش کردہ میں بھی دیا ہے جو میرے خیال میں ایک طرح کی تحریف ہے کیونکہ یہ اجزا مختلف موقعوں سے لیئے گئے ہیں۔ اور ایک سانس میں نمایاں کر کے پیش کئے گئے ہیں اور گو فلسفہ میں ایک حرف سنجیدہ نہیں۔ تاہم آپ کا فتویٰ یہ ہے کہ بعض حصے تہذیب شکن ہیں! میں صرف ایک آدھ مثال پر قناعت کروں گا۔ مثلاً سینہ کی تعریف میں۔

"فطرت کی شوخی دیکھیے گا یہ فتنہ قیامت زا کے لئے گنجایش نکالی بھی تو کہاں؟" یہ نازک خیالی آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ "شکسپیر" زندہ ہوتا تو بتا سکتا کہ اسکے خیال کا قالب کس خوبصورتی سے بدلا گیا ہے اسی طرح مقیاس الشباب کی ترکیب یاد رکھیے اردو لٹریچر کو ہمیشہ ناز رہے گا۔ صاحب فلسفہ نے ایک جگہ لکھا ہے۔

"آہ عورت تو فسانہ زندگی ہے، جس طرح اپنی صاف شفاف ہستی سے ایک جھونپڑے کو شیش محل بنا سکتی ہے۔ بڑے سے بڑے ایوان عیش کی تکمیل اس وقت تک ممکن نہیں جب تک تیری موجودگی کے آثار اس میں نہ پائے جائیں اس کے لئے چھڑوں کی جھنکار ضروری نہیں، محض تیرا ایسی پردہ ہونا کہیں ہو کسی کیلئے ہو کافی ہے۔" غور سے پڑھیے۔ یہ جذباتی اور اخلاقی لٹریچر کی بہتر سے بہتر مثال ہے جو اردو لٹریچر کی طرف سے پیش کی جا سکتی ہے لیکن ہمارے دوست اسے فحش فرماتے ہیں غالباً چھڑوں کی جھنکار پر کان کھڑے کئے ہوں گے۔ "جہل مرکب" اتنا تو ہو!

جناب مارہروی نے "فلسفہ حسن" کے لئے، ایک نیا نام پیش کیا ہے جو ان کے

ناقابل التفات خیالات و مقامات کی گندگی کا ایک جامع ثبوت ہے جس سے
ان کے اصلی خصائل اور مذاقِ طبع کی پوری غمازی ہوتی ہے جس کے بعد اب مجھے
دردسری کی ضرورت نہیں، لیکن وہ جھگڑے، جس آنکھ سے وہ فلسفہ پر وار کرنا چاہتے
ہیں ان کو یاد نہیں رہا، وہ ان کا عنوان زندگی"۔ اور اس حیثیت سے ان کیلئے
لائق ادب ہے کہ وہ ان کا "مصنف ہستی" ہے شرم شرم! اسی سلسلہ میں مختصراً ایڈیٹر
صاحب "الناظر" کی روانی قلم کی بھی داد دینا چاہتا ہوں، آپ کا تنقیدی نوٹ تمام تر
جناب مارہروی کے "جہل مرکب" کا کورانہ تتبع ہے۔ یا یوں سمجھیے کہ حضرت مارہروی
کے دل کی سیاہی جو ان کے قلم سے ٹپکی تھی، حضرت نے اسی کو لیکر پھیلایا ہے جس
سے کئی صفحے رنگ گئے، آپ کا غیر ضروری اظہار خیال بے معنی فصاحت کا ایک
دھوکا ہے۔ یعنی کثرت الفاظ کے مقابلہ میں مفہوم کچھ نہیں! جس کی غایت صرف
یہ معلوم ہوتی ہے کہ "الناظر" کے ہوتے دنیا میں کسی پرچے کی ضرورت نہیں! بہت
پھیر پھار اور حشو و زوائد کا ماحصل صرف اتنا ہی ہے جو میں نے عرض کیا۔ اسی میں خادم
الملک (یہ اپنے منھ میاں مٹھو ظفر الملک کا قافیہ ہے) حضرت دلگیر کا "نفاذ" بھی
آگیا جس کا وجود اس کے دشمنوں کی چھاتی کا پتھر ہو رہا ہے اسکے بعد آپ "فلسفۂ حسن"
کی طرف متوجہ ہوئے ہیں اور انشاء پردازی کا دریا بہایا گیا ہے لیکن مجتہدانہ ایک
حرف نہیں، اندھے کی لاٹھی! جناب مارہروی کے ساتھ کبھی غار میں کبھی دلدل میں!
بڑی نرمی سے فرماتے ہیں "جنس لطیف کے عضو عضو کی تشریح اور اس پر سرجری
کا عمل کیا گیا ہے"۔ فقرہ تو اچھا ہے لیکن دیکھیے پھر وہی بے معنی فصاحت کا دھوکا!
"فلسفہ حسن" میں اگر غلطی نہیں کرتا تو صرف بہترین عطیہ فطرت" یعنی عورت کے

سیلیہ کے متعلق مغربی خیالات کا چربہ اتارا گیا تھا اور ادائے خیال کے مختلف پہلو
دکھائے گئے تھے، جس کی نزاکت کو آپ سمجھ بھی نہیں سکے۔ تاہم لائق شرم غلط بیانی
سے آپ نہیں چوکے اور جناب مارہروی کے ساتھ مجبوراً مجھے آپ کی بھی خبر لینی پڑی
لیکن میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ مفروضہ نقائص کے ساتھ بھی "نقاد" کا معیار
اخلاق "الناظر" سے گھٹا ہوا نہیں ہے، حضرت کو یاد نہ ہوگا! الناظر میں کبھی ایک مضمون نکلا تھا جس
میں عورت کی نسبت یہ دکھایا گیا تھا کہ وہ عصمت فروش اور بے وفا ہی نہیں، بلکہ
بدترین مخلوقات ارضی ہے جس وسعت کے ساتھ اس شرمناک موضوع پر قلم فرسائی
کی گئی تھی۔ وہ آپ کی اور جناب مارہروی کی متفقہ ہزلیات سے بھی کچھ بڑھی ہوئی تھی لکھنؤ
میں "بیٹھ کر ڈولی میں سارا شہر" صرف "الناظر" کا حصہ تھا۔ برخلاف اس کے نقاد آگرہ
"جنسِ لطیف" کو اپنے مختص النوع خصائص کے ساتھ اس طرح پبلش کر سکا کہ وہ اس عالم
کی چیز نہیں معلوم ہوتی۔ اس نے جذبات کے جتنے پہلو دکھائے ہیں وہ بجائے خود فلسفہ ادب
کی جان ہیں جس کا ایک حرف بھی میرے خیال میں چھوڑنے کے لائق نہیں تھا۔
آخر میں مجھے حضرت دلگیر سے یہ کہنا ہے کہ جہاں ادبیات کا سرے سے مذاق
نہ ہو وہاں اتنے نازک خیالات کا پبلش کرنا صاحب فلسفہ سے زیادہ دلگیر کی غلطی تھی
غلطی پر غلطی یہ ہوئی کہ یہ مضمون آب و تاب کے ساتھ ایڈیٹر کی طرف سے پبلش کیا گیا جس کا
یہ نتیجہ ہوا کہ کم ہیں طبائع ضبط نہ کر سکیں، اور مجھ کو بھی ان کا توڑ کرنے کے لئے لٹریچر
کی طرف سے قلم ہاتھ میں لینا پڑا۔ جس کا مجھے افسوس ہے۔

میری رائے ہے کہ "دویم درجہ" کے اظہار خیال کی بہترین داد یہ ہے کہ وہ ایک
دم سے نظر انداز کیا جائے، لیکن اس قسم کا استغنا، شاید یورپ میں جائز ہو جہاں

وسیع النظر اور خوش ظرف اہلِ قلم تنقیدات عالیہ (یعنی ہائر کریٹی سزم) کا صحیح مذاق رکھتے ہیں۔ لیکن تنگ خیال اور بے درد مارہروی اور اُن کے یاران طریقت کے نتائجِ فکر جو ننگ انشا پردازی ہیں بھٹیاریوں کی "تو تو میں میں" سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں اور گو میں ان کی تمام مزخرفات کا استقصار نہ کر سکا۔ تاہم سلسلہ تحریر میں جس قدر حصہ ان کے خیالات کا جلوہ گر کیا گیا ہے وہ بتائے گا۔ کہ ان پر ایک کافی حد تک توجہ کی ضرورت تھی۔

(نقاد سنہ ۱۹۱۳ء)

اُردو لٹریچر کے عناصر خمسہ

آئندہ زمانہ میں اُردو لٹریچر کی اگر تاریخ لکھی گئی تو انیسویں صدی کا پچھلا دور اُس عہد کا "نشاۃ الثانیہ" (یعنی دور جدید) ہوگا۔ جس میں ایک بازاری زبان جس کا سرمایۂ ناز ایک بے غایت شاعری کا مجموعۂ خود رو تھا۔ منازل ارتقائی طے کرتی ہوئی اس سطح امتیازیہ کے قریب پہونچ گئی جہاں دنیا کی اعلیٰ تر زبانیں اپنا سکہ جما رہی ہیں۔

کل کی بات ہے جب تک سے تک ملا لینا کمالِ فن سمجھا جاتا تھا۔ گرمیٔ محفل کے لیے چند مصرعوں کی پیوندکاری لٹریچر کے فرائض سے ہم کو سبکدوش کر دیتی تھی لیکن اقتضائے وقت کے ساتھ تغیر مذاق دیکھئے کہ آج ہم کو ان کے ذکر سے بھی شرم آتی ہے۔

یہ کیوں؟ صرف اس لیے کہ ہم دیکھتے ہیں۔ کائنات میں کوئی چیز نہیں جو تغیر پذیر نہ ہو۔ ہمارے جذبات بدلے، خیالات بدلے، تغیر حالات کے ساتھ وہ آثار خارجی بھی جن میں ہم گھرے ہوئے تھے، کچھ سے کچھ ہو گئے، غرض زمین بدلی، آسمان بدلا اور ہم بھی وہ نہیں رہے جو پہلے تھے اور ابھی معلوم نہیں مؤثرات خارجی اور واقعات کی قدرتی رو ہم کو کہاں سے کہاں لے جائے گی!

اس کشمکش اور سلسلۂ انقلابات میں اتنا ہوش کہاں کہ طبقات ارتقائی کی درمیانی

کڑیاں آپ کو گنائی جائیں۔ صرف یہ سمجھ لیجئے کہ بوسیدہ اور فانی اجزاء کی جگہ تو تیز عناصر نے لی اور اقلیم سخن کی شریف ترہستیاں عالم وجود میں آئیں جن سے اندوختہ حاکم سوا دلٹریچر ایک دم سے آشنائے فلسفۂ ادب ہوگیا۔

میری غرض لائق عزت سرسید، پروفیسر آزاد، نذیر احمد، حالی و شبلی سے ہے جن کے قلم کے سایہ میں اردو یعنی کل کی چھوکری اتنی دم دار ہوگئی کہ السنۂ یورپ یعنی مغربی بہنوں سے بے تکلف آنکھیں ملا سکتی ہے، ان میں سے ہر شخص مختص الموضوع خصائص ادبی کے ساتھ اپنے اپنے دائرہ کا آپ مالک ہے اور جس طرح ادب القدماء (یعنی کلاسیکس) آج واجب التعظیم سمجھا جاتا ہے ایک وقت آئے گا جب ان کے ادبیات کا بیشتر حصہ لائق پرستش اور غیر فانی سمجھا جائیگا۔

یہ موضوع نہایت اہم ہے اور چونکہ بہت پھیلایا جا سکتا ہے اس لیے سرسری طور پر ٹالنا منظور نہیں۔ بلکہ میری خواہش ہے کہ آج کل کے اچھے لکھنے والے اس پر قلم آزمائی کریں۔ میری غرض لائف نگاری نہیں ہے بلکہ صرف تنقید ادبی (یعنی لٹریری ریویو) چاہتا ہوں جس میں بلحاظ فن فرداً فرداً ہر مصنف کے نتائج فکر کی خصوصیات اس طرح دکھائی جائیں۔ کہ ایک حد تک تنقیدات عالیہ (یعنی ہائر کریٹی سزم) کا حق ادا ہو جائے گا۔

سرسید نے ادب اور معقولات پر جس حد مجتہدانہ رنگ چڑھایا دراصل ان کی اولیات میں داخل ہونے کے لائق ہے۔ یہ ان ہی کے قلم کی آواز بازگشت ہے جو ملک میں بڑے سے بڑے مصنف کے لیے دلیل راہ تھی، آج جو خیالات اپٹی آب و تاب اور عالمانہ سنجیدگی کے ساتھ مختلف لباس میں جلوہ گر کیے جاتے ہیں دراصل

اسی زبردست اور مستقل شخصیت کے عوارض ہیں ورنہ پہلے یہ جنس گراں با وصف
استطاعت اچھے اچھوں کے دسترس سے باہر تھی۔ سرسید کے کمالات ادبی کا
علم اعتراف صرف ناشکری نہیں بلکہ تاریخی غلطی ہے اور میں خوش ہوں کہ شریف النفس
حالی نے آج کل کی بہتر سے بہتر "سوانح عمری" لکھ کر منحرف طبائع کو بوساطت سخت
سے سخت شکست دی جو خیال میں آسکتی ہے لیکن نئی نسل پچھلا سبق کسی قدر بھول
چلی ہے حالانکہ سرسید کے حقوق زیادہ تر اسی کی گردن پر ہیں۔ بلکہ مجھے کہنا چاہئے کہ
لٹریچر کے حقوق کا اقتضا یہ ہے کہ سرسید کے علمی کارنامے پر نگاہ عکس ریز ڈالی جائے
اور اس کے لئے سید سجاد حیدر (یلدرم) مجھے زیادہ تر موزوں معلوم ہوتے ہیں۔
علامہ نذیر احمد کو میں "تم المامہ ہروی" توبہ! سید افتخار عالم کے سر لگانا چاہتا
ہوں۔ جنہوں نے حال میں مولانا کی نہایت مفصل سوانح عمری شائع کی ہے با استحقاق
ان سے بہتر کوئی شخص خیال نہیں آتا یہ لکھیں گے اور ہمدردانہ اور سخن گسترانہ لکھیں گے
اسی کی ضرورت ہے نذیر احمد گو ایک حد تک "عقلیات" سے رسیاں تڑاتے
ہے لیکن ادب اور منقولات سے متعلق جو دفتر انہوں نے چھوڑا ہے وہ اس قدر
اہم ہے کہ کچھ سرسری ریمارک کرنا چاہتا ہوں مگر سمجھ میں نہیں آتا کہاں سے شروع
کروں، ان کی اعلیٰ درجہ کی عربیت کے ساتھ بے مثل قدرت بیان، وسیع ذخیرۂ
الفاظ اور وہ تصرفات جو جدت خیال اور ظریفانہ نکتہ سنجیوں کے لحاظ سے صرف اس
شخص کا حصہ ہیں لٹریچر کی جان ہیں اس پر اضافہ کیجئے اردو فارسی کم مایہ زبان
کا ایسے شریفانہ قالب میں ڈھلنا جس پر کلاسیکس کا دھوکا ہو۔
بعض صاحبوں کو غالب کی طرح ان کی مشکل پسندی کا رونا ہے اور وہ پیوند

کاریاں جو ان کی شستہ رفتہ اور برجستہ اردو میں ہوئی ہیں جس میں انگریزی زیادہ بے جوڑ ہوتی ہے عام خیال ہے کہ ثقل سے خالی نہیں۔ لیکن انصاف یہ ہے کہ یہ سبب ان کی جدتِ اختراع اور قوت آخذہ کا زور ہے۔ آمد کی رَو میں اضطراری طور پر اپنے پرائے کی تفریق نہیں ہو سکتی۔ اور یہی وجہ ہے کہ بعض حصے بلحاظ ترکیب و تحلیل اجزائے السنۂ غیر گنگا جمنی ہوتے ہیں تاہم متانت اور حسن کلام سے کبھی علیٰحدہ نہیں ہوتے جو ان کے لٹریچر کا خاصۂ طبعی ہے نہ ان کے اچھوتے اور مستقل طرز ادا (اسٹائل) پر جو بشار عام سے الگ تھلگ اور آپ اپنی نظیر ہے کوئی اثر پڑتا ہے جو باتیں اوروں کے ہاں بیگانی ہیں ان کی بے ساختگی اور برجستگی خیال کے ساتھ سلسلۂ بیان میں اس طرح جذب ہو جاتی ہیں کہ مغائرت یا اجنبیت کا احساس تک نہیں ہوتا۔ پھر بھی جہاں تک اس حیثیت سے اعتراض کی گنجائش ہے۔ ادب چاہتا ہے سبک نکتہ چینیوں سے ان کا کمال ہمیشہ بے نیاز رہے گا۔

میں آج تک یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ با وصف کمالات علمی جو ایک حد تک ان کے ہم عصروں کو بھی مرعوب کرنے والے تھے۔ ان کی فطری قابلیت اور اعلیٰ مذاق سخن کی آزمائش کا بہتر سے بہتر پیرایہ کیا ہو سکتا تھا۔

جس طرح ناولوں اور تراجم میں یہ رعایت فن یہ اپنی قادر الکلامی کا بڑے سے بڑا ثبوت دے سکے۔ لٹریچر کے وہ اجزا جن کا موضوع زیادہ اہم اور سنجیدہ ہے مثلاً فلسفہ تاریخ وغیرہ جس میں وسعتِ نظر کے ساتھ تحقیق و تنقید، قوت استقرا، تفریع مسائل اور فلسفیانہ استخراج نتائج کے ساتھ غیر منقطع انبساطِ خیال کی ضرورت ہے یہ قصداً ان طرف نہیں آتے۔ یہی حد فاصل ہے جو شبلی کے قلم سے انکے دائرہ کمالات کو جدا کرتی ہے۔

اور یہی وہ آزادی ہے جس کے آثار ان کے لکچروں میں آپ دیکھیں گے اور جس کی بنا پر یہ اکثر کہا گیا ہے کہ وہ موضوعِ سخن کے حدود کو قائم نہیں رکھ سکتے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ ان کا مرتبۂ انشا پردازی چاہتا ہے کہ ہم مان لیں کہ یہ صرف زورِ بیان کا قصور ہے، جو اظہارِ فصاحت میں کسی چیز کا محکوم نہیں ہوتا۔

زمانہ کتنی ہی ترقی کرے، اس علم کے پتلے کو پھر پیدا نہیں کر سکتا، جس کا کوئی رونگٹا بیکار نہیں۔ جہاں تک لائق ادب "مشرقیت" کا تعلق ہے قوم کی یہ آخری بہار تھی، جس کے اجزا کچھ اٹھ گئے، کچھ باقی ہیں، قدیم علوم کے نام لیوا ایک آدھ سے زیادہ نہیں۔ جس عربی، مرحوم عربی کو ہم بیسویں صدی میں ڈھونڈھتے ہیں، علامہ نذیر احمد کے ساتھ دفن ہو گئی۔ مگر ان کا حصۂ غیر فانی یعنی ان کی تصنیفات مرنے والی چیز نہیں۔ وہ اپنی بقائے دائمی کی آپ ضامن ہیں اور یہی انسان کا بڑے سے بڑا تخیل (آئیڈیل) ہے، جس سے دنیا میں کوئی بے نیاز نہیں۔

نذیر احمد کے استادانہ اور باوقار لٹریچر کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ یہ ایک ایسا نقصان ہے جس کی تلافی اب ہو نہیں سکتی، لیکن اخلاف کے لئے جس قدر سرمایۂ علمی انہوں نے چھوڑا ہے وہ موجودہ اور آئندہ نسلوں کو ہمیشہ ان کی یاد دلاتا رہے گا۔ ہم ان کی قیمتی تصنیفات کو سینہ سے لگائیں گے۔ آنکھوں میں جگہ دیں گے۔ دائمی جدائی کے بعد ادائے سپاس کا حق کچھ تو ادا ہو رہے۔

سرسید کے بعد اگر ان کے رنگ میں کوئی قلم ہاتھ میں لے سکتا ہے تو یو ڑھے حالی ہیں، یہ ایک ہی وقت میں جہاں فطری شاعر ہیں، اعلیٰ درجہ کے ناثر بھی ہیں۔ لائف نگاری کے ساتھ نکتہ سنجی اور سخن آفرینی کا ایک خاص سلیقہ ہے جس نزاکت کے

ساتھ اداۓ خیال کے ساتھ مختلف پہلوؤں سے دیکھتے دیکھتے یہ اپنا مطلب
نکال لیتے۔ کثرت مواد کے ساتھ بھی دوسرا اس قسم کے لطیف تصرفات نہیں کر سکتے۔ طبیعت
میں ایک جچا تلا خاص طرح کا مادہ ہے جو حشو و زوائد سے غرض نہیں رکھتا اور ساتھ ہی
کسی موضوع بحث میں ان کا نکات متعلقہ کی طرف نہایت خوبصورتی سے فوری
انتقال ذہن کا باعث ہوتا ہے جو دراصل اس بحث کی جان ہوتے ہیں لٹریچر کا بہت
بڑا وصف یہ ہے کہ سخت سے سخت مسائل باتوں باتوں میں طے کر دیئے جائیں
یہ سلاست و نفاست قدرت کلام کی آخری حد ہے جو سر سید کے بعد حالی
کے حصہ میں آئی۔

ایک خاص بات یہ ہے کہ ان کے خیالات و مقامات میں جھول جھال یعنی
کسی طرح کا تذبذب فی الرائے، نہیں ہے۔ خالص ایک رنگی ہے جسے اصطلاح
میں فلسفیانہ کہیئے۔ معیار خیال اس قدر بلند پایہ اور سلجھا ہوا ہے کہ کہیں سے بیگانے
نہیں ہوتے۔ مجھے ہنسی آتی ہے جب سنتا ہوں کہ حالی کی جدید شاعری بلحاظ فن
ساقط المعیار ہے۔ اور اس لائق نہیں کہ اس پر توجہ کی جائے۔ یہ فتویٰ "پرانی لکیر
کے شیدائیوں" کا ہے۔ جو خیر سے یہ بھی نہیں جانتے کہ شاعری دراصل کیا چیز ہے اور
اسکا موضوع اصلی کیا ہے؟ بھیڑوں کا ایک غول ہے جو مدت ہوئی آنکھیں بند کئے ایک
راستہ پر پڑ لیا۔ اور آگے پیچھے آج تک چلا آیا۔ لیکن ہم کو اس سے کچھ بحث نہیں
تاہم اس مجموعہ ردیات پر نظر ڈالنا چاہتے ہیں جو پرانے خیال والوں کا سرمایہ ناز
ہے۔ ہم ایک حد تک معصوم حماقتوں سے کسی کی ہوئی لطف اٹھانے کے لئے تیار ہیں،
کیونکہ یہ بھی ایک عیش ہے۔ صرف اتنا کہیئے کہ بڑے بھلے حالی کو جدید گروہ کی

لائق فخر پیشوائی کے لئے چھوڑ دیجئے۔

میرا خیال ہے حالی کے کلام پر مولوی عبدالحق کھل کر داد سخن دیں گے۔ یہ آج تک یا وصف قابلیت اور فلسفیانہ مذاق کے صرف "مقدمات" پر ٹلتے رہے۔ ان کا مصرف صحیح کچھ اور تھا۔ ان میں مادۂ اختراعی (اریجنیلیٹی) خاصا ہے۔ مگر قوت فیصلہ کی کمی "صحافت" سے آگے بڑھنے نہیں دیتی۔ حالانکہ ان کا سلیقہ تحریر سفارشی ہے کہ مستقل تصنیف و تالیف کے سوا یہ کچھ اور نہ کرتے۔ بہر حال ان کو کم سے کم میری خواہش تو پوری کرنی ہو گی۔

یا دش بخیر! شبلی پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے جس سے زیادہ ایک "نادہ مصنف" پر قلم آزمائی کی گنجایش نہیں چبائے ہوئے نوالوں کا بار بار منہ میں پھیرنا، خواہ وہ کتنے ہی خوش ذائقہ ہوں۔ جدت طرازی جائز نہیں رکھتی اور چونکہ کوئی نئی بات نہیں کہہ سکوں گا۔ اس لئے مختصراً اس قدر کافی ہے کہ شبلی ملک میں پہلے شخص ہیں جنہوں نے تاریخ پر فلسفہ کا رنگ چڑھایا اور حکیمانہ انکشافات و نکتہ آرائیوں سے اسے ایک مستقل فن بنا دیا۔

علیگڑھ کو انہوں نے چھوڑا، اور ندوۃ العلماء نے، مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے خود ان کو، لیکن میرا بس ہو تو شبلی کو ہندوستان سے باہر کالے کوسوں یورپ کے کسی "بیت العلماء" (لٹریری اکیڈیمی) میں بھیج دوں۔ جہاں ان کو اپنی غیر معمولی قابلیت کی داد بڑے بڑے علماء مستشرقین سے ملے گی۔ جو بلحاظ ہم فنی ان کے یاران دل رنگیت ہیں۔ شبلی کا وسیع دائرہ تحقیقات اہل زبان کی سی فارسی اس میں بھی شاعری کا ملکہ راسخہ، اور سب سے زیادہ اپنی زبان میں ان کی لائق رشک انشا پردازی وہ

صفات ہیں جو علانیہ ان کو ہم نفسوں سے ممتاز کرتی ہیں "شعرالعجم" کے چوتھے حصہ میں فلسفہ شاعری پر مختلف پہلوؤں سے جس جس طرح تنقید کا حق ادا کیا گیا ہے "ادب الاساتذہ" کا بہتر سے بہتر مرقع ہے جس پر دنیا کی کوئی زبان فخر کر سکتی ہے ۔

اردو میں ان کے مطائبات نظم کو جدید پیداوار ہیں ان کے سلسلۂ کمالات سے علٰحدہ کر کے دیکھئے۔ جن میں لطائف ادبی کوٹ کوٹ کو بھرے ہیں یہ رنگ بھی ان ہی کا حصہ ہے شوخی کے ساتھ سنجیدگی یہ معلوم ہوتا ہے دور سے زبان کی بلائیں لے رہی ہے لیکن اس جامعیت کے ساتھ بھی سوال یہ ہے کہ قوم نے کہاں تک حوصلہ افزائی کی ؟

کل کی بات ہے ایک اتفاقی واقعہ پر شبلی پر ملک کے جبہ جبہ سے لے دے شروع ہو گئی اور اس قدر غل شور ہوا کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔ بڑے بڑے سنجیدہ حضرات اپنے نامۂ اعمال کی طرح اخباروں کے کالم سیاہ کرتے رہے جس سے کچھ دنوں کے لئے اخباری افق کی فضائے بسیط ایک دم سے تیرہ و تار ہو گئی۔ کیا یہ کوئی علمی واقعہ تھا ؟ ہرگز نہیں ! صرف حاسدین کی کم نظری تھی دِلوں کی جمی ہوئی سیاہی، لغزش قلم سے ٹپکی اور بری طرح ٹپکی ۔

لیکن شرافت علم دیکھئے۔ شرر کو جو شبلی پر کبھی کبھی سخن گسترانہ چوٹیں کرتے تھے اس ناگوار واقعہ کے بعد جس کا انجام ندوہ سے مولٰنا کی دست کشی پر ہوا۔ اپنی آواز بلند کرنی پڑی، وہ صاف صاف کہہ گزرے کہ ندوہ میں جو کچھ دم تھا، شبلی کی وجہ سے تھا اب وہ ایک جسد بے روح ہے، اسی ضمن میں مولٰنا کے کمالات کا شستہ اعتراف اور قوم کی ناسپاسی کا رونا تھا ۔

نقاد میں "تاریخ کا معلم اول" کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ ایک قاصر النظر نے اہتمام کے ساتھ "مشرق" میں اس کی تردید کی جسارت کی لیکن عامیانہ وحاسدانہ جس میں علامہ شبلی کو ان اوصاف سے معرّی کر کے دکھایا تھا جو مضمون نگار نے حسن عقیدت سے نہیں بلکہ خود "فلسفہ کے ایما" سے غیر فانی شبلی کی طرف منسوب کئے تھے۔

بہر حال میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ شبلی پر اگر کوئی قلم اٹھانا چاہے تو جی لگنے کے سامانوں میں کمی نہیں۔ میرے خیال میں سید عبد الماجد اگر فلسفہ تاریخ سے اتنی ہی دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں، جس اہتمام سے "الکلام" پر منحرفانہ نظر ڈالی گئی تھی تو کفارہ معصیت کے ساتھ تنقید کا بھی حق ادا ہو جاتا۔

سب سے آخر، مگر دراصل سرفہرست آزاد ہیں۔ میں خود کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ آزاد اس پایہ کے ادیب ہیں کہ ان کے دائرہ کے اور خلاقین سخن کو ان کے آگے سر جھکانا پڑے گا۔ آزاد کی جن حیثیتوں پر خصوصیت کے ساتھ نگاہ پڑ سکتی ہے وہ تحقیقات وابستہ کے مذاق کے ساتھ پاکیزگی زبان آزاد کا خاص انداز بیان ہے جس سے انکی نثر عموماً نادر نگار معلوم ہوتی ہے۔

ایک مغربی شاعر کے خیال میں جس نے شوخی سے عالم فطرت (نیچر) پر کمال صنعت (آرٹ) کو ترجیح دی ہے۔ خوش آب موتیوں کا نشاط انگیز انتشار کے ساتھ فرش ریشمی پر بکھر جانا روانی آب سے زیادہ دلکش ہے مگر اس سے زیادہ تر دلکش ہے کسی نازک خیال مصنف کی مرصع پیداوار دماغی جو حسن صوری اور معنوی کے ساتھ آمد اور بے ساختہ پن کی تصویر ہو۔ اسکے سلیس و نفیس لٹریچر کا یہ وصف اضافی کہ

روکھے پھیکے مسائل کو بھی اس لطافت سے جذب کر کے کہ کہیں سے بار طبیعت نہ ہو۔
اور فسانے (یعنی لائٹ لیڈ ٹنگ) کا لطف آئے میرا خیال ہے لائق ذکر خصائص میں سے
ہے جس کی بنا پر ایک مشہور موقع پر یہ کہا گیا تھا کہ آزاد اردوئے معلّٰی کا ہیرو ہے۔"
جس طرح تاریخ میں فلسفہ کا رنگ سب سے پہلے شبلی نے چمکایا ہے اردو کو
انشاء پردازی کے ذرجہ پر جس نے پہونچایا وہ آزاد اور صرف آزاد ہیں اور گو اس مسئلہ
پر ابھی کافی توجہ نہیں کی گئی ہے۔ لیکن آزاد کی ادبی فتوحات، تاریخ لٹریچر کا ایک واقعہ
ہے جس کا فیصلہ خود فلسفہ ادب کے ہاتھوں ہوگا۔ جن حضرات کی نگاہیں دلی لکھنو کے
اختلافات تک محدود ہیں یا جن کی قاصر النظری میرے اس خیال کی تائید کی مانع ہو وہ
مجھے معاف فرمائیں گے۔ اگر میں بلا خوف تردید یہ عرض کردوں کہ پروفیسر آزاد کا درجہ
بحیثیت ادیب جو کچھ ہے اس کا سمجھنا دوم درجہ کی خلقت کے لئے جو فلسفہ لٹریچر سے
قطعًا بیگانہ ہے آسان نہیں ہے اس لئے کسی اختلافی بحث کا چھیڑنا" گول خانہ میں
چوکھنٹی چیز" سے بھی زیادہ گیا گذرا ہوگا۔
سرسیّد سے "معقولات" الگ کر لیجیے تو کچھ نہیں رہتے۔ نذیر احمد بغیر مذہب
کے لقمہ نہیں توڑ سکتے۔ شبلی سے تاریخ لے لیجئے تو قریب قریب گورے رہ جائیں گے
حالی بھی جہاں تک نثر کا تعلق ہے سوانح نگاری کے ساتھ چل سکتے ہیں لیکن آقائے
اردو" یعنی پروفیسر آزاد صرف انشاء پرداز ہیں جن کو کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں
اسی لئے واقعات بھی انھوں نے جس قدر لکھے ہیں" قصص" (یعنی ٹیلز) کی حیثیت رکھتے ہیں
جنہیں "افسانہ یاران کہن" سمجھیے۔
اس بحث کو اصل تنقیدی مضمون میں پھیلاؤں گا۔ یہاں فقط افتتاحی حیثیت سے

بھی قوت کا صرف کرنا منظور نہیں۔ اسی سلسلہ میں آپ دیکھیں گے کہ جدید شاعری جس کے "آدم" حالی سمجھے جاتے ہیں۔ غالباً اس کی داغ بیل سب سے پہلے آزاد نے ڈالی تھی۔ مجھ کو آزاد کے لٹریچر سے غیر معمولی دلچسپی ہے اس لئے ذرا تفصیل کیساتھ ان کی دل کش تصنیفات کے ان اجزاء کو ابھار کر دکھاؤں گا جن کا ایک ایک حرف لٹریچر کی جان ہے۔

بہر حال ارکان خمسہ کی تجویز آپ کے سامنے ہے اکبری نورتن کے مقابلہ میں بعض صاحبوں کو یہ تحدید پسند نہ آئے گی لیکن مجھے افسوس ہے کہ مصنفین کی صف اول میں اس سے زیادہ گنجایش معلوم نہیں ہوتی۔ تاہم غیر ضروری نکتہ چینی سے علحدہ ہو کر اگر کوئی صاحب (بشرطیکہ لٹریچر کا صحیح مذاق رکھتے ہوں) مجھے مفید مشورہ دے سکے۔ تو میرا خیال ہے میں اس پر غور کرنے کے لئے ایک حد تک تیار ہوں۔

اس تجویز کو قوت سے فعل میں لانے کے لئے ضرورت ہے کہ کم سے کم سو صفحے ہر مصنف کے نذر کئے جائیں۔ اس طرح پانسو صفحوں کی ایک کتاب تیار ہو جائے گی جس کا ایک طبع خاصہ (یعنی ایڈیشن ڈی لکس) بہتر سے بہتر کاغذ اور چھپائی کے ساتھ شائع ہوگا۔ جس میں مصنفین کے ساتھ متعقدین کی ہاف ٹون عکسی تصویریں شامل کی جائینگی۔ اس کی تکمیل مالی امداد سے قطعاً بے نیاز ہے، ضرورت ہے، تو ترتیب مضامین کی جس کی طرف ایک مرتبہ اور میں ان اصحاب کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ جن کو فرداً فرداً میں نے نامزد کرنے کی عزت حاصل کی ہے۔

(نقاد۔ سنہ ۱۹۱۳ء)

پروفیسر براؤن
اور
ایرانی لٹریچر کا دورِ جدید

جس طرح فرانس کے مشہور ادیب "پیرلوتی" کو ٹرکس لائف، ٹرکش لٹریچر سے ایک خاص دلچسپی ہے۔ پروفیسر براؤن ایران پر اس قدر مٹے ہوئے ہیں کہ انکا موضوعِ سخن زیادہ تر ایران اور اس کے متعلقات ہوتے ہیں۔ ایران کی ادبی تاریخ جس جامعیت کے ساتھ انہوں نے لکھی ہے دنیائے ادب اسے حیرت سے دیکھتی ہے دو ضخیم جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ تیسری زیرِ ترتیب ہے جو اس سلسلہ کی آخری کتاب ہوگی یہ دراصل مسلمانوں کی دماغی تاریخ ہے جو نہایت تحقیق اور تلاش کے ساتھ وسیع پیمانہ پر لکھی گئی ہے۔ فاضل مصنف نے جدت یہ کی ہے کہ عجمی عناصر کو الگ کر کے دکھاتا گیا ہے۔

کچھ روز ہوئے "انقلاب ایران" پر ایک خوبصورت ضخیم اور حوصلہ افزا کتاب لکھی گئی۔ جو کثرت سے شائع ہوئی۔ "واقعہ تبریز" پر ان کی کھلی چھٹیاں اگر یورپ کے سیاسی حلقے برف کی طرح جم کر بے حس نہ ہو گئے ہوتے تو دل ہلا دینے کے لئے کافی تھیں۔

براؤن آج کل مستشرقین یورپ میں پیش پیش ہیں اور سچ یہ ہے کہ انہوں نے

حکمائے فرانس اور جرمنی کے مقابلہ میں ادبی حیثیت سے انگلستان کی ناک رکھ لی۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ جو کچھ لکھتے ہیں "غیر منحرفانہ" یعنی ہمدردانہ لکھتے ہیں۔ عربی، فارسی کی متعدد نایاب کتابیں انھوں نے اپنی ایڈیٹری میں شائع کی ہیں۔ اور یہ سلسلہ مستقلاً جاری ہے۔ سلیقہ تحریر اتنا اچھا ہے کہ علمائے اسلام کو بھی اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

حال میں ان کے قلم سے ایک کتاب نکلی ہے جس میں ایران کے دور جدید کی شاعری اور صحافت (جرنلزم) سے بحث کی ہے اور تفصیل سے بتایا ہے کہ "انقلاب" کے بعد ارتقائے ایران میں ملکی مطابع اور ملکی شاعری نے کہاں تک حصہ لیا۔ اس طرح دو مختلف النوع مگر متحد الغایت موضوع یعنی ایرانی صحافت اور ایران کی سیاسی اور وطنی شاعری، یعنی ادبی تحریک کے دو جداگانہ رخ دکھائے گئے ہیں۔ یہ کتاب دو حصوں میں ہے۔ پہلے حصہ میں ان اخبار و رسائل کی تصریح ہے جو بالذات یا بالواسطہ ایران کی بیداری کا سبب ہوئے۔ یہ حصہ مرزا محمد علی خاں "تربیت" کا مرتب کردہ ہے۔ جس کی براؤن نے ترجمے اور حواشی سے تکمیل و تزئین کی ہے۔ ان جرائد کی تعداد ۳۷۱ تک پہونچتی ہے۔

دوسرا حصہ جدید شاعری کا مرقع ہے جو حریت اور وطنیت کی روح ہے جسے دیکھنے کے بعد یورپ کے متعلمین فارسی کا یہ خیال صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ ایرانی شاعری چار سو برس ہوئے دفعتہً دور آخر کے "شعرائے طبقہ اولیں" یعنی جامی کے ہمعصر دولت شاہ پر ختم ہو گئی اور پھر اس نے کوئی کروٹ نہیں لی۔ صحیح یہ ہے کہ کسی نے تحقیق و مطالعہ کی تکلیف نہیں اٹھائی ورنہ سیکڑوں کی اب بھی کمی نہیں۔

مے کہن ہے کہ نئے ساغروں میں پڑی چھلک رہی ہے۔

براؤن کو افسوس ہے کہ سیاسی وجوہ سے یورپ اور ایشیا کے لٹریچر میں کبھی وہ اتحاد نہیں ہوگا جس کی ضرورت تھی۔ ورنہ "شرکت کی ہانڈی چوراہے میں" عرب ایران کی نسبت ہم یہ نہ سنتے کہ وہ فنا کے درجے طے کر رہا ہے، کیونکہ دراصل پچھلے ۸ برسوں میں اس نے کافی آثار زندگی کا ثبوت دیا اور اگر "دوستوں" کی نیک نیتی عملاً شریک حال نہ ہوتی اور وہ اپنی حالت پر چھوڑ دیا جاتا تو وثوق کے ساتھ یہ کہنا ممکن تھا کہ ملک کی اخلاقی اور مادی ترقی قطعی اور یقینی تھی۔ ان کا خیال ہے کہ سچی انشاء پردازی عصری جذبات و خیالات کا آئینہ ہوتی ہے۔ گذشتہ چند برسوں میں ایران کو بیہم یاس و امید کے جن طبقات مختلفہ سے ہوکر گذرنا پڑتا ہے اس کا عکس موجودہ لٹریچر میں دیکھ لیجیے۔ اور یہی وجہ ہے کہ خیالات کے دو زبردست آلہ ہائے محرک یعنی صحافت اور شاعری کے متعلق جہاں تک ممکن تھا معلومات بہم پہونچائی گئیں۔

پیام دوشم از پیر مے فروش آمد   بنوش بادہ کہ یک ملتی بہوش آمد
ہزار پردہ ز ایران دریدہ استبداد   ہزار شکر کہ "مشروطہ" پردہ پوش آمد

دور جدید کی شاعری پر شعرائے ایران اور ٹرکی کے خیالات کے اقتباسات نہایت دلچسپ ہیں اس پر براؤن کی لطیف قلم کاریاں! بس یہ معلوم ہوتا ہے شراب کچھ کھچا کر دو آتشہ ہوگئی ہے اور یہ حصہ بجائے خود مستقل عنوان چاہتا ہے لیکن میں یہاں جو کچھ لکھ رہا ہوں صرف اذہان کے ابھارنے کے لیے، مذاق صحیح ہو تو یہ کام یورپ کے سہارے سے کرنے کے ہیں مجھے اتنا موقع نہیں، دوسرں کو

"کلام غالب" پر دیباچہ لکھنے لکھانے سے فرصت نہیں۔ ایک صاحب نقاد سے متقاضی ہیں کہ دیباچہ لکھواؤ! یہ دیباچہ کیا بلا ہے، آج تک میری سمجھ میں نہ آیا۔ اگر مقدمہ سے غرض ہے تو سیدھے مولوی عبدالحق کے پاس حیدرآباد جایئے۔ تنقید و تبصرہ منظور ہے تو مجھے مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ اس کا دور ختم ہو چکا! غالب پر رائے زنی کم سے کم ملتے جلتے اہل کمال کا حق ہے۔ جس میں مصنف سے زیادہ وسعت نظر نہ ہو تو اتنا تو ہو کہ اس کی بات سمجھ لے۔ یعنی نکات شاعری جو مقصود شاعر ہوں ان پر اس کی نظر حاوی ہو۔ یہ ایک جداگانہ بحث ہو گی۔ کہ مقصود شاعر من حیث الفن کہاں تک حاصل ہوا۔ یا اہل زبان اس کے لٹریچر کو کہاں تک تسلیم کر سکے؟ میرا خیال ہے جو کچھ لکھنا تھا یا لکھنے کے لائق تھا پروفیسر آزاد لکھ چکے۔ کچھ کسر تھی وہ حالی کی شاگردی نے لائق ادب استاد کی "یادگار غالب" میں پوری کر دی۔ اسلئے آج کل کے جدت پسند شیدائیان کمال کو نیک نیتی سے صرف یہ صلاح دی جا سکتی ہے کہ ان ہی کتابوں کو استفادۃً پیش نظر رکھیے۔

میں ایران کی سیاسی اور وطنی شاعری کا ذکر کر رہا ہوں۔ درمیان میں یہ فقرہ معترضہ آ گیا۔ براؤن نے کثرت سے جدید شعراء کے کلام کے نمونے بہم پہونچائے ہیں شاعروں کی عکسی تصویریں بھی شامل ہیں۔ جا بجا ترجمہ اور حواشی سے رونق بڑھائی ہے اور کیمبرج کے خوبصورت، جدید الوضع نسخی ٹائپ کی جلوہ گری سے تو یہ حصہ بالکل مرصع اور رنگا رنگ ہو رہا ہے۔ نمونتہً ایک نظم کے چند اشعار دیکھیے۔ مزید اقتباسات سے کتاب کا لطف کھونا نہیں چاہتا۔

در پردۂ افشار

نمی دانم چرا ویرانہ گشتی؛ وطن — مقام شکر بیگانہ گشتی! وطن

تو شمع جمع ما بودی وطن جان بچرا؟ — بہ شمع دیگراں پروانہ گشتی! وطن

خوشا روزے کہ بودی شاد و خنداں وطن — شکستی عصم را چنگال و دنداں وطن

تو بودی سر بلند افسوس افسوس وطن — در افتادی بہ حال مستمنداں وطن

وطن جاناں اے وطن جاناں اے وطن جاں من — پرستار من و گہوارہ جنبان من

زجور دشمناں ویرانہ گشتی؛ وطن — بہ فرزنداں چرا بیگانہ گشتی؟ وطن

(پروانہ گشتی ؟ وطن، ویرانہ گشتی وطن)

مکرّر

یہ ساری نظم جس حد تک جذبات میں ڈوبی ہوئی ہے اہل نظر کے مذاق پر چھوڑتا ہوں، کبھی کبھی افراد سادگی غایت نزاکت اور آرائش کا کام دیتی ہے لیکن ہندوستان میں بیٹھ کر اس کا اندازہ ممکن نہیں۔ یہاں بیکار تغزل کے سوا جس میں کوئی خاص جذبہ یا سلسلہ خیال نہیں ہوتا، شاید ہی نظم ہے جس میں شاعر کہنا نہیں چاہتا کچھ اور جانتے ہی نہیں۔ اور یہ لٹریچر کی بڑی سے بڑی حق تلفی ہے جو اس فرقہ کے ہاتھوں ہو رہی ہے لیکن خوش ہوں کہ اس ادبی بے نظمی میں ایک فرمانروائے سخن یعنی اکبر اعظم موجود ہے جو فطری شاعر ہے اور جس کا کلام عصری جذبات و خیالات کا مرقع ہوتا ہے اور بڑی بات یہ ہے کہ بے غایت نہیں ہوتا۔ آپ فن کے دفتر کہہ جائیے اور بدنصیبی سے

میری سمجھ میں نہ آئے تو میرا قصور نہیں۔ کیونکہ میرا دعویٰ یہ ہے کہ شعر سے آپ کو کچھ کہنا ہی مقصود نہیں تھا۔

کسی خاص ردیف و قافیہ کے ساتھ چند الفاظ جو اتفاق سے کھپ سکے اس کی پیوندکاری سے دو مصرعوں کی تیاری اگر شاعری ہے تو میں بلا خوف تردید یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ "این بجوتے ما نمی آرزد" لیکن بجائے اسکے کہ آپ میرے سر ہوں میری خاطر سے مان لیجیے کہ وقت کا اقتضا کچھ اور ہے، محدود دائرہ سے باہر نکلئے اور دیکھیے اعلیٰ تر لٹریچر کے حقوق کیا چاہتے ہیں؟ ورنہ یاد رکھیے! نظم تو آپ کی جان کو رو چکی، نثر کو ایک دن آپ روتے رہ جائیں گے۔ ہاں! میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ اکبر کے خیالات دراصل شاعرانہ لٹریچر کے انتقادات عالیہ (یعنی ہائر کرٹیسزم) کا درجہ رکھتے ہیں۔ نہ جہاں شاعر ہیں ادیب بھی اور ادیب بھی اس پایہ کے کہ معمولی صحبتوں میں جو فقرے ان کی زبان سے نکلتے ہیں۔ انشاپردازی کے جواہر ریزے ہوتے ہیں۔ اس قدرتی موزونیت کے ساتھ جب شوخی لٹریچر کی بلائیں لے رہی ہو، میں نہیں جانتا کہ اس شعر کے پتلے کی موزونیت کے لئے باقی رہا؟ لیکن اکبر کا فضل و کمال ضمنی اظہار نہیں چاہتا، کبھی مستقلاً دیکھیے گا۔ بہرحال ملک کی عام وبائے بدمذاقی میں ایک شاعرانہ شخصیت ایسی ہے جس پر ہم ناز کر سکتے ہیں اور جو اپنے مذاق خاص کے لحاظ سے نئے اور پرانے خیال والوں کی ملک مشترک ہے۔

لیکن اس آفتاب شاعری کے گرد ضرورت تھی کہ بہت سے ثوابت[1] اور سیارے

---

[1] ثوابت حرکت نہیں کرتے۔ یہاں ان سے قدیم شاعری کے دلدادہ مراد ہیں۔ برخلاف کے سیارے چلتے پھرتے رہتے ہیں ان کو نئی شاعری کا نقیب سمجھیے۔

حلقہ زن ہوتے۔ تو ایت کی تو ماشاءاللہ کمی نہیں مدت سے ایک لفظ پر ٹھہرے ہوئے ہیں۔ لیکن تعجب ہے کہ سیارے کافی نہیں! اگر ہمیشہ ایک ہوگا۔ لیکن افسوس ہے اگر ہم متعدد "اقبال" پیدا نہ کر سکے۔

یں سلسلہ سے بیراگ ہوگیا۔ لیکن منہ پر آئی ہوئی بات رکتی نہیں) - ایران کی شاعری کی داد دینا چاہتا تھا کہ اپنی "شامت اعمال" یعنی یہاں کے بیکار مشغلہ نظم کا رونا لے بیٹھا۔ لیکن میرے لئے یہ کچھ ناگزیر سا ہے آپ اسے خارج از موضوع نہ سمجھئے ورنہ دھوکے میں رہیئے گا۔ برادن کی تقریب کی علت غایت بھی اتنی ہی ہے کہ آنکھیں کھول کر دیکھئے۔ دوسرے کیا کر رہے ہیں اور آپ کو کیا کرنا ہے؟ ورنہ ساری دردسری بیکار جائے گی۔

ایران کی دور جدید کی شاعری کا ایک نمونہ آپ کے سامنے ہے اب میں براؤن کے فارسی دیباچہ کے چند اجزا کہیں کہیں سے دکھاؤں گا جس سے معلوم ہوگا کہ ان کو زبان پر کس قدر قدرت ہے۔ ہندوستان میں بہت سے اہل کمال پیدا ہوئے جو فارسی نظم و نثر یعنی لٹریچر میں داد سخن دیتے رہے۔ لیکن معلوم نہیں "بابو انگلش" کی طرح ان کی فارسی اہل زبان کی نظروں میں کہاں تک لائق تسلیم رہی؟ ہم اس زمانہ میں دیکھتے ہیں کہ بڑے سے بڑا تعلیم یافتہ جس نے ہندوستان میں اعلیٰ درجہ کی ڈگریاں لی ہوں دو فقرے بھی انگریزوں کی طرح بول یا لکھ نہیں سکتا۔ یہ ایک تاریخی سوال ہے کہ ہندیوں کی گذشتہ فارسیت جس کا ایمان بالغیب کی طرح لوہا مانا جاتا ہے اہل زبان یعنی ایرانیوں میں کہاں تک وقعت حاصل کر سکی۔ شبلی نے غالباً اس موضوع پر قلم آزمائی نہیں کی ورنہ بحث ہمیشہ کے لئے طے ہو جاتی۔ بہرحال ایران کی نئی زبان بالکل ایک جلیہ بیگانہ

چیز ہے اور ہندوستان میں سنجیدہ خیال علماء کو شک ہوگا کہ برا ؤن اتنی اچھی فارسی لکھ سکتے ہیں۔ فاضل پروفیسر کہتا ہے۔

مقصد اصلی از جمع و نشر ایں اشعار آنست کہ برائے برخی از متتبعین ادبیات ایران کہ اغلب منکر وجود روح ادبی در ایران کنونی بودہ۔ وجود شعر و شاعر را دریں قرون اخیرہ در آن سرزمین معدوم می پنداشتند، ثابت نمایم کہ آن طبع گہربار ایرانی کہ اشعار آبدار قدیمہ وجود آوردہ بودہ است "ہنوز گویندگان ہستند اندر عراق کہ قوت ناطقہ مدد از ایشان بردہ کہ از زیر آں ہمہ ابرہائے تاریک کہ صفحات ایں مملکت را فراگرفتہ باز آں روح فنا ناپذیر مانند آفتابے کہ زیر ابر نہفتہ پس از چندے با یک پرتو عالم فروزی دیگر جلوہ گر گشتہ است"۔

اغلب مستشرقین کہ زحمت تتبع ادبیات جدیدۂ ایران را بخود نداده اند چنیں تصور می کنند۔ کہ طوطی شکر گفتار شعرا و ادبائے اعصار گذشتہ ایران از نطق فروماندہ و چندیں قرن است کہ دریں چمن خزاں دیدہ بلبلے بہ ترنم نیامدہ و شاید ہم ہیچ نخواہد آمد، ولے ایں جانب کہ از سی و سہ سال بدیں طرف عمر خود را صرف تحصیل ایں زبان کردہ بواسطۂ کثرت معاشرت با آقایان ایرانی ما اندازۂ با اشعار و ادبیات جدیدہ مربوط شدہ چاشنی آن را چشیدہ بایں عقیدۂ اشتراک ندارم و قبول دور از انصاف حقیقت می دانم و کسانے را کہ برحسب عدم اطلاع چنیں عقیدہ اظہار می دارند معذور می دارم" و عدم الوجدان لیس دلیلاً علی عدم الوجود را

متذکرہ

ذوقیست دریں بادہ کہ مستاں دانند

اینک نمونہ از ادبیات وطنی و سیاسی راکہ آں ثمرۂ انقلاب اخیر ایراں باید شمرد برائے اثبات عقیدۂ خود بنظر ارباب تتبع می رسانم تا ہیچ شکے کہ بجود بخود بوید آنچہ راکہ من ہنوز نگفتہ در دل دارم بزبان خود بگوید

"ایں نمونۂ ادبیات جدیدہ بخوبی ثابت می کند کہ روح شعر و طبع سخن پروری در ایران معدوم نشدہ سہل است کہ بواسطۂ شوق ایں انقلاب اخیر رونق تازہ یافتہ و تاثیر بزرگی در آئینۂ ایں ملت بظہور خواہد آورد اگر درست دقت کنیم خواہیم دید کہ ایں اشعار جدیدہ دارائے دو صفت ممتاز است کہ در ادبیات قدیمہ موجود نبودہ و بہماں نسبت شاید تاثیر آتش در طبقۂ عامہ بیشتر باشد"

اس دعویٰ کے بعد کہ ایرانیوں میں جذبات شاعری بدستور زندہ ہیں۔ براؤن پرانی شاعری پر نئی شاعری کو جن وجوہ سے ترجیح دیتے ہیں ان پر اچھی طرح غور کیجیے

"اولاً از حیث موضوع، موضوعِ اشعار قدما تقریباً عبارت بود از مدائح بادشاہاں و بزرگاں و غزلیات و اخلاق و فلسفہ و تصوف، و آنچہ راجع با وضاع و احوال معاشیہ برشتۂ نظم در آوردہ اند نسبتہً کم است، اگرچہ ہمیں ادبیات ملاء افتخار ابدی ایران بودہ و زبان فارسی را تا امروز نگاہ داشتہ است ولے از جہت تاثیر خارجی در اوضاع اجتماعی مردم گویا چنداں ثمر ندادہ است زیراکہ دائرۂ انتشار

آں محدود و منحصر بطبقۂ عالیہ و عالمۂ ملت بوده و فوائدش تعمیم نداشته است" تجارب تاریخی و جریان اوضاع اجتماعی ملل در این قرون اخیره بخوبی نشان می دہد که موثر حقیقی در گردانیدن چرخ حیات اجتماعی یک ملت عامه یعنی طبقات اواسط و ادانی آں ملت است و چنانچہ امواجے که روئے دریا بتلاطم آورده و بزرگترین کشتی ها را بازیچۂ طوفان خود می سازد، ہمانا امواجے است که از قعر دریا و طبقات پائین آں بالا می آید ہمچناں طبعاً در انقلابات سیاسی انقلابے که ثمرہ خوب می دہد انقلابے است که در سایہ جنبش طبقۂ عامۂ ملت بظہور رسیده و الا انقلابے خواہد بود فارس و تنہا بہنگام و سطحی که مانند امواج سطحی دریا ہرگزاں قوت را نخواہد داشت که بنائے استبداد و خرافات متراکمۂ چندین قرن را از بیخ براندازد۔

ازیں رو طبقۂ عامۂ ملت بیشتر از طبقات دیگر باید منظور نظر ارباب سخن و واعظین و مخصوصاً شعرا و ادبا باشند من چنیں تصور می کنم که در عالم ملتے نیست که بقدر ملت ایراں مجذوب شعر باشد، و شعر در طبیعت ایرانی جاذبہ مخصوص دارد، که کمتر نظر آں در سائر اقوام دیده شده است ازیں نقطۂ نظر شعرائے که اصلاح حال طبقۂ عامۂ ملت را در نظر دارند مرجح بر دیگراں می باشند، در میان ایشان و سائرین که جز مدح و اخذ صلہ ہنری ندارند، ہماں فرق است که میان زاہد خودست و عالم دانش پرور! و ما می بینیم که ادبا و شعرائے عصر حاضرین بدیں نکتہ برده اند یعنی ابکار معانی را از آں دائرۂ محدود بیروں آورده و خوان النوال

نظم را بیش خاص وعام گسترده، طبقۂ عامہ را از آں برخوردار کردہ اند
اغلب موضوعات ایں ادبیات را از وقائع یومیہ در اجع بمسائل
معاشی واجتماعی گرفتہ اند کہ ہر ایک از افراد ملت می تواند بدون
صعوبت درک نماید واگر ہمیں اشعار را کہ از ابتدائے انقلاب ایران
تا امروز انشاد شدہ جمع آوری کنند۔ تقریباً تاریخ منظوم انقلاب را تشکیل
خواہد داد۔[1]

از فوائد کثیرہ انقلاب سیاسی ہمیں بس کہ چنیں ادبیات بکری بوجود
آوردہ است کہ در سایہ آں یک خلق جدید ویک استقبال پر امید ظہور
خواہد یافت۔"

دور جدید کی شاعری کی ترجیح میں برادران یوں عزیز گہر فشانی کرتے ہیں۔
ثانیاً از حیث اسلوب نیز آن ادبیات جدیدہ یک تازگی و اہمیت خصوصی
دارد و آن اینست کہ در اغلب اشعارے کہ دریں دور جدید سرودہ
اند حقیقت را برائے اینکہ ہمہ کس نتواند فہم نماید در لباس شاعرانہ مزاح

---

[1] اس طرز ادا میں آپ سہ نثر ظہوری کے ٹھاٹھ میں نہ ڈھونڈھیے نہ انشائے مادھو رام کا تذکرہ ملاحظہ کیجیے، آج کل کا معیار بلاغت یہ نہیں ہے کہ کثرت الفاظ میں شعر سے مفہوم غائب۔ بے معنی الفاظ کا انبار ہے کہ لگا ہوا ہے اور نفس مطلب کا پتہ نہیں۔ ایران کی خالص زبان کو فردوسی کی نظم اور سعدی کی نثر میں دیکھیے، جس کا تتبع، سلیقہ، غیر یعنی باہر والوں سے کبھی نہ ہو سکا۔
آجکل کی فارسی مغربی زبانوں کی طرح سستہ، رفتہ تکلفات سے معرا اور ایک دم سے ادائے مطلب پر اس حد تک قادر ہے کہ ہم کو اس کے اندازہ کے لیے بھی ایک ماننا چاہیے

جلوہ دادہ اند و بایکے از پردہ ہائے موسیقی ہم آہنگ ساختہ اند تا بآسانی قبول عامہ بہم رسانند"۔

"بدیہی است کہ شخص ہر قدر دارای اخلاق حمیدہ و تہذیب نفس باشد، بازوے راشنیدن عیوب خود بے پردہ چنداں خوش آیند نخواہد بود و حقیقت گوئی دروے تاثیری چنداں نخواہد کرد، ولی در شکل ہزل و مزاح آں را میل و رغبت خواہد خواند و البتہ بے تاثیر ہم نخواہد ماند"۔

"شعرائے ایں دورہ کہ ایں اسلوب مرغوب ایشاں گرفتہ اند بمنزلہ طبیب حاذق می باشند کہ مزاج مریض خود بدست آوردہ و موافق آں ادویہ تلخ را باشیرینی آمیختہ بہ مریض می خورانند و یا مانند واعظے کہ درجہ ادراک مستمع را درک کردہ بقدر فہم او بہ سادگی تمام مقاصد خود را ادا می نماید و عامہ ملت خواندہ و بحقیقت مسائل سیاسی و وطنی و معاشی واقف شوند، چنانچہ غزلیات و قصائد عارف و اشرف و ملک الشعراء بہار و غیرہم در سایہ ایں اسلوب مرغوب از قرارے کہ می نویسند امروز در نزد خاص و عام مشہور است و در محافل می خوانند و باآلات موسیقی می نوازند"۔

"ایں جانب بترتیب ایں نمونہ مختصر از ادبیات وطنی و سیاسی فارسی نظر وقت مستشرقین و متتبعین ادبیات فارسی اجلب نمودہ و ملت ایراں را نیز از صمیم قلب تہنیت می گویم کہ چنیں نوع درس

بکر معرفت بمنصۂ ظہور جلوۂ آوردہ است' واز خداوند خواہانم کہ امثال ایشاں را بیفزایدؔ[1]"

میں امید کرتا ہوں، اقتباس بالا ناظرین کی گراں خاطری کا سبب نہ ہوگا مسلمانوں کے جب دن اچھے تھے تو فارسی ان کے گھر کی کنیز تھی۔ ملت ہوئی یہ پہلی صحبتیں درہم برہم ہوگئیں۔ نہ وہ خیالات رہے نہ اظہار خیال کے گذشتہ وسائل رہے اب تو یہ حالت ہے کہ "روزمرہ" زبان غیر ہو رہا ہے۔

"قیاس کن زگلستان من بہار مرا"

لیکن جس فارسی کے براؤن دلدادہ ہیں وہ اب بھی زندہ ہے اور وہ کمال شیفتگی سے اسے زندہ ہی دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور یہی شرافت نفس ہے، جس کی وجہ سے میں اس زبردست مستشرق کو نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ ملک کے جرائد عصریہ میں بہت کم ایسے ہیں جو اس فاضل پروفیسر کو جانتے ہیں یا جاننا چاہتے ہیں۔ یہ غنیمت ہے کہ "نقاد" کے ذریعہ سے تقریب ہوگئی۔ کارنامے پھر دیکھئے گا۔ چند فقرے اور لیجئے! اور ان ہی پر خاتمہ ہے۔

---

[1] یاد رکھئے! فارسی میں یائے مجہول اور واو مجہول کی آواز نہیں ہے برخی، چندی، خیلی تا شیری دلی کو کسی موقع پر ہو، برخے، خیلے، تاثیرے، ولے نہ پڑھئے۔

اسی طرح نوش، پوش، افسوس کو بھی اس طرح ادا کیجئے۔ جیسے "جاسوس" کو (جن حرفوں میں اضافت زیر ہو۔ ان کو یوں پڑھئے گویا آخر میں (ی) لگی ہوئی ہے)، ورنہ براؤن کی روح کو صدمہ ہوگا۔ اور نا طقہ ایران علیحدہ آپ کا شاکی ہوگا۔

براؤن کا خیال ہے جس طرح یونانیوں نے یورپ میں نسل انسانی کے روحانی دماغی اور صنعتی تمول میں اضافہ کیا ہے اور وہ ہماری ہمدردی کا خاص حق رکھتے ہیں یہی حال ایران کا ہے تمام اقوام قدیم میں جن کے نام سے ہم آشنا ہیں۔ ایران ہی ایک ملک ہے جو اب بھی اپنی حدود میں ایک خودسر سیاسی وجود رکھتا ہے گو اس کا رقبہ حکومت دارائے اعظم کے باجگذار صوبوں کی لمبی چوڑی فہرست کے مقابلہ میں جو باغستان یا بیستوں پر کندہ ہے۔ بہت کچھ گھٹ گیا ہے۔ تاہم اس میں ایک ایسی قوم آباد ہے جو ہر طرح کی آفات اٹھانے کے بعد بھی اپنے اسلاف سے حیرت انگیز اشتراک خصائل و اوصاف رکھتی ہے۔

ایران پر بار بار چڑھائی ہوئی، یونانی مغل، ترک، تاتار، بلا ریں اٹھے اور اسے پامال کرتے رہے جس سے یہ عظیم الشان سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہوتی رہی لیکن یہ ہمیشہ ان آزمائشوں سے بچ بچا کر ایک جداگانہ قوم کی حیثیت سے جو خاص طرح کے خصائص کا مجموعہ ہو۔ اپنا وجود انفرادی قائم رکھ سکی۔ براؤن کہتے ہیں کہ ان کو ایران کی سیاسی ہستی سے اتنی غرض نہیں جس قدر اس کے دماغی اثر پر اصرار ہے اور ان کا دعویٰ ہے کہ ایران نے جس قدر دنیا کے دماغی اور اخلاقی افق کی توسیع کی ہے اسکے اندازے کے لئے ہم کو تاریخ کے ہزارہا صفحے الٹنے پڑیں گے۔ وہ مذہب زرتشت کے ذکر کے بعد جس سے مذاہب عالم میں ایک دلچسپ اضافہ ہوا۔ خود اسلام کی خیال آفرینیوں کی شاخہائے متعددہ کا نام گنواتے ہیں۔ صوفیہ۔ اسماعیلیہ، بابیہ، حروفیہ یہ سب کی سب ایرانی جدت پسند دماغ کی مابعد الطبعی موشگافیاں ہیں۔ اسلام کے وسیع دور میں عربوں کی سیدھی سادی زندگی صرف عجمیوں کی بدولت آشنائے تمدن ہوئی ایک

لٹریچر ہی کو دیکھیے! اگر عجمیوں سے قطع نظر کر لی جائے تو عربوں کے پاس فخریہ قصائد کے بعد ایک ظریف کی رائے کے مطابق صرف اونٹ کی مینگنیاں اور ان کی تشبیہات متنوعہ رہ جائیں گی!

عجمیوں کے طفیل میں ہم کو فردوسی، سعدی اور حافظ اور پچھلے دنوں انگلوسیکس اقوام کو عمر خیام سے شاعر ملے، جو دنیا کے شعرائے طبقۂ اعلیٰ میں شمار ہونے کے لائق ہیں۔ موجودہ سائنس ایران کا منت کش نہیں ہے، لیکن ابن سینا کا نام ہی اس بات کے یاد دلانے کے لیے کافی ہے۔ کہ ازمنۂ متوسطہ کے یورپ اور ایشا کو فلسفہ اور طب کے لیے جو اس وقت تک دنیا کو معلوم تھا کہاں تک ایک **فرزند ایران** کا ممنون احسان ہونا پڑا۔

آہ شبلی! ایرانی لٹریچر کے دور جدید کا ذکر ابھی ہو ہی رہا تھا کہ غیر متوقع صدمہ یہ پہونچا کہ علامہ شبلی نعمانی نے ترک رفاقت کی۔ آہ یوں سمجھیے کہ اردو لٹریچر کی ناک نہ رہی۔ روح تاریخ نکل گئی۔ اور علم مرگیا۔ مجھ پر معلم شبلی کی رحلت کا اسقدر سخت اثر ہے کہ پڑھنے لکھنے کا مشغلہ باقی رہنا معلوم نہیں ہوتا۔ جسے میں لٹریچر سمجھتا تھا یقین سمجھیے مرحوم کے ساتھ دفن ہوگیا۔ اور میری ادبی لذتوں کا ہمیشہ کے لیے ایک دم سے خاتمہ، جی چاہتا ہے مرثیہ نثر لکھوں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے قلم اپنی رفتار بھول گیا گھنٹوں غائب رہتا ہوں، خیال عبارت آرائی تو خیر معمولی ترتیب الفاظ سے بھی عاری ہو رہا ہے ملک میں اب کوئی نہیں رہا، جس کے نتائج فکر پر میں لٹریچر کا اطلاق کرسکوں جس کے بل بوتے پر جیتا تھا اور ایک دنیا کو حرف غلط سمجھتا تھا وہ میرے ذوق ادب کو اپنے ساتھ پیوند خاک کر چکا۔ شبلی! ہائے شبلی کو کہاں سے اٹھا لاؤں؟

یوں تو تمام عمر شبلی کی یاد میں آنکھیں خشک نہیں ہوں گی۔ لیکن ہائے سب سے زیادہ غم یہ ہے کہ سیرۃ نبوی کی تکمیل اب قیامت تک ہو چکی! خدا جانے کس عالم میں بھولا نانے مرحوم نے یہ پیشین گوئی کی تھی جو آج حرف بہ حرف پوری ہوتی معلوم ہوتی ہے:

فرشتوں میں یہ چرچا تھا کہ حال سرور عالم
دبیر چرخ لکھتا یا کہ خود روح الامیں لکھتا۔

صدا یہ بارگاہ عالم قدوس سے آئی
کہ یہ ہے اور ہی کچھ چیز لکھتے تو ہمیں لکھتے

زندگی میں اس مرد مسلمان کی یہ قدر کی گئی کہ اسے "کافر" بتایا گیا، جس پر شرافت علم دیکھیے! مولانا شرر کو کہنا پڑا "یہی کافر ہے مسلماں سچا" آج کون ہے جو مرحوم کے تمہ خیر ہونے سے انکار کی جرات کر سکتا ہے آخری شعر جو مرنے والے کی زبان سے نکلا تھا جسے ضامن مغفرت سمجھیے!

اس نظم مختصر کا یہ مسک الختام تھا
صلوا علی النبی واصحابہ الکرام

فہرست تصنیفات و تالیفات

ایڈورڈ براؤن پروفیسر عربی و فارسی یونیورسٹی کیمبرج

۱۔ ایک سیاح کی سرگذشت
اصل فارسی میں ہے، معہ ترجمہ انگریزی مقدمہ و حواشی متعلق فرقۂ بابیہ
۲ جلد، ۵ شلنگ

۲۔ ایک سال ایرانیوں میں
ایرانیوں کی زندگی، ان کے خیالات و عادات و خصائل کا مرقع، ایران میں ایک سال رہ کر یہ کتاب لکھی، ۲۱ شلنگ

۳۔ تاریخ جدید یعنی تاریخ مرزا محمد علی باب
معہ ترجمہ و حواشی وغیرہ، ۱۰ شلنگ ۶ پنس

۴ فہرست مسودات عربی
(کتب خانہ یونیورسٹی کیمبرج)

۱۵ - شلنگ

۵ فہرست مسودات فارسی،
(کتب خانہ یونیورسٹی کیمبرج)

۱۵ - شلنگ

۶ ایران کی ادبی تاریخ

نہایت معرکۃ الآراتصنیف ہے ۔ اسلامی لٹریچر کے متعلق اتنا بڑا سرمایہ کسی زبان میں یک جا نہیں ملے گا۔ نہ کسی نے مسلمانوں کی دماغی تاریخ اس طرح لکھی ۔ سچ یہ ہے براؤن نے کچھ نہیں چھوڑا، کتاب کے نام میں ایران کی تخصیص غالباً عجمی عناصر کو ابھار کر دکھانے کے لئے ہے ۔ براؤن کو عربی الفاظ اور ناموں کی صحت کا اس قدر خیال ہے کہ ان کا طے کردہ نصاب یورپ میں رائج ہوگیا ہے۔ یہ ایک سخت مشکل تھی جو انگریزی کے حرکات بالحروف نے طے کردی، اس کتاب میں ہر طرف اس کے قیمتی آثار ملیں گے ہزارہا نام تھے جن کے صحیح اعراب کا پتہ کسی عربی لغات سے بھی نہیں چلتا تھا ۔ غیر عربی دانی کے ساتھ بھی یہ حق حاصل تھا ۔ کہ مفہوم کے جاننے سے پہلے الفاظ کا صحیح تلفظ ممکن ہو، اب ہمارے لئے صرف اس کتاب کا انڈکس کافی ہے ۔

۲ جلدیں ۔ ۲۵ شلنگ ،

۷ مختصر تاریخ طبرستان (مصنفہ محمد بن حسن بن اسفندیار)

۸	انقلاب ایران سنہ ۱۹۰۹ء سنہ ۱۹۱۰ء	دونوں کتابیں "عروس جمیل ولباس حریر" مصنف کے عالمانہ خیالات کے ساتھ صنعت کا بہترین نمونہ ہیں۔ نہایت کثرت سے عکسی تصویریں ہیں۔ بعض کارٹون ہیں جن سے ایرانی زندگی کا کوئی دلچسپ رُخ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے
۹	ایرانی صحافت اور شاعری کا دورِ جدید سنہ ۱۹۱۴ء	میں صرف ایک کا ذکر کروں گا۔ "قبل عہد الزفات" (یعنی ہون) آغا یعنی شوہر نو عروس کی پیشوائی کے لئے گھر سے باہر نکل آیا ہے اور سامنا ہوتے ہی کشیدہ قامتی، جھک کر رسم خیر مقدم ادا کرتی ہے۔ "بعد عہد الزفات" آغا صاحب کے ایک ہاتھ میں ڈنڈا ہے اور دوسرے ہاتھ میں "گلبنہ احترام" کی کاکل عنبریں، جس دروازے سے آئی تھی اسی طرف سے نکال رہے ہیں"۔ بعض قدیم کتبوں کے عکس ہیں جن کی اہمیت کے اندازے کے لئے براؤن کے سے تبحر علمی کی ضرورت ہے۔ جلد شوخ سرخ حاشیۂ بالائی۔ اور نام کے حروف مطلا معہ طغرے زرکار۔ قیمت ۱۵ و ۱۲ شلنگ

۲، ایران کا سلسلۂ تاریخی

جو براؤن نے اپنی ایڈیٹری میں شائع کیا

۱۔ تاریخ الشعرا (دولت شاہ سمرقندی)	، شلنگ ۶ پنس
۲۔ لباب الالباب (مصنفہ محمد عوفی)	قدیم ترین تذکرہ شعرائے فارسی جو ۱۲۲۱ء سال لبعید

مرتب ہوا تھا۔ ۲ جلد، ۱۵ شلنگ

۳ تاریخ الاولیار ۲ جلد، ۱۵ شلنگ
(شیخ فریدالدین عطار)

۳- فارسی کتابیں

جو گب میموریل کیلئے تنہا یا باعانت مرزا محمد قزوین، براؤن نے شائع کیں

۱ مرزبان نامہ کتاب القصص ۸ شلنگ
(مصنفہ سعدالدین وراوینی)

۲ المعجم فی معایر اشعار العجم فارسی میں عروض کا ایک نایاب اور قدیم نسخہ جو شمس الدین محمد بن قیس الرازی نے لکھا تھا۔ ۸ شلنگ

۳ چہار مقالہ معہ ترجمہ مقدمہ و حواشی ۸ شلنگ
(مصنفہ نظامی العروضی سمرقندی)

۴ تاریخ گزیدہ ۱۳۳۰ برس بعد مسیح کی تصنیف، مسودات اصلی کا عکس معہ ترجمہ و حواشی
مصنفہ (حمد اللہ مستوفی قزوینی) ۲ جلد۔ ۲۵ شلنگ

۵ کتاب نقطۃ الکاف فرقہ بابیہ کی قدیم تاریخ جو ۱۸۵۰ برس بعد لکھی گئی۔ ۸ شلنگ
(مصنفہ حاجی مرزا جانی کاشانی)

۶ تاریخ جہاں کشا ۱۲۶۰ سال بعد مسیح کی تصنیف ہے۔ جلد اول

مصنفہ علاء الدین عطا ملک جوینی — شائع ہو چکی، دوسری پریس میں ہے، تیسری زیرِ ترتیب ہے — فی جلد ۸ شلنگ

۴ - مضامین

جو براؤن نے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالہ میں وقتاً فوقتاً لکھے۔

۱ ایران کا فرقۂ بابیہ،

۲ بابی لٹریچر پر انتقاد،

۳ فہرست معہ تصریحات متعلق ۲۷ مسودات فرقۂ بابیہ،

۴ ایک قدیم فارسی تفسیر القرآن کا تفصیلی بیان،

۵ ایران کی شکمی زبانوں پر انتقاد۔

۶ یادداشت ذاتی متعلق فرقۂ بابیہ ۱۸۵۰ء بمقام زنجان،

۷ ایران کی گبری زبان کا نمونہ،

۸ فرقۂ حروفیہ کے لٹریچر اور ان کے مسلمات پر اظہار خیال،

۹ ماخذ دولت شاہ،

۱۰ کچھ اور روشنی عمر خیام پر،

۱۱ چہار مقالہ،

۱۲ نہایۃ الارب فی اخبار الفرس والعرب،

۱۳ تذکرۂ شعرائے فارسی،

۱۴ تاریخ اصفہان کے ایک نایاب نسخہ کا بیان،

۱۵ تاریخ سلجوق کے ایک نایاب نسخہ کا بیان،

۱۶ مضامین تاریخ جہاں کشا پر انتقاد،

۱۷ ناصر خسرو بحیثیت شاعر اور سیاح،

۱۸ مسعود سعد سلمان مصنفہ مرزا محمد بن عبدالوہاب قزوینی،

۱۹ مزید انتقاد لٹریچر فرقہ حروفیہ اور ان کا تعلق بکتاشی فرقہ درویشاں سے،

۲۰ جامع التواریخ مؤلفہ رشید الدین فضل اللہ کے نسخہ کامل کی تحریکات شائستہ،

۵۔ سیاسی رسائل

(متعلقہ ایران)

۱ سرگزشت مختصر واقعات عصریہ ایران

۲ ایرانی مصائب دسمبر سنہ ۱۹۱۱ء

۳ سانحۂ تبریز معہ فوٹوگراف، متعلق واقعات دسمبر سنہ ۱۹۱۱ء اور جنوری سنہ ۱۹۱۲ء

۶۔ مضامین

جو یورپ کی پرشین سوسائٹی کے لئے لکھے اور شائع کیے گئے

۱ ایران کا لٹریچر ۲۔ ایرانی مطبع اور ایرانی صحافت

۷۔ ترکی شاعری کی تاریخ

معرکہ کی تصنیف ہے، جو یورپ کے مصنفین کے لئے دلیلِ راہ بنی ہے۔ مسٹر گب نے

۶ جلدوں میں لکھی تھی۔ ساتویں جلد جس میں دورِ جدید کے شعراء کا تذکرہ ہے۔ ڈاکٹر رضا توفیق نے بڑھائی۔ پروفیسر براؤن نے اس کی بعض جلدیں نظرِ ثانی کے بعد بڑی آب و تاب سے شائع کی ہیں۔ کچھ زیرِ ترتیب ہیں۔ متن معہ ترجمہ و حواشی، قیمت بلحاظ اختلافِ ضخامت ۲۱، اور ۲ اشلنگ ۶ پنس۔

نوٹ:۔ براؤن کے نتائجِ فکر کی یہ غیر معمولی تفصیل "بھرتی" کی حیثیت سے نہیں ہے بلکہ میری غایت یہ ہے کہ ملک کے اچھے لکھنے والوں کی جنبشِ قلم کے لئے کوئی ایسی داغ بیل ہاتھ آئے۔ جو بلحاظ سنجیدگی فاضل پروفیسر کے دماغی آثار سے ملتی جلتی ہو۔ میرا خیال ہے یہ تصریحات ایک کافی حد تک رہبری کریں گی۔

ہمارے ہاں دو چار معزز مستثنیات کے سوا عموماً اہلِ قلم صحیح قوتِ فیصلہ نہیں رکھتے، یعنی اپنی استعداد کا مصرف صحیح نہیں جانتے، اور یہی وجہ ہے کہ انکی پیداوار دماغی بلحاظ اوصاف و مقدار عموماً دوم درجہ کی ہوتی ہے۔ معلومات کی اتنی کمی نہیں جس قدر انضباطِ خیال اور قوتِ اجتہادی کی ضرورت ہے۔ اور یہ اسی کی بھڑکار ہے کہ ایک مصنف اپنے مادۂ فطری سے وہ کام نہیں لے سکتا جو اس کی قابلیت کا اقتضائے طبعی ہے۔

یہ تو مستقل مصنفین کی حالت ہے صحافت یعنی مضمون نگاری اس سے بھی گئی گزری ہے کثیر و بےدار لٹریچر کی ایک مقدار کثیر ہے جو جرائدِ عصریہ کے ہاتھوں ملک میں تقسیم ہوتی رہتی ہے۔ اور چونکہ لکھنے والے کسی موضوع پر تیار نہیں ہوتے، یعنی قلم اٹھانے سے پہلے پڑھتے نہیں۔ اس لئے ان کے خیالات و مقالات کا زیادہ تر حصہ سطحی ہوتا ہے، نتیجہ معلوم ہے اور اس کے سوا ہونا بھی کیا ہے؟ کہ جس پرچہ کو دیکھئے

نذر بے قدری ہو رہا ہے! عوام کو دلچسپی نہیں. خواص اس لئے نہیں دیکھتے کہ اس میں کچھ ہوتا نہیں۔ بہرحال ضرورت ہے کہ ملک میں اعلیٰ تر لٹریچر کی طرف توجہ کی جائے اور اس کی صورتیں یہی ہیں جو کبھی کبھی مختلف عنوانوں سے آپ کے سامنے پیش ہوتی رہتی ہیں۔

(نقاد۔ ۱۹۱۴ء)

بنتِ عم

شررؔ نازک خیال شررؔ نے بھولا ہوا افسانہ یاد دلایا۔ اور دل سے ایک آہ نکل گئی، قوم جبتک صحیح المذاق تھی، ہمارے جذبات و خیالات، یعنی متعلقات زندگی کے جتنے لطیف صیغے ہو سکتے ہیں، اِن کا مرکز بھی" بنتِ عم" ہوتی تھی۔ عنفوان شباب کی خوش

لہ ایک سال سے زیادہ ہوا حضرت شررؔ نے "نقاد" میں ایک لاجواب مضمون لکھا تھا، جس میں عربی معشوقہ کی حیثیت سے "بنت عم" یاد کی گئی تھی۔ انگریزی میں "بنت عم" اور "ابن عم" دونوں کو "کزن" کہتے ہیں۔ اور یہ رشتہ اسقدر پیارا ہے کہ اکثر ایک کی ذات دوسری یا دوسرے کے لئے تمام دلچسپیوں کا جو خیال میں مرکز خاص ہوتی رہے۔

"بنتِ عم" کی تقریب سے خیال تھا مدعیان ادب اور ہمارے شعرا اس عنوان کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے، لیکن آج تک کہیں سے کوئی آواز نہیں آئی۔ اور تو خیر نیازؔ و دلگیرؔ نے دو مصرعے بھی موزوں نہ کئے۔

ایک فرنچ مصنف نے حال میں ایک کتاب لکھی ہے جس کے موضوع کا ماحصل یہ ہے کہ اخلاق کی تکمیل کی پہلی شرط یہ ہے کہ سوسائٹی کا ہر فرد کثرت فواحش سے محفوظ رکھا جائے اور چونکہ ضایعات کی تلافی نہیں ہوسکتی۔ اِس لئے مدار الحیات کا تحفظ فرائض انسانی میں سرفہرست ہونا چاہیئے۔ اس کا خیال ہے کہ یہ مقصد صرف پاک جذبات سے حاصل ہوسکتا ہے۔ یعنی ہم

فعلیوں کے لئے خوبصورت کنیزوں کے آئین مقررہ (سسٹم) نے راستہ صاف کر رکھا تھا۔ آج بھی ٹرکی میں کوہ قاف کی پریاں، یعنی سرکیشیا کی حوروش دوشیزہ لڑکیاں "حرم" کے ناگزیر لوازم سے ہیں۔ جن کی تربیت مغربی اصول پر ہوتی ہے۔ اور فنون لطیفہ کی وہ شائقین جو نسائیت کی جان ہیں ایک ایک کرکے ان کو سکھائی جاتی ہیں۔

شام کے لباس چست میں نیم برہنہ سینہ اور شانۂ عریاں کے ساتھ جب ایک زہرۂ شب۔ عالم رقص میں برقی روشنی کی ضیاء کو اپنے حسن شفاف کی تڑپ سے شکست دیتی ہے تو نوجوان آقا کے دل سے پوچھیے کہ "خیام" کی طرح "وعدۂ فردا (یعنی بہشت) سے کہاں تک ایک دم سے قطع نظر کر لینے کو جی چاہتا ہے۔

آج یہ "کنیز" جو اسلامی اخلاق کا ایک حکیمانہ عنصر تھی ہمارے لغات العیش کا ایک متروک الاستعمال لفظ ہے۔ لیکن "بنت عم" جو ہماری زندگی کی رفاقت اور تکمیل کیلئے

(بقیہ حاشیہ ۲۶۴) شروع سے کسی ایک کو اس طرح چاہیں کہ وہی ہماری زندگی کا نصب العین ہے اور دنیا کی تمام دلچسپیاں صرف اسی کے دم سے ہوں۔

مصنف نے پہلے اخلاق کے شہوانی حصہ کو لیا ہے اور دکھایا ہے کہ ایک تندرست اور خوبصورت لڑکی اگر پاکباز ہو ہمارے شہوت انگیز جذبات کی پوری روک تھام کرسکتی ہے بشرطیکہ ہم اسے دل سے چاہیں۔ اور وہ ہمارے عشق ازدواجی کا ایک ایسا قوی تخیل ہو جسکے سوا ہمکو کسی اور کا خیال تک نہ آئے۔ عشق اکتسابی جسے تعشق ازدواجی کہنا زیادہ صحیح ہوگا فی نفسہ کتنا ہی مفید ہو لیکن سوال یہ ہے کہ ہمکو یورپ کی طرح موقع کہاں حاصل ہے لیکن میں تو "خیالی بنت عم" سے کام چلاؤں گا۔ گو ڈرتا ہوں کہ "مارہرہ" اور "لکھنو" کی پن چکی سے کوئی آواز مخالف نہ آئے۔

کبھی ضروری تھی آج بھی ہے۔ زمانہ کی بدمزاقی دیکھئے، ہماری شاعری نے ایک اور "جنس مشترک" ایجاد کر رکھی ہے۔ یعنی سبزۂ رخان ہند کو محرم، کرتی، کنگھی، چوٹی سے آراستہ کرکے ہونٹوں میں مسّی مل دی یا سانولے رنگ کی کھپت کیلئے نمک کی گنجائش نکالی! عملاً کسی نے کچھ اور ترقی کی تو کرایہ کے ظرف یعنی ٹوٹے پھوٹے ٹھیکروں پر آرہے۔ اور ساری زندگی اس جنس رائج الوقت یعنی شاہدان بازاری میں سے کسی کے نذر کر دی۔ اس میں اچھے، بُرے، بڑے، چھوٹے کی تخصیص نہیں، مذاق عام ہے اور چونکہ تجربے قاعدگی سے انحراف کرتی ہے اس لئے جدھر دیکھئے، قوائے فطری قبل از وقت جواب دے رہے ہیں۔ طبلیوں کی گوبیوں پر ہوس کار رہ گیا ہے، لیکن میں آپکو حسن صبیح کا ایک پاکیزہ اور بالکل جداگانہ مرقع دکھانا چاہتا ہوں۔ سنیئے! عذرا یعنی "بنت عم" کا عاشق کیا کہہ رہا ہے؟

(عالمِ خیال میں)

میرے جذبات ہمسایہ اور پڑوس کی لڑکیوں کی اٹھان کے ساتھ ساتھ بڑھے ہیں۔ ایک ایک کو جانتا تھا اور سب کی خبر رکھتا تھا۔ ہر جوانی پر آئی ہوئی لڑکی یہ معلوم ہوتا تھا میری نشاط ہستی میں کچھ نہ کچھ حصہ رکھتی ہے لیکن دنیا دیکھنے کے لئے ہے برتنے کے لئے نہیں۔ میری زندگی کا اصلی تخیل صرف میری "بنت عم" تھی۔ ان دونوں لفظوں میں خدا جانے کیا جادو تھا۔ کہ میں ان پر جان دیتا تھا۔ چھریرے جسم کی گوری چٹی کشیدہ قامت لیکن وہ دبلی لڑکی میری آنکھوں میں پھرا کرتی تھی۔ میں سمجھتا تھا بڑھتی ہوئی عمر کا دبلاپا کیا! جوانی میں بھر کر اس کا حسن چودھویں کے چاند کو نہ دبائے تو بات ہے؟ آخر وہ وقت آہی گیا عذرا ۱۹ سالہ عذرا (خیر سے نہایت تندرست ہے) اور جوانی تو پھٹی پڑتی ہے اس کا

مقیاس الشباب میرے جذبات عشق کا گویا "مجسمہ" ہے، جس سے جوانانہ خوش فعلیاں میری بے لوث زندگی کا پاکیزہ مقصد ہوں گی۔ مدتیں اسی انتظار میں کاٹی ہیں، اب تو ضبط نہیں ہو سکتا!

ایک فلسفی کا خیال ہے کہ حکومت کی تمام اقسام میں سب سے زیادہ دلچسپ وہ اقتدار ہے جو ایک صحیح القویٰ نوجوان کو اپنی نازنین محبوبہ پر حاصل ہوتا ہے۔ عذرا! یہ شاہانہ فتوحات میرا اور صرف میرا حصہ ہوں گی۔ اسی کا تخیل تھا جس نے ۲۵ برس تک مجھے دنیا کی آلائشوں سے الگ تھلگ رکھا۔ ہاں پیاری "بنت عم" میں تجھ سے شرمندہ نہیں ہوں، جس طرح تو "اچھوتی صحنک" اور میری اور صرف میری ہے کیا ایک "جنس غیر" کے اس دعویٰ کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہے۔ کہ وہ بھی تیرا اور صرف تیرا ہونے کی پوری قابلیت رکھتا ہے یعنی اس کا جسم مس کردہ غیر نہیں ہے۔ یہ صرف تیرے پاک تخیل کا نتیجہ اضطراری تھا۔ مجھ پر ایسا وقت گزرا ہے کہ خواہشات نفس نے مسلسل مجھے بے چین رکھا ہے۔ لیکن موجبات ترغیب سے ہمیشہ بچتا رہا۔ سیر و شکار، ورزش جسمانی اور کتب بینی بہترین مشغلے تھے، جن سے الجھتا رہتا تھا۔ لیکن سخت سے سخت "تحیر مجفی" میں بھی مجھ کو صرف تیری ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ دہکتے ہوئے شعلوں کو دبی چنگاریاں بنا کر رکھنا صرف اس لئے تھا کہ ایک دن جس طرح چاہتا ہوں تجھ پر قابو حاصل کر سکوں۔

کچھ معلوم بھی ہے صرف ایک قوت کے مغلوب کرنے کے لئے مجھے کتنی مختلف قوتوں سے مقابلہ کرنا پڑا؟ آہ اس کشمکش میں مر مر گیا ہوں۔ اس سے پاکبازی جتانی منظور نہیں، بلکہ یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ دریا کو، کوزہ میں بند رکھنا اور نفس سرکش پر قابو حاصل کرنا فوق الفطرت قوت انضباط چاہتا ہے۔ شکر ہے کہ تیری امانت بالکل محفوظ ہے

اور کبھی تصرف کی نوبت نہیں آئی۔ ہائے میرے عالم خیال کی فضائے بسیط جسکی ہوا بھی دنیا کو نہیں لگی۔ کس قدر پاکیزہ اور اچھوتی ہے۔ عذرا کیا کوئی امر تیرے بیوی بننے میں مانع ہے؟ کیا تیرا ہاتھ کسی اور کو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔؟

عالم خیال کا دوسرا مرقع

سنجیدہ اور پاکباز عذرا، اپنے عاشق کے پاس کھڑی ہو گئی ہے لیکن نہیں جانتی کیوں آئی، چہرے کی افسردگی، پاک جذبات اور دھڑکتے ہوئے دل کی غمازی کر رہی ہے ڈوپٹہ کا آنچل سر اور شانہ سے ہوتا ہوا پوری آستین کے شلوکہ پر اس طرح پڑا ہے کہ "راز سر بستہ" کی کہیں سے پردہ دری نہ ہو۔ محو شوق نگاہ کے لئے آرائش کا کچھ اہتمام نہیں۔ یہاں تک کہ بالوں پر بھی کافی توجہ نہیں کی گئی۔ تاہم چرائے چھپائے جسم کی خوش ترکیبی کچھ کہہ رہی ہے۔ ہائے وہ قیمتی ساعت زندگی! اتنا وقت کہاں تھا کہ ترسی ہوئی آنکھیں تصویر خموشی کا جائزہ لے سکتیں۔ دونوں بت بنے ہوئے تھے۔ دفعتہً ایک نے بلائیں لیں، اور دوسری عشق ناکام کا ایک نیا سبق، اور ٹھنڈی سانس بھرتی ہوئی جدا ہو گئی

عالم خیال کا تیسرا مرقع

عذرا تصویر شباب بنی ہوئی ہے، لانبے بال جن میں اچھی طرح کنگھی کی گئی ہے عاشق کی پھانس کے لئے چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ بہ چیپے ہوئے لباس نے زمانے بھر بھی جوبن کی سرکشی پردہ پردہ میں دکھائی ہے۔ آنچل سامنے کچھ اس طرح ڈالا گیا ہے کہ انداز کہہ رہا ہے پردہ داری مقصود نہیں۔ بلکہ گول اور بھرے بھرے برہنہ شانے اور جوانی کے

"فتنۂ طناز" یعنی "حسن بے پردہ" کا بانکپن دکھانا منظور ہے۔ سینہ کا حصہ افقی بالکل کھلا ہوا ہے اور اودی اودی رگوں کے پیچ وخم اور اعصاب کی کھینچ تان بتا رہی ہے "سرکشی" لباس کی ممنون نہیں۔ بلکہ لباس خود سانچہ میں ڈھل گیا ہے نہایت باریک ریشم کی ساری آج کل کے مروجہ حیثیت زیر سایہ زیب کمر ہے۔ نرم اور لچکدار جسم کے ساتھ قلم کار ساق بلوریں سات پردوں میں بھی یا کیاز شوہر کے تار نظر کا مرکز بنی ہوئی ہے۔

یہ سراپائے جوش افزا کہہ رہا ہے ..... کہ "بنت عم" اپنے پیارے شوہر سے ہم آغوش ہو چکی ہے۔ آنکھوں میں شب آرزو کا خمار ہستی ہے، اور ہنستے چہرے کی شگفتگی بتا رہی ہے جو دونوں کا مقصد تھا وہ پورا ہو کر رہا۔ ہائے وہ پاک اور اچھوتا تعلق جس میں ہماری ہر قسم کی آزادیاں حسن عمل قرار پائیں۔

شوہر کے بے باکانہ اور جوشیلے جذبات نے عذرا کی فضائے لذت میں ایک آگ سی لگا دی۔ اور وہ سمجھی نئی زندگی کی خوشیوں میں سب سے زیادہ کس صیغہ پر زور رہے گا اور دل ہی دل میں اس خیال سے خوش تھی!

("نقاد" سنہ ۱۹۱۴ء)

نظام الملک طوسی

ملک میں غیر ذمہ دار لٹریچر کی اس قدر افراط ہے کہ ہجوم عام میں خاص لٹریچر بھی غائب ہو جاتا ہے۔ اس لاجواب کتاب کی اشاعت میں جس قدر دیر ہوئی اس سے زیادہ ادبی گروہ کی طرف سے اس کی تقریب میں تاخیر ہو رہی ہے۔ کسی نے ایک آدھ کے سوا تنقید تو خیر، خلوص سے چند سطریں بھی نہ لکھیں۔ ظلم ہوگا اگر نقادِ "باوصف" ادعائے ادبیت خاموش رہے۔

علامہ شبلی نے (ابھی "مرحوم" لکھنے کو جی نہیں چاہتا) رائل ہیروز آف اسلام" سے اس سلسلہ کی بنیاد ڈالی۔ اور "خلافت" باستحقاق اپنے ادبی کارناموں کے لئے محفوظ رکھی۔ لیکن مولوی عبدالرزاق ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تاک میں تھے۔ یہ دفعۃً منظرِ عام پر آئے۔ ابھی نگاہیں اٹھنے بھی نہ پائی تھیں کہ یہ وزارت پر قابض ہو چکے تھے اور انصاف یہ ہے کہ یہ اپنا درجہ قائم رکھ سکے۔ "البرامکہ" کے بعد جو ان کا نقشِ اول ہے انکی نظرِ انتخاب نظام الملک پر پڑی، جو عہدِ سلجوقیہ کا نائب السلطنت اور مدبرِ اعظم ہے یہ انتخاب بجائے خود اس امر کی ضمانت ہے کہ مولف صحیح مذاقِ تصنیف رکھتا ہے اور استحقاق سے پہلے اس نے اپنا کام شروع نہیں کیا۔

آج کل جمہوریت کا عنصر اسقدر غالب ہے کہ کسی زبردست شخصیت کی داستان

کی طرف اس وقت توجہ کرنا نہیں چاہتے۔ جب تک مستقلاً اس تمدن کا خاکہ ہماری آنکھوں کے سامنے نہ آجائے۔ اور اسباب و نتائج کی تفریعات فلسفیانہ سے یہ نہ دکھایا جائے کہ کسی گذشتہ قوم کے حالات عصریہ موجودہ دور کی خلاقی میں کس حد تک بالذات یا مؤثر بوسائط ہیں۔ مثلاً عہد عباسیہ یا سلجوقیہ کو لیجئے، دیکھنا یہ ہے کہ ہم کو ان سے کیا ملا؟ یہ ارتقائی زنجیر کی وہ کڑیاں ہیں جن کا تسلسل ہم کو ان انکشافات سے قریب تر کر دے گا جن پر ہماری آئندہ تقدیرات کا انحصار ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ تاریخ اب صرف "افسانہ یاران کہن" نہیں رہی۔ بلکہ اس نے ایک مستقل فن یعنی فلسفہ کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اور کیا تعجب ہے ایک وقت آئے کہ جس طرح "حال" ماضی کا نتیجۂ اضطراری ہوتا ہے "مستقبل" کو ہم خود پیدا کرنے لگیں۔ یہ ایک نازک اور دقیق بحث ہے جسے میں یہاں پھیلانا نہیں چاہتا۔ مقصود صرف یہ تھا کہ اصناف، لٹریچر میں فلسفۂ تاریخ جس قدر اہم ہے اسی سے زیادہ اس کی تالیف کی ذمہ داریاں سخت۔ خاص کر جب اس کی تدوین آج کل کے ترقی یافتہ اور مغربی ضوابط تنقید کے ساتھ ہو۔

موجودہ زمانہ میں تاریخ پر قلم آزمائی کا معیار قابلیت یہ ہے۔ کہ مواد گذشتہ کو تصرفات کے بعد ایک خاص حسن ترتیب سے اس طرح جلوہ گر کیجئے۔ کہ عہد متعلقہ کا ایک صحیح مرقع پیش نظر ہو جائے۔ یعنی قانون شہادت کی اصطلاح میں جہاں "واقعات مؤثر" کی تفصیل چھوٹنے نہ پائے۔ حشو و زوائد یعنی "امور غیر مؤثر" سے بالکل غرض نہ ہو غور کیجئے کہ یہ نزاکت تالیف کیا چاہتی ہے؟ صرف ایک خاص طرح کا مادہ اختراعی نہیں بلکہ صدیوں کے الجھے ہوئے روابط علت و معلول کی عقدہ کشائی اور یہ کس قدر مشکل ہے۔ ایک تراشیدہ ہیرا جب کسی دست نازک کی زینت بڑھا رہا ہو کس قدر خوش

ضیا را اور نفیس چیز ہے؟ لیکن پتھروں کے خود رو انبار سے ریزہ چینی آسان نہیں! اسی طرح تاریخ کے ہزار ہا اوراق کی الٹ پھیر کے بعد جستہ جستہ مقامات سے واقعات کا پتہ لگانا جس سے قدیم لٹریچر کا ہیولیٰ ایک مستقل تذکرہ کی صورت پیدا کرلے۔ مؤلف کی قوت آخذہ کے ساتھ اس کی جامعیت اور کمالِ اجتہاد کی دلیل ہے۔

اس تمہید کے بعد نظام الملک طوسی کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن مضامین کی غیر ضروری تفصیل سے یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ فہرست ترتیبی (انڈکس) دیکھئے جو دیباچہ اوصاف ہے۔ جس طرح ایک نازنین کا چہرہ مہرہ اور باریک آنچل کی شکنوں کا ناقابلِ بیان رکھ رکھاؤ دیکھتے ہی اس کے اعضائے متناسبہ کی خوش ترکیبی سمجھ میں آجاتی ہے۔ یہی حال انڈکس کا ہے کہ گوشوارہ پر بیک نظر سب کچھ دیکھ لیجئے۔ اوراق مابعد کی اچھائی برائی راز نہیں رہتی۔ لیکن ناظرین کو ایک جھبب تو دکھلانی ہوگی۔ اس لئے تصریحات کی جگہ صرف اشاروں سے کام لوں گا۔

مولف نے کتاب کے دو حصے کئے ہیں۔ حصہ اول میں طوس کی مختصر تاریخ خواجہ کی ولادت اور ابتدائی حالات، تعلیم و تربیت، طالب علمانہ سفر، وزارت کا آغاز خانگی زندگی، عام اخلاق و عادات، فضل و کمال، تصنیفات، علماء اور مشاہیر وقت کی قدردانیاں، صوفیانہ اور ادبی صحبتیں۔ تدریجی عروج اور اس کی تکمیل کے ساتھ دفعتہً سامانِ قتل، جس سے دنیا کی بے وفائی کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے غرض لگے بیٹے واقعات جس قدر تھے۔ ایک ایک کرکے دکھائے گئے ہیں۔ جن سے خواجہ کی زندگی کے تمام مظاہر نگاہ کے سامنے آجاتے ہیں۔ اور جن کی بنا پر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ نظام الملک وزارت اسلام میں کسی سے "دوم درجہ" پر نہیں ہے۔

دوسرا حصہ نہایت مہتم بالشان اور مرعوب کن ہے اور یہیں سے ہمارے لائق مولف "مولوی" نہیں رہتے۔ عہد سلجوق کی سیاسیات پر جسقدر مواد یکجا کیا گیا ہے، میرا خیال ہے کسی زبان میں اتنا سرمایہ یکجا نہیں ملے گا۔ یہ بات کسی یورپ کی زبان میں ہوتی تو بڑے بڑے پروفیسر حوصلہ افزا تنقیدیں لکھتے۔ لیکن ہندوستان میں یہ دستور نہیں اور شاید کبھی ہوگا بھی نہیں۔ اسی سلسلہ میں مولف نے دکھایا ہے کہ دولت سلجوقیہ کے قیام وعروج کا باعث خواجہ تھا۔ اس کے وسیع کارنامے بتاتے ہیں کہ جسقدر ترقیاں اس عہد میں ہوئیں۔ ان کے لحاظ سے یہ سلطنت کا دست راست اور قوت عامل تھا۔ سب سے زیادہ قابل قدر خواجہ کا "سیاست نامہ" اور "کتاب الوصایا" یعنی دستور الوزراء کا مجموعہ ہے۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کا نظام عصریہ خلافت اور وزارت کے لئے کس قسم کے "فرد عمل" (پالیسی) کو جائز رکھتا تھا"

"یورپ میں اس قسم کی چیزیں تلاش کر کے پیدا کی جاتی ہیں۔ اور نوٹ وحواشی کے ساتھ بڑی آب وتاب سے ان کی اشاعت ہوتی ہے۔ مولف نے اگر اسے کتاب میں شامل نہ کیا ہوتا تو ایک قابل افسوس کمی رہ جاتی۔ آپ دیکھیں گے نظام الملک کس قدر صحیح سیاسی دماغ رکھتا تھا۔ اور ان الجھاؤ کے سلجھاؤ پر کس حد تک قادر تھا جن پر کسی سلطنت کی بقا یا فنا منحصر ہوتی ہے"

سیاسیات کے بعد خواجہ کے علمی ذوق کے تحت میں ہم علوم و فنون کی اشاعت صیغہ تعلیم کی اولیات اور اس وقت کے مذاقِ ادب کے ساتھ علماء اور شیوخ کا مفصل تذکرہ پاتے ہیں۔ مولف نے کچھ نہیں چھوڑا، ادب عصریہ میں امیر معزی اور لامعی کا کلام فارسی لٹریچر کے شائقین کی ضیافت طبع کے لئے دیکھنے کے لائق ہے۔ اسی طرح

"نظامیہ بغداد" پر عربی زبان میں بھی کوئی مستقل مضمون نہیں، لیکن مؤلف نے جس شرح وبسط سے تصریحات کی ہیں۔ واقعہ نگاری کا حق ادا کیا ہے۔ ایک خاص جدت یہ ہے کہ نہایت کثرت سے اضافی تصریحات (یعنی فٹ نوٹ) سے متن کی تزیین کی گئی ہے جس سے لایق قدر تالیف کے موضوع اصلی میں بہت کچھ وسعت پیدا ہوگئی ہے۔ اور وہ صرف ایک "تذکرہ" (یعنی لائف) نہیں بلکہ عہد سلجوق کا ایک ایسا جامع لٹریچر ہے جس پر میرا خیال ہے کوئی معتدبہ اضافہ نہ ہو سکے گا۔"

خواجہ صوفیانہ اور شاعرانہ رنگ میں بھی کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ ان کی مجلسوں میں شیخ ابواسحٰق فیروزی، امام الحرمین جوینی۔ ابوالقاسم قیشری۔ ابوعلی فارمدی ایسے بلند پایہ اصحاب جہاں رونق بزم ہیں۔ ایک حلقہ مشاہیر شعراء کا بھی ہے۔ جس میں امیر معزی معین الدین طغرائی، سید شریف نظام الدین اور قاضی شمس الدین بالتخصیص لائق ذکر ہیں خواجہ کی جامعیت دیکھئے، ایک طرف صوفیانہ دائرہ ہے جس میں بڑے بڑے جبہ و دستار کا وزن گراں "سنجیدگی" کی وقعت افزائی کر رہا ہے دوسری طرف رند مشرب شعرائے عصر ہیں۔ اور "شراب ادب" یعنی شاعری کا دور چل رہا ہے"۔

مؤلف نے خواجہ کے گاڑھے دوستوں یعنی حسن صباح بانی فرقہ اسماعلیہ اور عمر خیام کا ذکر نہایت تفصیل سے کیا ہے حسن صباح کو پروفیسر براؤن نے بھی اپنی کتاب "لٹریری ہسٹری آف پرشیا" میں وضاحت کے ساتھ جگہ دی ہے۔ اور ضرورت تھی کہ فاضل مستشرق سے موازنہ خیالات کیا جاتا۔ لیکن آجکل کی آب و ہوا ایک ایسے فلسفہ سیاسی پر جو خطرناک حد تک عملی ہو رائے زنی کے لئے چنداں موزوں نہیں۔ شعلوں کی بھڑک سے دبی چنگاریاں باکیف ہوتی ہیں"۔

خیام پر مؤلف نے جو کچھ لکھا ہے اُردو لٹریچر پر پہلا احسان ہے جو اس حیثیت سے کیا گیا، اتنا مفصل ریویو جس میں خیام کی شاعری کے ساتھ اس کے تمام حکیمانہ کمالات آگئے ہیں غالباً ایشیائی لٹریچر اس سے خالی ہے۔ یورپ نے خیام کی شاعری پر جس حد تک توجہ کی ہے مؤلف نے اس پر بھی کافی روشنی ڈالی ہے۔ اور صرف یہ حصّہ اس قدر دلچسپ ہے کہ کتاب میں اگر کچھ اور نہ ہوتا تو بھی کافی تھا۔

ضمیمہ میں ملک شاہ کا تذکرہ ہے جس سے عہد سلجوق پر ایک اجمالی نظر ڈالنے کا پھر موقع مل جاتا ہے۔ مؤلف نے جہاں تک ممکن تھا اس کتاب کی تکمیل کے لئے نہایت مستند ماخذوں سے فائدہ اُٹھایا ہے۔ اور یہ ان کی غیر معمولی خوش نصیبی ہے کہ ملکی لٹریچر میں اپنی دوسری تالیف سے ایک لائق رشک اور قیمتی اضافہ کر سکے۔ یہ چند سطریں کتاب کی تجدید تقریب یعنی محض یاد دہانی کی حیثیت سے ہیں تنقید وہ بھی کسی عالمانہ تالیف کی فرصت و لیاقت چاہتی ہے۔ جو قابل ترا صحاب کے لئے زیادہ تر موزوں ہے۔

کتاب سات سو صفحوں پر قابض ہے اور آیوری کاغذ پر نہایت خوشخط چھپی ہے۔ جسے حضرت رعد کے دست ضعیف کا آخری کارنامہ سمجھئے۔ تصویریں، نقشے دیکھنے کی چیزیں ہیں۔ اور لوح کی صنعت کاری تو بالکل ناقابلِ بیان ہے۔ جلد ولایتی پشت پر سنہرے حروف میں نام، غرض مؤلف نے جو، ابھی میری طرح جوان رہنا چاہتے ہیں، حسنِ سیرت کے ساتھ اچھی صورت کے اہتمام میں پوری قوت صرف کر دی ہے۔ یہ لائبریری ایڈیشن اس لائق ہے کہ جو حضرات پڑھنے کے شائق نہیں ہیں وہ بھی آرائشاً اسے اپنے پاس رکھیں۔

یہاں تک تو اوصاف کا ذکر تھا۔ نظر بد سے بچانے کے لئے کوئی ایسی بات پیدا کرنا چاہتا ہوں جس سے تصویر کا دوسرا رُخ بھی سامنے آجائے۔ لیکن غور کرنے پر بھی کوئی بات نہیں ملتی۔ سوائے اس کے کہ سیاست نامہ اور کتاب الوصایا ضمیمہ میں منتقل کی جائیں۔ مقصود دونوں بھی حاصل رہے گا۔ اور نکتہ چیں یہ نہیں کہہ سکے گا کہ حجم بڑھایا گیا ہے۔ اسی طرح دونوں حصوں کے مضامین مشترک کی تقسیم پر نظر ثانی حسن ترتیب کو بڑھائے گی۔ یہ سب طبع ثانی میں (اگر نوبت آئے) ممکن ہے لیکن میری ایک شکایت کا میرے لائق دوست کے پاس غالباً کوئی علاج نہیں، یعنی "بوڑھے وزیر" کی سرگزشت میں کسی "عیاشی" کا پتہ نہیں چلتا۔ جس سے فی الجملہ مجھے مایوسی ہوئی۔

(نقاد، [illegible] ۱۹۱۴ء)

اُردو لٹریچر کا نفسِ واپسیں

اگر اُردو لٹریچر کی ارتقائی تاریخ جہاں تک نثر سے تعلق ہے کبھی لکھی گئی تو جو مرقع دفعتاً آنکھوں کے سامنے آئے گا۔ وہ طبقۂ اوّل کے لکھنے والے ہوں گے جنکو میں نے "عناصر خمسہ" کی حیثیت سے کہیں دکھایا ہے۔ اور جو سرسید کے زمانے میں پیدا ہوئے۔ آزاد کی زبردست شخصیت گو ایک حد تک سرسید کی تبلیغ سے بے نیاز معلوم ہوتی ہے لیکن یہ کیا کم ہے کہ ہم عصری کی عزت ان کو بھی حاصل تھی اور مذاقِ سخن کے لحاظ سے وہ اِدھر جھک پڑے۔ جو سرسید کے لٹریچر کا خاصہ امتیازی تھا۔ نذیر احمد جس حد تک مستغنی رہ سکے اِن کے خیالات و مقالات کا بہت بڑا حصہ خود اس فیصلہ کے لئے کافی ہے رہے حالی و شبلی کچھ شک نہیں کہ یہ تمام تر سرسید کے پیدا کردہ ہیں۔

میں اس وقت طبقۂ ثانی کے اہلِ قلم سے قطع نظر کئے لیتا ہوں۔ جو میرے دائرہ تحریر کے موضوع سے الگ ہیں۔ ورنہ اُردو لٹریچر جب تک باقی ہے ریاض احمد علی، شوق، شرر اور سرشار ہمیشہ محبت آمیز عزت کے ساتھ یاد کئے جائینگے موجودہ لٹریچر کی خلاقی میں یہ داہنے ہاتھ نہ سہی بائیں ہاتھ کی حیثیت قطعاً رکھتے ہیں آج ریاض اور شوق کی لطافت نثر گذشتہ تاریخ کا ایک بھولا ہوا سبق ہے

لیکن کل کی بات ہے جب یہ دونوں اپنے وقت کے بہترین پرچوں میں دادِ سخن دے رہے تھے۔ آئندہ دُنیا انکو زیادہ سے زیادہ مٹی ہوئی شاعری کی حیثیت سے جانے گی۔ لیکن سچ یہ ہے کہ نظم کے ساتھ یہ نثر کے بھی آقا تھے۔ دونوں جوان تھے، جوبنوں پر آئی ہوئی زبان بھی پری ہی ہوئی تھی۔ "صحیفت" رہ رہ کر جنبشِ قلم کی بلائیں لیتی تھی۔ عورت کیسی ہی نازک ہو لیکن چھڑوں کی دھیمی آواز میں جو کیفیت ہے اونچی ایڑی کے بوٹ کی کھٹ کھٹ میں نہیں۔ آج کل کی کھردری اُردو کے مقابلہ میں اِن کی زبان میں ایک خاص لچک اور نزاکت تھی۔ شستہ و رفتہ محاورات کی برجستگی اور موقع موقع سے روزمرّہ کی پیوندکاریاں کس طرح دکھاؤں، دِل کی بےچینی سطح کاغذ پر پھیلتی جاتی ہے۔ لیکن حق ادا نہیں ہوتا۔ مختصر یہ کہ جس طرح دِل نہیں رہے دِلوں کے اُکسانے کا سامان نہیں رہا۔ زمانہ کی ترقی کے یہ معنی ہیں کہ بعض اجزا ساتھ ہی ساتھ اس طرح ہٹتے گئے کہ بجھے ہوئے چراغوں کی طرح کہیں پڑے ہیں۔ لیکن جو آنکھیں برقی خیرہ گری کی عادی ہو رہی ہیں اُنھیں فرصتِ ذوق کہاں کہ ایک نگاہ اِدھر بھی ڈال لیں۔ نثر رو سرشار کی نسبت کچھ کہنا نہیں چاہتا کہ یہ اپنی بقا کے آپ ضامن ہیں، یعنی ایسی لائقِ رشک ہستیاں رکھتے ہیں جو مرنے کے بعد بھی فنا ہونے والی نہیں۔

میں پھر سلسلہ سے علیحدہ جا پڑا۔ ہاں تو یہ کہنا تھا کہ طبقۂ اوّل کی پاک روحوں نے جو سرمایہ ہمارے لئے چھوڑا ہے وہ کتنا ہی لائقِ ادب ہو۔ لیکن سوال یہ ہے انکے مرتبہ کے لحاظ سے اس کی کیا حالت ہے۔ یعنی نثر مصنف نے اپنی تصنیفات میں کہاں تک اپنا درجہ قائم رکھا؟

یادشِ بخیر، شبلیؔ کے سوا مجھے خوف ہے۔ سب کم و بیش وہ نہیں کر سکے جو
اِن کی قابلیت کا بہترین مصرف تھا۔ پروفیسر آزادؔ کی فارسیّت، اہلِ زبان سے
دبتی ہوئی نہیں تھی۔ لیکن وہ اپنی نہایت قیمتی تالیف یعنی "جامع اللغات" کی تکمیل
نہ کر سکے جو ان کی ساری عمر کی کمائی تھی۔ اسی طرح "تذکرہ شعرائے فارسی" بھی جو خاص
اِن کے مذاق کی چیز تھی۔ مسودہ سے آگے نہ بڑھ سکا۔
مولینا نذیر احمد کو (اپنی) اعلیٰ درجہ کی عربیت کے ساتھ "قاموس الاسلام" (انسائیکلو
پیڈیا) کے لکھنے کا خیال نہ آیا۔ وہ اس پیمانہ کو گھٹا کر کم سے کم "لغات اسلام" لکھ سکتے
تھے اور یہ پھر بھی ایسی چیز ہوتی کہ یورپ اپنی فلسفیانہ تحقیق و تدقیق کے تھا
ان سے آگے نہیں جا سکتا تھا۔ آئندہ نسلوں کے لئے یہ قیمتی وراثت موصوف کی
باقی رہنے والی یادگاروں میں سب سے زیادہ بیش بیش ہوتی۔
حالیؔ خوش صفات۔ حالی سے ہم کو چنداں شکایت نہیں "مسدس" کے
بعد "مقدمۂ دیوان" اور "حیاتِ جاوید" کے سوا اگر یہ کچھ نہ لکھتے تو انکی بقار کے
لئے اِس لئے زیادہ ضرورت نہ تھی، گو اس کا افسوس ہے کہ انکی صحت اور عمر نے
اتنا موقع نہ دیا کہ اِن کی وسیع المشربی اور فلسفیانہ نکتہ سنجیاں، اِن کے نتائجِ افکار
کی تعداد میں کچھ اور اضافہ کرتیں۔ جس کی اس لئے زیادہ ضرورت تھی کہ انکے بعد
اِن کے رنگ میں کوئی قلم اٹھانے والا معلوم نہیں ہوتا۔
خاتم المصنفین شبلیؔ نے ہمارے لئے کم و بیش ۵ ہزار صفحوں کا ذخیرہ ادب
چھوڑا ہے۔ یہ لٹریچر کی وہ قیمتی صنف ہے جسے آجکل اصطلاح میں "تنقیدات عالیہ"
(ہایر کریٹیسزم) کہتے ہیں۔ آپ لوہے کے چنے کہئے اور میرا خیال ہے اسلام کے

معلقات میں اتنا بڑا سرمایہ اور وہ اس قدر گراں پایہ کسی زبان میں موجود نہیں ہے شبلی میں ایک خاص طرح کا مادہ اختراعی تھا۔

وہ ایک ہی وقت میں اعلیٰ درجہ کے مؤرخ، اعلیٰ درجہ کے ناثر، اعلیٰ درجہ کے شاعر، غرض مشرقی زبانوں میں مختلف اصنافِ سخن کے پورے مالک تھے۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ یورپ کے مستشرقین کی طرح ان کا معیار تصنیف اتنا بلند تھا کہ میرا خیال ہے سینکڑوں برس بعد بھی ان کی تصنیفات ٹکسال باہر نہیں ہوں گی۔ ایسا جامع حیثیات مصنف غالباً اب پیدا نہیں ہوگا۔ ان کے تفصیلی کارنامے انشاء اللہ "دار المصنفین" دکھائے گا۔ لیکن مرحوم نے سب کچھ کیا۔ آنحضرت صلعم کی لائف کی تکمیل نہ کر سکے، جسکا داغ ہمارے ساتھ وہ بھی لیتے گئے۔ اسی طرح مسلمانوں کی عام تاریخ نہ لکھی جس کی سخت ضرورت تھی۔ نہ "شعر العجم" کی طرح عربی لٹریچر کی تاریخ لکھنے کی نوبت آئی اور سلسلے بھی ناتمام رہے جنکی تکمیل اب قیامت تک ہوچکی۔

بات یہ ہے کہ جب ہمارے ہاں محرکات میں اس کے سوا کچھ نہ ہو کہ "ہر فعل خود اپنی مکافات ہے"۔ تو ان اساتذہ سے جو کچھ ہمیں ہاتھ آیا وہ بھی ہمارے استحقاق سے کہیں زیادہ تھا۔

علی گڑھ ایک تاریخی قوم کی مرکزیت کا مدعی ہے لیکن لاکھوں روپیہ خرچ کرنے کے بعد بھی قوم نے کوئی دائرۃ التالیف قائم نہیں کیا۔ نہ ان عناصر کو جنکے نام بار بار گنا تا رہتا ہوں۔ وہ کبھی تصنیف و تالیف کے لئے یکجا کر سکا۔ اردو لٹریچر کا اطلاق صحیح معنوں میں صرف ان ہی حکمائے ادب کی دماغی پیداوار پر ہو سکتا ہے اگر آپکو اس سے اتفاق نہ ہو تو اسے اپنی قاصر المنظری اور قوم کی "شامت اعمال" پر محمول کیجئے جسکو

اتنا بھی احساس نہیں کہ تصنیفی دور آخری تاجدارِ سخن یعنی شبلی کے ساتھ ہمیشہ کے لئے پیوندِ خاک ہو گیا۔

سب تو سب حیدر آبادسی شائستہ ریاست کو یہ خیال نہ آیا کہ سید علی، آزاد نذیر احمد، اور حالی و شبلی کو جن میں آزاد کے سوا سب اس کے خوانِ نعمت کے خوشہ چیں تھے۔ صرف تصنیف و تالیف کے لئے وقف کر دیا جائے۔ یہ لوگ معقول وظیفوں پر ایک جگہ رکھے جاتے اور یہ طے کیا جاتا کہ لٹریچر کی فطری ضروریات کے لحاظ سے کون کون کام ترتیباً زیادہ اہم ہیں۔ اور ان پر عالمانہ کتابیں لکھوائی جاتیں۔ سید علی سا ہمہ دان جہاں موجود ہو وہاں "اکبری نورتن" کی طرح "ہفتن آصفی" کا عالم وجود میں نہ آنا ایک ایسی بدنصیبی ہے جسکی تلافی اب کبھی نہیں ہو سکتی۔ "سلسلہ آصفیہ" اگر برائے نام نہ ہوتا۔ اور فرمانروائے وقت کو کچھ بھی دلچسپی ہوتی تو دنیا دیکھ لیتی کہ عہد عباسیہ جہاں تک ادبی فتوحات کا تعلق ہے نئے سرے سے واپس آ گیا ہے۔ لیکن گذری بات کا رونا کیا ہے یہ یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ملک کا تصنیفی دور ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا بیشک کتابیں آئندہ بھی لکھی جائینگی لیکن میری غرض ردیات سے نہیں۔ اعلیٰ لٹریچر سے ہے جس کی فصل ایک دم سے ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔

ثبوت لیجئے علی گڑھ کالج ۴۰ سالہ جدوجہد کے بعد ایک مصنف بھی اسوقت تک نہ پیدا کر سکا۔ آپ جانتے ہیں یہ کس بات کی پھٹکار ہے؟ نری انگریزی دانی سے خواہ وہ کسی پایہ کی ہو مشرقی طبائع میں مادہ نہیں ہوتا۔ لڑکوں کو یہ موقع نہیں ملتا کہ وہ انگریزی سے پہلے یا ساتھ ساتھ عربی فارسی کی تحصیل کر سکیں جس پر انکی مادری زبان کی ترقی کا انحصار ہے۔ زبان عربی میں کتنی ہی دستگاہ ہو، لیکن اس طرح لکھنا پڑھنا مشکل ہے کہ

اہلِ زبان کو اسمیں لطف آئے، نتیجہ یہ ہے کہ انگریزی ٹکسالی ہونے سے رہی اُردو میں یہ اظہارِ خیال کرنا نہیں چاہتے۔ یا صاف کیوں نہ کہوں انکو آتی ہی نہیں۔ اور چونکہ اُردو لٹریچر سے بیگانگی کو یہ اپنا شرف امتیازی سمجھتے ہیں اسلئے انکے ہاتھوں ابھی مدتوں ہم کو اُردو ادب میں کسی اضافہ کی امید نہیں کرنی چاہیئے۔ اگر یہ صحیح ہے کہ کوئی قوم دُنیا میں اپنے مجموعۂ خصائص سے علیحدہ ہو کر ترقی نہیں کر سکتی تو صرف یہی نہیں کہ آج کل کے نوجوانوں کے لئے مادری زبان کا رونا ہے بلکہ ایک وسیع حد تک ان کے مستقبل کی طرف سے بھی مایوسی ہے۔

یہ ایک کھلا ہوا راز ہے کہ یہ بساط ابھی دیکھتے دیکھتے اُٹھ گئی یعنی لٹریچر کے جو حقیقی مالک تھے وہ قریب قریب سب ایسے تھے جنھیں مشرقی تعلیم نے پیدا کیا تھا۔ اور جنکو مغربیت، کچھ یونہی سی چھو گئی تھی۔ لیکن ان کی قوت اجتہادی کا مظہر وہ معرکۃ الآرا سرمایۂ ادب ہے جو ورثہ میں ہمارے لئے چھوڑ گئے ہیں بہر حال نوجوان طبقہ کی بیگانہ وشی) بہت ہی لائق افسوس ہے لیکن دُنیا میں کوئی کلیہ نہیں جس میں استثنا نہ ہو۔ میں دیکھتا ہوں اس طبقہ میں ایک شخص ایسا پیدا ہو گیا ہے جو اوروں کی ناک رکھ لے گا۔ میری غرض لائق عبدالماجد سے ہے، جو انگریزی کی تکمیل کے ساتھ اُردو لٹریچر کا نہایت صحیح مذاق رکھتے ہیں اور آج ان کے قلم کے سایہ میں دو فلسفیانہ کتابیں ایسی موجود ہیں جن پر ادب اُردو ناز کر سکتا ہے چونکہ شروع ہی سے پیمانہ تصنیف اونچا اختیار کیا گیا ہے اِس لئے آئندہ ہم کو ان سے بہت سے توقعات ہیں۔ میں ابھی زیادہ کھلنا نہیں چاہتا کیونکہ انکو نظر بد کے اثر سے بچانا ہے۔

شبلی کا مطمح نظر ایسی ہی تعلیم تھی جس میں انگریزی کے ساتھ مشرقی زبانوں کی بھی تکمیل ہو اور آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ "دار المصنفین" جو چند نوجوانوں کے ہاتھ میں سلسلہ ہے مرحوم کے

خیالات کی تصویر مرئی ہے جس قابلیت کے ساتھ مولوی سلیمان ندوی ایک مختصر علمی جماعت سے کام لے رہے ہیں اور جس پیمانہ پر وہ تالیف و تصنیف کے صیغہ کو وسعت دینا چاہتے ہیں۔ میرے دعوٰی کے ثبوت میں ہے کہ نری انگریزی دانی کسی درجہ کی ہو، قوم و ملک کے لئے جہاں تک دماغی مشاغل کا تعلق ہے ایک بیکاری چیز ہے "معارف" کو دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ رفقائے "دار المصنفین" کیا کرنا چاہتے ہیں اور خیر الاغلاف ہونے کی ان میں کہاں تک اہلیت ہے۔ میرا خیال ہے تصنیفی افق جو ایک دم سے تاریک ہو گیا تھا دفعتہً امید افزا ہو چلا ہے۔ اور اگر موجودہ رفتار بھی قائم رہ سکی تو اس علمی جماعت کی متفقہ کوشش سے ایک نئے دور کا آغاز ہو گا جس کی نہایت سخت ضرورت ہے۔

انجمن ترقی اُردو سے چنداں امید نہیں۔ لائق سکریٹری ہر سال چند بے غایت رسائل کی اشاعت کو فرضِ کفایہ سمجھتے ہیں۔ لیکن اس قسم کی بے اصول اور دور دراز اشاعت سے زبان کی ترقی نہیں ہوتی، میں نہیں جانتا اسوقت تک کوئی لائق ذکر کام کیا گیا ہے جس سے کسی حد تک زبان کا دائرہ وسیع ہوا ہو۔ میں "فلسفہ تعلیم" کے بعد فلسفۂ جذبات اور فلسفۂ اجتماع کی اہمیت سے ناواقف نہیں ہوں لیکن ان کو چھوڑیئے محض طالبعلمانہ رسائل جن کا آئے دن اعلان ہوتا رہتا ہے اور جن میں اظہار خیال کی حیثیت سے مجتہدانہ روح نہ ہو کس کام کے ہیں۔ انجمن کو سرے سے یہی نہیں معلوم یا وہ جاننا ہی نہیں چاہتی کسی زبان کی ترقی کے عناصر ترکیبی کیا ہوتے ہیں یہ بات حیدرآباد یا لکھنؤ میں چند افراد کی خودرائی سے طے نہیں ہو سکتی۔ یورپ کے کسی مستشرق سے پوچھیئے جو دنیا کے مختلف لٹریچر کے نظامات طبعی پر شائد نظر رکھتا ہو تو وہ بتائے گا، دراصل آپ کے کرنے کے کام یہ ہیں۔

(۱) جامع اللغات اُردو،

(۲) محاورات ،

(۳) لغات الاصطلاحات ،

(۴) لغات فارسی، جہاں تک اُردو کی تکمیل کا تعلق ہے ،

(۵) لغات عربی ، بہ ترتیب جدید

(۶) ادب العالیہ (اُردو) ۱۲ ضخیم جلدوں میں

(۷) جامع القواعد (اُردو)

(۸) عقلیات (یعنی فلسفہ اور سائنس کی ہر شاخ پر ایک مستقل کتاب)

(۹) اُردو انسائیکلوپیڈیا

ارتقائے زبان کی قدرتی ترتیب یہ ہے کہ اس میں صالح لٹریچر کا کافی سرمایہ موجود ہو۔ حسن اتفاق سے ہمارے پاس ایسا ذخیرہ موجود ہے کہ ہم دنیا کی اور کلاسیکس (ادب القدما) کے مقابلہ میں اسے بے تکلف پیش کر سکتے ہیں اس کے بعد اُردو لغات کی تدوین و ترتیب ہے جس کی اہمیت اسقدر طے شدہ ہے کہ جب تک آپ اُسے ختم نہ کر لیں کسی دوسرے موضوع پر ادھوری طبع آزمائی نیک نیتی کے ساتھ بھی دھوکا دینے سے پہلے دھوکا کھانا ہے۔ اُردو لغات کے سلسلہ میں "فرہنگ آصفیہ" کو یاد نہ کیجئے۔ جو حشو و زوائد سے بھری ہوئی ہے۔ جسے کاغذی کاسۂ گدائی سمجھئے۔ جس کی تدوین آج تک ختم نہ ہوئی اور جس کے اجزا ہزاروں روپیہ ضائع کرنے کے بعد بھی یک طرحی اور ہم رنگی نہ پیدا کر سکے۔ بہر حال سب سے پہلے آپکو لغت تیار کرنا ہے اور ایک ہی سانس میں روز مرہ اور محاورات کو یکجا کرنا ہے جن سے زبان کی آرائش ہی نہیں ہوتی بلکہ اسکی نزاکتیں

زبان کے حسن اور اسکی کیفیت کو بڑھاتی چڑھاتی رہتی ہیں۔ آپکو شاید معلوم نہیں کہ اُردو اپنے ذخیرہ محاورات کے لحاظ سے نسبتہً دوسری زبانوں سے دوم درجہ پر نہیں ہے۔ اس نے دنیا کی اور کلاسیکس یعنی زندہ اور مستند زبانوں سے جو کچھ لیا اسکے سوا ذاتی سرمایہ بھی اتنا رکھتی ہے کہ مانگے تانگے کی ضرورت نہیں۔ لیکن سرمایہ کا بہت بڑا حصہ جو امتداد تھے ان کے ساتھ ضائع ہو چکا۔ بچے کھچے بکھرے ہوئے موتی دلّی، لکھنؤ میں کچھ اب بھی مل جائیں گے۔ ان کو سمیٹیے اور گلے کا ہار بنائیے۔

جذبات عشق نے دنیا میں ہمیشہ مشق سخن کی ہے اور نازک سے نازک پیرایۂ اظہار خیال پیدا کئے ہیں۔ آج کسی کو فرصت و لیاقت ہو تو مشرق کو مغرب سے ٹکرا کر ایسی آگ پیدا کی جا سکتی ہے جو دلوں کو جلائے گی نہیں صرف گرمائے گی، لیکن جنکو گھر کی خبر نہیں وہ غیروں کی نکتہ آرائیوں سے کہاں تک لطف اٹھانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ سرسری طور پر دو مصرعے سنیئے جو جذبات میں ڈوبی ہوئی اس سے کہہ رہی ہے جس کے دل کی مالک ہے۔

کوہ کنے تم تو دشت پیمائی ؎ مجھ سے گھر بیٹھے خاک چھنوائی

اور دنیا کی کسی زبان میں یہ بات دکھا دیجئے، جو ان نہایت سلیس لیکن فصیح مصرعوں میں ادا کی گئی ہے۔ یہی وہ خصوصیت ہے جس سے آپ کی اُردو بڑی بڑی آبرودار زبانوں پر فوقیت رکھتی ہے۔ ہزاروں محاورات ہیں جو دلّی اور لکھنؤ والوں کے روزمرہ میں داخل ہیں اور جن پر جان دینے کو جی چاہتا ہے۔ محاورات تو پھر بھی ایک چیز ہیں لیکن اسکے توابع مہمل بھی اتنے دلکش ہیں کہ یہ کہیں اور نہ دیکھیئے گا۔ بے شک اُردو وقتا ہونے والی نہیں اور وہ اس وقت تک زندہ رہے گی کہ بیویاں تو خیر، گھر کی ایک

ماما بھی چمک کر "نوج" کہنے والی موجود ہے۔ لیکن میری غرض یہ ہے کہ ایسی خوبصورت ایسی خوش سیرت، ایسی لطیف و نکتہ خیز زبان اگر آپ کے ہاتھوں اپنی عزتِ نفس کو قائم نہ رکھ سکی تو اس کا ہونا گویا نہ ہونا ہے۔

ہاں تو میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ لغات اُردو کے بعد اصطلاحات کا درجہ ہے یہ پہلی شق سے کم نہیں ہے۔ مغربی لٹریچر کو اگر آپ اُردو قالب میں ڈھالنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے بڑی ضرورت یہ ہے کہ مقرر سے ذخیرۂ الفاظ منگوائیے۔ میری غرض علوم و فنون سے زیادہ کمال انشاء پردازی سے ہے۔ ہم اچھے سے اچھے خیال کو اُردو میں اس لئے نہیں لے سکتے کہ الفاظ نہیں ملتے اسلئے دِل کا ارمان پورا نہیں ہو پاتا۔ یعنی ہم ایک خاص طرح کے گونگے ہیں اور سمجھنے کے بعد بھی کسی خیال کو اپنی زبان میں ادا نہیں کر سکتے سکریٹری صاحب انجمن اُردو نے اپنی ایک رپورٹ میں علم ہیئت کے مصطلحات کے جمع کرنے کی بشارت دی تھی لیکن ممدوح کو یاد نہیں رہا کہ "کار زمین" کی تکمیل سے پہلے "با آسماں پرداختن" ایک غیر طبعی بلند پردازی ہے۔ جس سے بجائے اس کے کہ لٹریچر کے مختلف زاویوں کی توسیع ہو۔ اس کی حق تلفی ہوتی ہے۔ اور یہی غیر منطقی ترتیب ہے جس سے آج تک صرف اتلافِ قوت ہوتا رہا اور کوئی کام کی بات نہ ہوئی۔

قوم میں لکھے پڑھے (صحیح معنوں میں) تھوڑے ہیں ان میں بھی تھوڑے ہی ایسے ہیں جو صحیح قوتِ فیصلہ رکھتے ہیں یا جن کے دماغ میں لٹریچر کے نازک مسائل کے جذب کرنے کی صلاحیت ہے لیکن تعجب یہ ہے کہ نہایت موٹی موٹی باتیں بھی ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ جو ایک مخلوق بے غایت یعنی ۶ کروڑ "حشرات الارض" کی ادبیات کے نقیب بننا چاہتے ہیں۔ یقین کیجئے ان دماغوں کی ساخت دُنیا کی

طبی معلومات میں اضافہ کرے گی۔ جن کو ترک "فرائض" کا احساس نہیں لیکن "نوافل" پر اصرار ہے۔ آپ کہتے ہیں "البیرونی" اور "مقدمات الطبعیات" پڑھو! جن میں ایک حرف مجتہدانہ نہیں۔ مجھے نہایت ادب سے یہ عرض کرنا ہے کہ ان کے پڑھنے کے بعد بھی میں اتنا ہی کورا رہا جتنا استفادہ سے پہلے تھا۔ دوسری بیکار گئی جس کا افسوس ہے۔

میں یہ لکھ رہا ہوں اور عنقریب علی گڈھ میں دوم درجہ کی تالیفات کی دو مری کھیپ یا اس کا اعلان ، سبق ، حسن کارگذاری کا دفتر بڑھا رہا ہوگا لیکن سوال یہ ہے کہ لٹریچر صرف سادے کاغذ پر سیاہی پھیلانے سے کہاں تک حقیقی فواید حاصل کر سکتا ہے ؟ وقت کا فیصلہ تو کچھ اور ہے ، وہ صاف کہہ رہا ہے۔

"ایں بجوئے ماندی آرزو"

بہرحال مصطلحات اُردو اِس قدر ضروری ہیں کہ ان کے ہوتے کسی اور کام کو شروع کرنے کی ضرورت نہیں۔ لغات جدیدہ جس میں ایک فاضل مؤلف نے ۱۲ ہزار الفاظ جمع کر دیئے ہیں آنکھ رکھ کر نہ دیکھنے والوں کی چشم نمائی کے لئے کافی ہیں کم سے کم اس کے پانچسو صفحے تو ہوں۔ خیالات کا سلسلہ ہے کہ ختم نہیں ہوتا۔ اور مجھے ابھی کچھ اور کہنا ہے کسی زبان کے ابتدائی نشو اور ارتقائے تدریجی کے لئے جس قسم کے وسائل ترتیبی کی ضرورت ہے۔ ایک یورپین مستشرق کے خیال کے مطابق جستہ جستہ عرض کر چکا ہوں اور یہ وہ منطقی ترتیب ہے کہ اگر واقعی اُردو لٹریچر کو زندہ رکھنا ہے تو ایک منٹ کے لئے بھی اِس سے قطع نظر نہیں ہو سکتی۔ مگر مشکل یہ ہے کہ کرنے والے کہاں سے آئیں گے ، جو لوگ کر سکتے تھے وہ آج منوں مٹی کے نیچے دبے پڑے ہیں۔ علی گڈھ کی

مقتدر جماعت نصف صدی کی مشق و مہارت کے بعد بھی اس لائق نہیں کہ زبان کے مسئلہ پر اس حیثیت سے غور کرے کہ بقائے قوم کے لئے (اگر اس کی ضرورت ہو) سب سے زیادہ قومی عنصر یہی ہے کانفرنس اس قسم کی تضیع اوقات پسند نہیں کرتی، وہ ایک عملی چیز ہے سر سید کے وقت میں ایک آدھ لکچر ایسے ہو جاتے تھے جن پر انشاء پردازی کچھ دنوں اتراتی رہتی تھی۔ اب فرط سنجیدگی نے یہ سلسلہ بھی باقی نہیں رکھا۔

قوم میں بہیئت مجموعی جہاں تک نفس لٹریچر کا تعلق ہے کوئی تحریک اجتماعی نہیں امراء کو صرف اسی کا شوق نہیں، ملک میں کبھی کبھی خارجی اسباب سے عارضی تحریک پیدا ہو جاتی ہے لیکن وہ باسی کڑھی کا ایک ابال ہوتا ہے کہ آیا اور گیا۔ لٹریچر کا مذاق صحیح نہ پہلے تھا، نہ اب ہے۔ یہ وہ راز ہے جس کی بے نقابی لٹریچر کے ساتھ مٹنے والی قوم کے مستقبل کو صدیوں پہلے دفعتہً ہمارے پیش نظر کر دیتی ہے جس طبقہ سے بڑی امیدیں تھیں وہ "بالغ العلوم" ہونے کے بعد بھی اپنی زبان سے ناآشنا سا رہتا ہے جس کی خوش بیانی اور لطف کا اسے بالکل احساس نہیں۔

عورت کتنی ہی حسین ہو لیکن چاہنے والا اس کی خوش ادائی کو آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے تو آرزوں سے بھرے دل پر کیا گزرے گی، ایسا سہاگ کس کام کا جو جیتے جی بیوگی سے بھی گیا گزرا ہو۔ غرض اُردو کی طرف سے یہ بے التفاتی ایک قومی مسئلہ ہے جس پر ملک کے شائقین ترقی کو اپنی سب سے پہلی فرصت میں توجہ کرنی چاہیئے۔

میں پھر اعادہ کرتا ہوں کہ تصنیفات کا دور ختم ہو چکا، لیکن جو کتابیں پڑھنے کے لائق ہیں ان کو بھی لوگ نہیں پڑھتے۔ اس سے زیادہ خراب حالت صحافت کی ہے جو رائج الوقت لٹریچر کو وقف عام کرنا چاہتی ہے، اخبار اور رسالے عالم وجود میں

مسئلہ کبھی اس حیثیت سے پیش نظر نہیں رہا۔ یہاں تک کہ ان لائق ادب افراد نے (جن کے دل و دماغ کے نتائج آج اُردو کا بہترین ادب ہیں) منفرداً یا متفقاً کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ لٹریچر کی فطری ضروریات کے لحاظ سے کون کونسے کام ہیں جن پر ترتیباً سب سے پہلے توجہ ہونی چاہیئے۔ اور دراصل ترقی اُردو کے نظام ترکیبی کا اقتضائے طبعی کیا ہے۔

یہ ایک کھلا ہوا راز ہے کہ ملک میں جہاں تک مختلف اصناف سخن کا تعلق ہے لٹریچر کا ذخیرہ بڑھ رہا ہے۔ لیکن کیا یہ انتشار عمل کسی قاعدۂ کلیہ کے تحت میں ہے یا ہم اس سے کسی حقیقی فوائد کے متوقع ہو سکتے ہیں؟

میں نے اسی خیال سے پروفیسر براؤن آف کیمبرج کو جو آجکل کے مستشرقین یورپ میں ایک زبردست شخصیت رکھتے ہیں۔ اور جن کو مشرقی لٹریچر سے خاص دلچسپی ہے لکھکر دریافت کیا۔ ممدوح کی رائے کے مطابق ہم کو ترقی زبان کے لئے سب سے پہلے تالیفات ذیل مرتب کرنی ہوگی۔

(۱) جامع اللغات اُردو

(۲) محاورات

(۳) لغات الاصطلاحات

(۴) لغات فارسی — جہاں تک اُردو کی تکمیل کا تعلق ہے

(۵) لغات عربی — بہ ترتیب جدید

(۶) ادب الاساتذہ — ۱۲ ضخیم جلدوں میں

(۷) جامع القواعد

(۸) عقلیات، یعنی فلسفہ اور سائنس کی ہر شاخ پر ایک مستقل کتاب۔

(۹) اُردو انسائیکلو پیڈیا، جو ضابطہ علوم عصریہ ہوگی۔

کسی زبان کو سرمایہ دار اور با اصول کرنے کی یہ قدرتی ترتیب ہے جس سے براؤن کی رائے کے مطابق قطع نظر نہیں ہوسکتی۔ ہم کو محض بے غایت رسائل کی اشاعت سے خواہ وہ فی نفسہٖ مفید بھی ہوں۔ صرف مطبوعات کی تعداد بڑھانی نہیں ہے بلکہ ان وسائل کی تکمیل کے ساتھ جو زبان کی ترقی کے لئے لازم سے ہیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ ناآشنایان سخن کو کس طرح زبان کا دلدادہ بنایا جائے۔

اِس کے لئے [illegible] پروفیسر کی رائے ہے کہ کثرت سے "صالح لٹریچر" کی اشاعت کی جائے۔ اسی طرح ضخیم لغات کی ترتیب کے بعد اُردو، فارسی اور عربی کی لاکھوں جلدیں "لغات المبتدی" کی حیثیت سے مرتب کی جائیں۔ اور اس کثرت سے شائع کی جائیں کہ بچہ بچہ کے ہاتھوں میں ہوں۔

میرا خیال ہے پروفیسر "براؤن" کی یہ اسکیم نسبتاً اس قدر ضروری ہے کہ اِس کا ذکر اگر آپ کے دقیع پرچہ میں نہ آئے تو لٹریچر کی حق تلفی ہوگی۔

(معارف۔ سنہ ۱۹۱۷ء)

شبلی سوسائٹی

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے منطق نے بوسے مری زباں کیلئے

حیدرآباد کی "بزم ادب" چاہتی ہے کہ ایک شبلی سوسائٹی قائم کی جائے جس کے مقاصد ہلکے ہوں، یعنی شبلی اکیڈیمی کی طرح سخت اور ٹھوس نہ ہوں۔ لیکن قبل اسکے کہ میں اِس قسم کی سوسائٹی کی ضرورت پر نظر ڈالوں، مجھے دیکھنا ہے کہ جس کی یادگار قائم کرنی ہے وہ کس پایہ کا شخص تھا۔

کم وبیش ۲۰ برس ہوئے مولینا نے مشرقیات پر طبع آزمائی کے لئے جہانتک اسلامی علوم کا تعلق ہے۔ ایک اسکیم تیار کی تھی۔ جو خواص تک محدود رہی اور جسکی عام طور پر اشاعت نہیں کی گئی۔ اِس کی تفصیل ممدوح کی زبان سے سنئے۔ مولینا فرماتے ہیں:۔

تھوڑی دیر کے واسطے یہ فرض کرنا چاہیئے کہ زمانہ اپنی موجودہ ضرورتوں کے ساتھ قائم ہے، لیکن بجائے موجودہ نسل کے ہمارے اسلاف کا علمی گروہ دوبارہ دنیا میں آگیا ہے۔ اس حالت میں غور کرو، اس گروہ کے علمی مہمات کیا ہوں گے؟ اس سوال کا جواب قیاسی اور فرضی نہیں بلکہ اصولِ تجربہ کے موافق دیا جا سکتا ہے۔ علمائے سلف اور ان کے علمی کارنامے دونوں ہماری آنکھ کے سامنے ہیں نیز ہر شخص جانتا ہے کہ

دولتِ عباسیہ کے زمانہ تک تمام اسلامی علوم بالکل سادگی اور یک رُخی کی حالت میں تھے۔ دولتِ عباسیہ کے وجود کے ساتھ جب نئی ضرورتیں پیدا ہوئیں تو دفعتہً ایک انقلاب ہو گیا۔ سب سے پہلے علماء کا ایک گروہ پیدا ہوا جس نے یونانی، فارسی، سریانی، کالدی، ہندی اور قبطی زبانوں کے علوم و فنون ترجمہ کے ذریعہ سے عربی زبان میں منتقل کر دیئے ایک دوسرے گروہ نے اِن نمونوں کو سامنے رکھ کر اسلامی علوم کے سادہ ایوان پر مینا کاریاں اور نقش آرائیاں کیں۔ عقائد نے علم کلام کی صورت اختیار کی۔ عربیت نے ریٹرک (معانی و بلاغت) کا قالب بدلا۔ اصول فقہ میں منطقی استدلالات پیدا ہو گئے۔ تفسیر میں فلسفہ کی آمیزش ہو گئی فرائض میں علم حساب کے دقیق اصول شامل ہو گئے۔ اِن باتوں کے ساتھ علوم قدیمہ کی غلامی نہیں کی۔ بلکہ جو کچھ کیا آزاد و خود مختار بن کر کیا۔ جہاں غلطیاں دیکھیں اصلاح کیں۔ جو فضول حصّہ تھا اسکو الگ کر دیا۔ پریشان اور غیر مرتب مسائل نئے سر سے درست کئے جس قدر حصّہ اسلامی علوم میں تحلیل ہو سکتا تھا تحلیل کیا۔ جو بالکل جدا تھا اس کو مستقل حیثیت سے قائم رکھا۔

مولانا مزید گہرافشانی یوں فرماتے ہیں :۔

آج بعینہ اسی قسم کی حالت اور اسی قسم کا موقع ہے یورپ نے تمام علوم و فنون کا قالب بدل دیا ہے فلسفہ نے بالکل نئی صورت اختیار کی ہے منطق میں نئے برگ و بار پیدا ہوئے ہیں۔ معانی و بلاغت کا اسلوب

بدل گیا ہے۔ تاریخ ایک قسم کا فلسفہ بن گئی ہے۔ مذہبی مباحث کے نئے نئے پیرائے نکل آئے ہیں۔

اِسی گذشتہ مثال کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج اگر اسلاف موجود ہوتے تو علوم وفنون جدیدہ کو پیش نظر رکھ کر وہی کرتے جو انہوں نے علوم قدیمہ کے ساتھ کیا تھا۔ علم کلام کو فلسفۂ جدیدہ کے مقابلہ میں مرتب کرتے، تاریخ اور واقعہ نگاری کا انداز بدلتے، مسائل جدیدہ کو تحقیق کی نگاہ سے دیکھتے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تمام علوم وفنون کے متعلق قدیم وحال کی تحقیقات کا موازنہ کرتے۔ اور دونوں کے عیب و ہنر دکھا کر فیصلہ کرتے کہ کیا چیزیں کس حد تک قبول کے قابل ہیں اور نئی تحقیقات کو علوم قدیمہ کے ساتھ کیونکر پیوند دیا جا سکتا ہے یا ان کے نمونہ پر علوم قدیمہ کی روش کیوں کر بدل سکتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ آج قوم میں "غزالی" "رازی" موجود نہیں لیکن ان کی تصنیفات آج بھی موجود ہیں اور وہ ہمارے لئے چراغِ راہ بن سکتی ہیں۔ ان کی روشنی میں ہم اس قدر معلوم کر سکتے ہیں کہ نئے راستہ میں کیونکر قدم اٹھانا چاہیے۔ اور قدیم وجدید راہیں کہاں جا کر مل جائیں گی۔

اِن موضوعات ابتدائی کے بعد مولٰینا کے خیال میں اِن کاموں کی تفصیل جو اس زمانہ میں اسلاف کے نمونے پر کئے جا سکتے ہیں حسبِ ذیل ہو گی۔

(۱) فلسفۂ حال کے اصول اور اِس کا معتدبہ حصہ ملکی زبان میں لایا جائے۔

(۲) یہ بتایا جائے کہ فلسفۂ حال کے کون کون سے مسائل مذہب کے خلاف

میں پھر ان مسائل کو یا رد کیا جائے یا مذہب سے تطبیق دی جائے۔

(۳) جس قسم کے مضامین پر آج کل یورپ میں تصنیفات ہو رہی ہیں اور جن پر اسلامی تصنیفات بھی موجود ہیں ان میں موازنہ کر کے بتایا جائے کہ مسلمانوں کا طرز تصنیف کیا تھا۔ اور یورپ کا طرز تصنیف کیا ہے مثلاً تاریخ اسماء الرجال، معانی و بلاغت، تحقیقات مذہب میں عربی زبان میں کثرت سے تصنیفات موجود ہیں ان ہی مضامین نے یورپ میں نئے نئے اسلوب اختیار کئے ہیں۔ موازنہ کر کے بتانا چاہیئے کہ دونوں کے مختلف خصوصیات کیا ہیں۔ اور کس کو کس حیثیت سے ترجیح ہے۔

(۴) خالص اسلامی علوم مثلاً کلام، فقہ، اصول، تفسیر وغیرہ کی تاریخ اور ان پر ریویو لکھا جائے۔ یعنی یہ کہ یہ علوم کب پیدا ہوئے۔ کیونکر بڑھے کس کس زمانہ میں کیا کیا باتیں ان پر اضافہ ہوتی گئیں۔ اور کن اسباب سے ہوئیں ان کا کس قدر حصہ صحیح ہے، کس قدر تنقید اور اصلاح کا محتاج ہے،

(۵) فارسی اور عربی شاعری اور انشاء پردازی کی تاریخ لکھی جائے۔

(۶) جن نئے عنوانوں پر یورپ میں مضامین لکھے جا رہے ہیں اردو زبان میں ترجمہ کے ذریعہ سے لائے جائیں۔

(۷) مسلمانوں کی تہذیب و تمدن پر تاریخانہ مضامین لکھے جائیں، مثلاً انتظام عدالت، انتظام محاصل، پبلک ورکس، تعلیمات، تجارت، فوجی نظم و نسق، معاشرت، غرض اس قسم کے تمام امور کی نسبت مورخانہ طور لکھا جائے کہ مسلمانوں نے ان چیزوں میں کہاں تک

ترقی کی اور کس کس عہد میں کیا اضافہ ہوا۔"

ظاہر ہے کہ مقاصد جو دکھائے گئے ہیں۔ ان کی تکمیل ایک دو شخص کا کام نہیں بلکہ ایک مجمع العلماء کا کام تھا۔ لیکن مولانا اپنی زندگی میں جو کچھ کر سکے اسکو پھیلانا اور تفصیل سے دکھانا "دار المصنفین" کا کام ہے۔ ہمارے سبک مقاصد کے لئے صرف اتنی ہی ضرورت تھی کہ اس جامع الحیثیات مصنف کی دماغی وسعت کا ایک سرسری خاکہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہو اور بھولا ہوا سبق یاد آجائے۔

ہم کو طعنہ دیا جاتا ہے کہ پرستاران شبلی مولینا کو غزالی اور شاہ ولی اللہ سے کم نہیں سمجھتے۔ لیکن منحرف طبائع کو معلوم نہیں کہ آجکل کے دور مادیت میں کسی کی عظمت کے لئے محض خوش عقیدتی کافی نہیں۔ فوقیت کا راز ان دماغی تصرفات میں ہے جو صرف حکمائے ادب کا حصہ ہوتے ہیں۔ ہم ان صاحبوں کو ایک حد تک "غیر مکلف" سمجھنے کے لئے تیار ہیں جو جن کے نظام عصبی کا مستقر سرے سے ان مسائل کے ادراک کی قابلیت نہیں رکھتا۔ یا جن کی نفسیت غیر شاعرہ ہمارے زاویۂ نگاہ کے ساتھ نہیں دے سکتی۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بتا دینا ضروری ہے کہ وہ قوم سخت بدنصیب ہے جو اپنے مصنفین گنے (جو صرف انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں) نتائج افکار پر فخر نہیں کر سکتی۔ ہم شبلی کو صرف اس لئے چاہتے ہیں کہ وہ خالص ادیب تھے۔ اور اپنے اونچے معیار تصنیف کے لحاظ سے متاخرین ادب میں کسی سے دوسرے درجہ پر نہیں تھے۔ یعنی انکی عظمت جو کچھ ہے ان کی ادبی اور تاریخی تصنیفات کی بنا پر ہے۔

بہرحال ہم کو اس شریفانہ جذبہ کے لئے جہاں تک لٹریچر کی تحسین شناسانہ کا تعلق ہے معذرت کی ضرورت نہیں ہے۔ اور ہم بلا خوف تردید مولانا کے وسیع ذخیرہ

ادب سے صرف "شعر العجم" کو لیتے ہیں جو تنقید عالیہ (ہایر کریٹی سزم) کا بہتر سے بہتر نمونہ ہے جس پر دنیا کی کوئی زبان ناز کر سکتی ہے۔ یہی کتاب ہے جو "خیام کلب" کی طرح ہماری سوسائٹی کو ایک متحد الغایۃ نظام کے تحت میں لا سکتی ہے، جس طرح "فٹز جیرلڈ" کی ملہمانہ شاعری نے خیام کو یورپ میں زندہ کر رکھا ہے اور آج خیام کے پرستاروں کا بہت بڑا حلقہ پیدا ہو گیا ہے۔ "شعر العجم" میں بھی بالخاصہ یہ کہر بائیت موجود ہے کہ وہ کم سے کم تعلیم یافتہ طبقہ کے منتخب افراد کو کسی ایک، مرکز پر لا سکتی ہے۔ مجھ کو اصرار ہے کہ صرف اردو لٹریچر میں نہیں بلکہ مشرق کی کسی زبان میں اس پایہ کی تصنیف موجود نہیں ہے۔

فارسی زبان کی لائق ذکر خصوصیات ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ اس کا وسیع ذخیرۂ الفاظ، شستہ، رفتہ طرز بیان اور ادائے خیال کی بہتری جدت آمیز نزاکتیں ہیں جن کی بنا پر آج بھی وہ زندہ زبانوں میں کسی سے پیچھے نہیں۔ ایسی لچکدار زبان کی شاعری جو جذبات انسانی کی برانگختہ کرنے والی ہو۔ اور جس میں خود نفس انسانی مخاطب پر صحیح ہو۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کیا پایہ رکھتی ہے۔ نثر کو اگر "ضروریات" زندگی میں رکھئے۔ تو شاعری اپنی ادائے خاص کے مابہ الامتیاز کے رو سے ان "تکلفات" کا نام ہے، جن سے کوئی شائستہ اور متمدن قوم قطع نظر نہیں کر سکتی۔ بہر حال شعر العجم دنیا کی سب سے شیریں زبان کے جذباتی لٹریچر کا ایک مرقع ہے جس میں مصور فطرت شبلی نے اس طبقہ کو زندہ کیا ہے جو مرنے کے بعد بھی غیر فانی ہونے کا مستحق تھا اور ہم ایسے شخص کی یادگار میں کچھ نہ کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

شعر العجم کا چوتھا حصہ جس میں مولانا نے شاعری پر عام تنقید کی ہے پوری کتاب کا روح رواں ہے۔ مولانا کے کمال انشاء پردازی اور سخن آفرینی کا یہ حصہ اصلی

جولانگاہ ہے، جس میں انہوں نے اپنا زورِ قلم دکھایا ہے۔ فردوسی[1] پر جس طرح نظر ڈالی ہے اس کے کمال کی باریکیاں جس جس طرح ابھار کر دکھائی ہیں، سچ یہ ہے کہ اس سے پہلے انھر ذہن بھی منتقل نہیں ہو سکتا تھا۔ اور یہی نکتہ سنجی کی آخری حد ہے جس میں وہ اپنے معاصرین سے علانیہ ممتاز نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ حصّہ صرف مثنوی پر ختم ہو گیا ہے۔ بقیہ اصنافِ شاعری یعنی تشبیب و غزل، قصائد و رباعیات وغیرہ کے سلسلہ میں مولینا نے عشقیہ صوفیانہ اور فلسفیانہ شاعری کے مستقل عنوانوں سے دادِ سخن دی ہے۔ جو حضرات لٹریچر کا مذاق صحیح رکھتے ہیں وہ اس حصّہ کی "عطریات" کا اندازہ کر سکیں گے۔ میں ان اجزاء کو اس قدر اہم سمجھتا ہوں کہ کتابی سلسلہ سے علیحدہ جہاں تک شاعری کی ماہیت نفسی (سایکالوجی) کا تعلق ہے۔ دونوں حصّے بجائے خود ایک مستقل چیز ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ پانچواں حصّہ جس کا مسودہ موجود ہے اس وقت تک پریس میں نہ جا سکا۔

بہت کم لوگ ہیں جنہوں نے شعر العجم پڑھنے کی تکلیف گوارا کی ہو گی۔ ان میں بھی تھوڑے ہی ایسے ہیں جنکو شاید یہ علم ہو کہ شبلی کی آخری تصنیف کا سب سے آخری حصّہ[2] اس وقت تک شائع نہ ہو سکا، اور ایسا تو ایک بھی نہیں ہے جسے اس کی

---

[1] فردوسی کو اپنے کلام کی داد زندگی میں نہ مل سکی۔ لیکن مولانا نے جس طرح اسکی تلافی کی ہے اچھے اچھے اہلِ قلم کو اس پر رشک آئیگا، پروفیسر براؤن بھی جو طبقۂ اعلیٰ کے لکھنے والوں میں ہیں تحقیق کے ساتھ مذاقِ سخن کہاں سے لاتے۔ ان کی تاریخ الادب اس حیثیت سے بہت پھیکی رہی۔

[2] تین سال سے یہ کتاب پڑی ہوئی ہے۔ اس کے طبع کرنے میں زیادہ سے زیادہ ۳۰۰ روپے صرف ہونگے کیا شبلی سوسائٹی میں "۳۰" ارکان بھی ایسے نہیں مل سکتے جو دس، دس روپے اسکے لئے جیب سے نکال سکیں،

اشاعت کی ضرورت کا احساس ہو۔ "معارف" کا خیال ہے کہ طبقۂ متوسط میں فرض شناسی کا احساس پیدا ہو گیا ہے لیکن امراء میں نہیں۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے اس سے اتفاق رائے ممکن ہو تو علمی دنیا کے لئے یہ بالکل نیا انکشاف ہوگا۔ جہاں تک اردو انشاء پردازی کے مذاق کا تعلق ہے کوئی روح عامہ موجود نہیں ہے۔ دو چار کام جو ہو رہے ہیں وہ محض اس لئے کہ ان میں امرار کا "طلائی ہاتھ" ایک حد تک شریک ہے لیکن یہ فیاضی بھی اضطراری ہے، احساسی نہیں۔

مختصر یہ کہ پانچواں حصہ نہایت دلچسپ ہے اس میں صوفیانہ شاعری کی ارتقائی حالت کے سوا تنقیدِ شاعری کے تفصیلی ریویو میں عرب اور عجم کے جذبات کے دقیق امتیازات دکھائے گئے ہیں۔ جس کا ایک حصہ "معارف" میں نکل چکا ہے۔ ناظرین آنکھ اٹھا کر ایک نظر دیکھ لیں۔ یہ نفاست خیال، یہ خوش بیانی اب کہاں:

"اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے"

اس کی اشاعت "شبلی سوسائٹی" کے فرائض میں سرِ فہرست ہونی چاہیئے۔ ورنہ فارسی شاعری کی انسائیکلوپیڈیا ناتمام رہ جائے گی۔

مولانا کے مضامین یعنی "مقالاتِ شبلی" پر بھی ایک نگاہ ڈالنی ہوگی، جس کی ترتیب میرا خیال ہے نظرِ ثانی چاہتی ہے۔ جہاں تک میں استقصار کر سکا، کم و بیش ۳۶ مضامین اور ہیں۔ جن سے مقالات کی دوسری جلد تیار ہو سکتی ہے۔ ان چھوٹے چھوٹے خطہائے سخن میں مستقل رسالہ کی حیثیت رکھتے ہیں، مثلاً "فلسفۂ[1] یونان و اسلام" جس کے

---

[1] فلسفۂ یونان و اسلام نمبر ۱، ۲، ۳، ۴، ۵ الغایۃ ۴ ایک ہی خاندان کی شاخیں ہیں۔

متعدد نمبر ہیں۔

تاریخ کا یہ ایک اہم سوال ہے کہ مسلمانوں نے اپنے دور میں فلسفہ و سائنس پر کچھ اضافہ و ترمیم کی یا نہیں۔ یا جیسا بارہا کہا گیا ہے "وہ ارسطو کی گاڑی کے صرف قلی تھے"۔ یورپ کے جن مستشرقین کا فیصلہ ہمارے حق میں ہے وہ بھی اس لحاظ سے چنداں وقیع نہیں کہ یہ فیصلہ اجتہادی نہیں۔ بلکہ عربی فلسفہ کی سرسری واقفیت پر مبنی ہے بلکہ مولانا نے دکھایا ہے کہ مسلمانوں نے فلسفۂ یونان کو کس حالت میں پایا، ان میں کیا کیا تصرفات کئے اسی طرح "فلسفۂ اسلام" میں علومِ جدیدہ سے بحث کی گئی ہے۔ یعنی یونانیوں کا فلسفہ کیا تھا۔ فلسفۂ حال کیا ہے ؟ مسلمانوں کے فلسفہ کو دونوں فلسفوں سے کیا نسبت ہے ؟ یہ معرکۃ الآرا سلسلہ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ناتمام رہا۔ ابن رشد کا مضمون بھی نہایت ضروری ہے۔ جس کے فلسفہ پر یورپ مدتوں جیتا رہا۔ گو مولینا اسکی تصنیفات اور اجتہادات پر ریویو نہ کر سکے۔ "شعر العرب" کے چار نمبر، شعر العجم کے مقابلہ میں ہماری قابلِ افسوس ناداری کے لحاظ سے پھر بھی غنیمت ہیں۔

ایک کام جو دراصل شبلی سوسائٹی کے کرنے کا تھا۔ اس کی اولیت دارالمصنفین کے حصہ میں رہی۔ میری غرض مکاتیب شبلی کی دو جلدوں سے ہے جو مولانا سید سلیمان کی

بقیہ حاشیہ صفحہ

(۲) فلسفۂ اسلام نمبر ۱، ۲

(۳) الاسلام نمبر ۱، ۲، ۳

(۴) ابن رشد نمبر ۱، ۲، ۳

(۵) شعر العرب نمبر ۱، ۲، ۳، ۴

جن سے ایک مستقل رسالہ تیار ہو سکتا ہے، اگر رسائل شبلی اور مقالات کے مضامین یکجا کر دیئے جائیں اور "عالمگیر" کا مضمون بھی شامل کر لیا جائے۔ تو دو نہایت ضخیم جلدیں تیار ہو سکتی ہیں۔

تہذیب (ایڈیٹری) میں نہایت نفاست سے شائع ہوئیں۔ عہد جدید میں کوئی مثال ایسی نہیں ہے جس میں کسی مصنف کے رنج کے خطوط جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔ اور جس کے اجزا کچھ سو صفحوں پر پھیلے ہوں۔ جس طرح آج کل خوش لباسی کی شرط یہ ہے کہ اس میں کم سے کم پیدا کردہ بے ساختہ پن[1] ہو، یعنی کہیں سے اہتمام نہ پایا جائے، لٹریچر کا وہ حصہ بہت دلچسپ ہوتا ہے، جس میں آمد سخن یعنی برجستہ ادائے خیال کی حیثیت سے تکلف مقصود و اہتمام کو کچھ دخل نہیں ہوتا۔ یہ بات صرف پرائیوٹ تحریرات میں ہو سکتی ہے جس کا وقتی اظہار مافی الضمیر کے سوا یہ نہیں ہوتا کہ وہ گھونگھٹ سے باہر آئیں۔ لکھنے والے کو بالکل خبر نہیں ہوتی لیکن اس کی سرسری جنبش قلم غیر ارادی طور پر اس کا روزنامچہ زندگی مرتب کرتی جاتی ہے، جسمیں اس کے اصلی جذبات و احساسات کے خط و خال دیکھ لیجئے۔ یہ بھی ایک طرح کی مرقع نگاری ہے۔ جس میں نزاکت یہ ہے کہ انشاء پرداز اپنی تصویر خود اپنے قلم سے کھینچتا ہے۔

ایک دوست کی جو مغربیات کا نہایت صحیح مذاق رکھتے ہیں خواہش تھی کہ اس مجموعہ کی ترتیب تاریخی حیثیت سے ہوتی تھی۔ لیکن یہ اس لئے نہیں ہو سکا کہ مواد ترکیبی ایک وقت میں پیش نظر نہیں تھا۔ مدتوں ان بکھرے ہوئے موتیوں کے لئے لائق ایڈیٹر کو جانے کہاں کہاں کی خاک چھانی پڑی۔ اس کے سوا مختلف اشخاص سے مولانا کے روابط کی نوعیت بھی جداگانہ تھی۔ کسی ایک سلسلہ یا موضوع خاص کی تحریریں تاریخی ترتیب سے "خواب پریشاں" کی طرح منتشر ہو جاتیں جس سے وہ موزونیت جواب ہے باقی نہیں رہ

---

[1] Studied negligence

سکتی تھی۔ بہر حال اُردو لٹریچر میں میرا خیال ہے یہ ایک قیمتی اضافہ ہے اور چونکہ مولانا کی تصنیفات کی طرح اِن میں بھی انشا پردازانہ فصاحت و بلاغت موجود ہے اِس لئے دار المصنفین کے "خوانِ ادب" کا یہ وہ لطیف حصّہ ہے جسے آپ لائٹ لٹریچر کہہ سکتے ہیں۔ اس میں ابھی بہت کچھ اضافہ کی گنجائش ہے اور امید کرتے ہیں، ہماری سوسائٹی تیری جلد کے سامان کی فراہمی میں کافی دلچسپی کا اظہار کرے گی۔

اسی سلسلہ میں ایک اضافی کام اور ہمارے کرنے کے لائق ہے یعنی ملک کے تعلیم یافتہ طبقہ کی طرف سے شبلیؔ کی یادگار میں ہم کو خیاؔم کی رباعیات کا ایک نفیس ایڈیشن شائع کرنا ہے۔ ہم کو "خواجہ حافظ" کے ساتھ بڑھی ہوئی حسنِ عقیدت کے مقابلہ میں غریب خیاؔم کے وجوہِ حق تلفی پر غور کرنا ہوگا۔ مشرقی اقوام نے مذہب سے علیحدہ ہوکر کبھی زندگی پر نظر نہیں ڈالی۔ خیاؔم کا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ وہ زندگی کے صرف اس حصّہ سے غرض رکھتا ہے جو "از گہوارہ تا گور" سے آگے نہیں بڑھتی۔ کیا یہ الحاد ہے؟ قطعاً نہیں! مذہبی مذاق بالخاصہ موجودہ زندگی کو اگرچہ حرفِ غلط نہیں سمجھتا تھا تاہم اس کا میلان طبعی یہ ہے کہ اصلی زندگی کا آغاز قبر کے اس سانچے میں ڈھلنے کے بعد ہوتا ہے لیکن خیاؔم جو کچھ سامنے ہے یعنی مادی زندگی سے قطع نظر کرنا نہیں چاہتا۔ اس کا دائرہ موضوع ہستی موجودہ یعنی "نقد" ہے "ادھار" نہیں۔ یہ بھی صحیح نہیں کہ وہ اپیکورین فلسفہ کی کورانہ تلقین یعنی صرف ایک طرح کی خوش عیشی سکھاتا ہے اخلاقی تعلیم کی بڑی سے بڑی غایت یہ ہے کہ وقت موجودہ سے جہاں تک ممکن ہے جائز استفادہ کا کوئی پہلو رہ نہ جائے۔ خیاؔم بھی یہی کہتا ہے کہ "کل جو گزر گئی بے کار سی چیز ہے، جو آئے گی وہ غیر اختیاری ہے۔ زندگی "آج" اور صرف آج کا نام ہے۔

ایشیا نے خیام کے ساتھ افراط سنجیدگی سے ہمیشہ بے اعتنائی کی۔ بے چارہ یورپ کے ہاتھوں جی رہا ہے۔ ہم کو اس سرد مہری کی تلافی کرنی ہے سب سے پہلے "فٹز جیرلڈ" کی نظم کو اُردو میں لینا ہوگا۔ ہمارے پاس کافی مواد موجود ہے جس سے ہم یہ بتلانے کے لائق ہوں گے اس کے خیالات کا ماخذ کیا ہے یعنی خیام کے سوا اس نے اپنے سلسلہ خیال میں اور کس کس سے فائدہ اٹھایا ہے اصلی کام یہ ہوگا کہ خیام کا آکسفورڈ ایڈیشن جو غالباً سب سے قدیم نسخہ ہے اور جس میں رباعیات کا فوٹو لیا گیا ہے۔ اُردو ترجمے اور حواشی کے ساتھ ملک کے سامنے پیش کیا جائے اس اشاعت کی امتیازی خصوصیت یہ ہوگی کہ خیام کے فلسفۂ زندگی پر سوسائٹی کے "عالم نفسیات" کا تفصیلی ریویو ہوگا۔ اور کیا تعجب ہے اس سلسلہ میں ہم اس پر بھی غور کر سکیں کہ خیام کی شراب انگوری کھینچ کھینچا کر شراب معرفت کیوں بنی؟ اس پہلو سے ہم تصوف کے ان مسائل پر ایک نظر ڈال سکیں گے۔ جو براہ راست علم النفس کی زد پر ہیں۔ اور کچھ نہ کچھ اس راز کی عقدہ کشائی ہو سکے گی، جس کی وسیع الکیفی کی لائق رشک خصوصیت یہ ہے۔

"مست کرمے بودن و ہم رنگ مستاں زیستن"

سب سے آخر مگر در اصل کسی سے پیچھے نہیں۔ مولانا کی فارسی اور اُردو نظم کو یکجا کرنا ہے جو باوفات مختلف ٹکڑے پارے ہو کر چھپتی رہیں۔ بہت سی پھول پتیاں ہیں جن کے اجزائے پریشاں بکھرے ہوئے ہیں۔ اور جن میں کوئی ہیئت مجموعی نہیں۔

کسی نازنین کی زلف عنبریں جو شانوں پر بکھرتی ہوئی حسن انتشار کے ساتھ کمر سے

نیچے جا پڑی ہو۔ کیفیت سے خالی نہیں ہوتی، لیکن "گرہ شب"[1] یعنی جوڑ کی بندش اس سے زیادہ دلکش اور خوش ترکیب ہوتی ہے۔ ضرورت ہے کہ اوراق منتشرہ کا ایک گلدستہ بنایا جائے۔

بمبئی کی نازک خیالیاں گویا میری جوانی کے قصے ہیں جو مولینا کی زبان سے ادا ہوئے آپ داد دیں یا نہ دیں، شاعر کو بالکل اس کا احساس نہیں اسکا عالم خیال خود ایک دنیا ہے۔ ذرا جذبات کا تموج دیکھئے گا۔ سمندر کے کف سے ایک پری[2] نکلی، لیکن بالکل عریاں، جس کے بالوں سے قطرات آب موتی کی طرح ٹپک رہے ہیں۔ اس کے نازک سے ہاتھ میں ایک ساغر شراب ہے وہ شاعر کی طرف بڑھتی ہے۔ عنبر بکھیرتی ہوئی یاقوتی ہونٹوں پر ایک معنی خیز تبسم ہے نازک خیالی جس کی بلائیں لے رہی ہے، ذرا شاعر کی کافرادائی دیکھئے شراب کبھی منھ سے نہیں لگی۔ صرف زبان پر چڑھی تھی، لیکن اس نے چھلکتا ہوا جام دفعتہً خالی کر دیا!

یہ چھلکائیں بھر کے لاؤ گلابی شراب کی ؛ تصویر کھینچیں آج تمہارے شباب کی

کہیں یہ "آبِ حیات" تو نہیں تھا؟

بہر حال جس نازک خیال اور نفیس المذاق نے عجم کی شاعری کو اپنے زور قلم سے زندہ کیا ہو، اس کے کلام کی ترتیب کم ضروری نہیں یعنی کلیات شبلی کے ایک خوبصورت

---

[1] بہم کردہ موئے بصد پیچ و تاب ؛ گرہ داد شب را بسر آفتاب

[2] مصنف کی داد یہ خیال ایک نہایت حسین مرقع کے ذریعہ سے ادا کیا گیا ہے جس میں مغربی آرٹسٹ نے اپنا کمال فن دکھلایا ہے۔

ایڈیشن کی اشاعت ناگزیر سی ہے اس میں وہ اخلاقی اور سیاسی نظمیں بھی ہونگی جو "کشافیات" کے پردہ میں "البلال" میں وقتاً فوقتاً نکلتی رہیں۔ یہ ترتیب تاریخی حیثیت کی ہوگی جس سے مولانا کی شاعری کی تدریجی رفتار اور اس کے ارتقائے نفسی کا اندازہ ہو سکے گا۔

یہ خیالات جن کے اظہار میں جلدی کر رہا ہوں شبلی سوسائٹی کے دائرہ مقاصد سے باہر نہیں ہیں۔ ابھی اصل مسئلہ کی طرف توجہ کرنی ہے میری غرض ان تحریکات سے ہے جن سے کسی طرح تعلیم یافتہ طبقہ اردو کا شیدائی بنایا جا سکے۔ تصنیف و تالیف کی چنداں فکر نہیں کہ نہیں نہیں پر بھی کچھ نہ کچھ ہو رہا ہے۔ انجمن اردو نے بعض لاجواب اور قیمتی رسائل شائع کیں اور اس کا آئندہ نظام عمل (پروگرام) بھی وسیع لائنوں پر ہے۔ "دار المصنفین" بھی اپنا یہ درجہ قائم رکھنا جانتا ہے۔ اور خواص کی پھانس کے لئے "لقمہ ماہی" تیار رکھتا ہے لیکن سچ یہ ہے کہ ان اوسوں پیاس کا بجھنا آسان نہیں۔ یعنی ہماری علمی تشنگی کے لحاظ سے برف میں لگی ہوئی چند بوتلیں کافی نہیں تھیں۔ مگر اب کہ "ہز رائل ہائنس فرمانروائے دکن" کے سایۂ عاطفت میں "عثمانیہ یونیورسٹی" قائم ہو رہی ہے۔ اردو کا دائرہ اثر بہت بڑھ جائیگا۔ یہ فیاضانہ اسکیم اگر "سرخ فیتے" یعنی جن کے ہاتھوں میں انتظام ہے۔ آشنائے فن ہو کر خوش سلیقگی سے چلا سکے۔ تو باوصف اس کے کہ ابتداً ایک مقامی تحریک ہوگی اردو کی وسیع

لہ آمد سخن کا ایک اضطراری تصرف ہے۔ لیکن اگر رائلٹی یورپ کی اودی اودی رگوں کی روانی خون کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ "مشرق کے سب سے بڑے شہزادے" کے لئے جو اپنے وسیع ذرائع مالی و اقتصادی کے ساتھ اپنے لائق رشک سن و سال کے لحاظ سے دنیا کے بہتر سے تاجداروں سے کم نہیں ہے۔ ہم "شاہی" انتساب کو کیوں نہ جائز رکھیں۔

قلمرو میں اس کا اثر برقی رو کی طرح دوڑ جائے گا اور یہ ایک ایسا چشمہ جاریہ ہو گا جس کی شاخیں ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلی ہوں گی بشرطیکہ ہم وقت سے فائدہ اٹھا سکیں اور اس وسیع الاثر تجویز کے نتائج کو متفقہ کوشش سے وقف عام کر سکیں۔

آج ہم میں بڑے سے بڑا تعلیم یافتہ صرف خوش وضعی (فیشن) پر جان دیتا ہے اس اس کا لباس تہمد نہ (کوٹ پتلون) اس کی امتیازی زندگی کا ایک ایسا مظہر ہے جس سے وہ باوصف کم استطاعتی قطع نظر نہیں کر سکتا۔ اس کی لطافت خیال نئی وضع کے ڈبل کالر میں ریشمی ٹائی کی چھپی ہوئی نشست سے آگے نہیں بڑھتی گلے کی "بندش" کا تلازمہ اگر کہیں ہم رنگ موزے اور رومال سے ہو گیا پھر تو اس کے تخیل کی تکمیل کے لئے موجودہ دنیا میں کوئی حالت منتظرہ باقی نہیں رہتی۔ آپ یہ نہ سمجھیں میں اس خوش لباس حیوان ناطق کو اول درجہ کے معیار سے گرا کر آدم کی پوشش پر لانا چاہتا ہوں۔ میری غرض صرف یہ ہے کہ یہ طبقہ جس طرح ظاہری ٹھاٹھ کا گرویدہ ہے دماغی آرائش بھی اس کا مطمح نظر ہوتی اور یہ اردو لٹریچر سے اتنا مانوس ہو سکتا کہ ادبی رنگ رچ کر نکھر جاتا ہے جس سے قوم دنیا میں آبرودار ہو کر رہتی۔

آج ہماری سیاسیات کی جو کچھ حالت ہے ظاہر ہے ہماری "اقلیت" انتشار ذات کی حیثیت سے قوی تر عناصر میں بتدریج جذب ہوتی جاتی ہے اور ہم بظاہر ابھی کچھ ابھرتے نظر نہیں آتے بیشک جو مطالبے گورنمنٹ سے کئے جاتے ہیں وہ ملک کے قدرتی حقوق ہیں لیکن جب تک فاتح و مفتوح کی زبان و مذہب اور قومیت ایک نہ ہو گورنمنٹ کے طرز عمل (پالیسی) میں ہمارے جذبات کی کہاں تک رعایت ہو سکتی ہے لیکن ان کی مشکلات سے قطع نظر کر لیجئے کیا اس بدنصیب براعظم میں سیاسی مصالح کی بنا پر یہی کوئی متحدہ قومیت کی

روح موجود ہے یا کبھی ہو سکتی ہے ؟

مسلمانوں نے سب سے بڑی غلطی یہ کی کہ آئے تھے حکومت کرنے لیکن اس طرح جم کر رہ پڑے جیسے کوئی خانہ برباد پردیس میں اگر بات بن گئی تو رئیس بن جاتا ہے اس غلطی کی تلافی تو اب ہو چکی لیکن سوال یہ ہے کہ سات کروڑ اشرف الموجودات جنمیں کوئی ہیئت مجموعی نہیں۔ ہمارے کس کام کے ہیں؟ ہندوستان کی اصلی قوم ہم کو اضافی اور خارجی عنصر سمجھتی ہے۔ غیر جگہ ہمارے پھیل پڑنے سے یہی نہیں ہوا کہ ہم نے اپنی اصلیت اور یکرنگی کھوئی بلکہ اپنے ساتھ انکو بھی لے ڈوبے جنکا یہ اصلی وطن ہے اور جو ان کی تحقیق التیج اغراض کے لحاظ سے دراصل ان کے لیئے خلاصہ دنیا تھا۔

آج آپ ایک جداگانہ قوم (؟) کی حیثیت سے اپنی گذشتہ روایات (؟) کی بنا پر خاص خاص مراعات چاہتے ہیں لیکن اگر اصلی قوم میں گھل مل کبھی جائے یعنی خوش ذائقہ بریانی سے دست کش ہو کر "کبھی رسوئی" پر آرہیئے تو نتیجہ اس کے سوا کیا ہوتا ہے کہ شرکت کی ہانڈی چوراہے میں! بہرحال فضاے امید کسی رخ سے دیکھیئے غیر حوصلہ افزا ہے لیکن اس دور حریت میں اگر آپ اپنا ادب (لٹریچر) بھی کھو بیٹھے تو تاریخ آگے چل کر آنکھیں دکھائے گی کہ ترقی تو خیر' جس نقطہ پر ہم کو اپنی روایات سابقہ کی بنا پر قائم رہنا تھا وہاں بھی نہ ٹھہر سکے۔ آجکل کی جنگی اصطلاح میں۔ ادبی حیثیت سے ہماری یہ شاندار "پسپائی" آئندہ دنیا کے لئے واقعہ عبرت ہوگی۔

کس قدر غیر منطقی خیال ہے کہ ہم برادرانِ وطن سے یہ چاہتے ہیں کہ وہ اردو کو ہماری طرح اوڑھنا بچھونا بنائیں۔ وہ خوب سمجھتے ہیں کہ کوئی قوم اس وقت تک اپنے لئے "مستقبل" نہیں پیدا جب تک کہ اسکی ابتدائی رفتار کی بنائے اساسی منازل

ارتقائی کے سلسلہ میں اس کی گذشتہ عظمت پر نہ دیکھی گئی تو یہی گذشتہ عظمت ہے جو کسی قوم میں ہئیت مجموعی پیدا کرتی ہے۔ ہندی کے قومی زبان بنانے کا راز یہی ہے جو بھولے مسلمانوں سمجھ میں نہیں آتا۔ خوب یاد رکھئیے ہندی کا مسئلہ کی تجدید چند تاریک خیال دیہاتیوں کی مخروطی دماغ کی جدت آمیز اختراع نہیں ہے، بڑے سے بڑا روشن خیال اور تعلیم یافتہ ہندو بھی اس زبان سے دست بردار نہیں ہوگا۔ جس کو وہ اپنی قوم کی اسپرٹ دیکھنا چاہتا ہے۔ یہی وہ مرکزی نقطہ ہے جس کے گرد اسکی متحدہ قومیت کے تمام مفردات ایک ایک کرکے حلقہ زن ہوں گے۔

مسلمانوں کو یاد رکھنا چاہئیے کہ یہ فریمسنوں کا ایک راز ہے جو سینہ بہ سینہ منتقل ہو رہا ہے اور پاس کے پاس ہم کو کچھ خبر نہیں ہوئی۔ ہندی[1] کی دبے پاؤں مگر نہایت مستقل ترقی در اصل اردو کے گلے کی چھری ہے جو ایک دن اس کا خون کرکے رہے گی حکومت بھی رنگ غالب کا ساتھ دیگی۔ اس لئے میں عرض کئے دیتا ہوں کہ اگر مسلمانوں کی یہی غفلت رہی تو زیادہ نہیں پچاس برس کے بعد آپ جانتے ہیں کیا ہوگا؟ اردو کا وہی رنگ ہوگا جس کا ایک دھندلا سا خاکہ حال میں "ہمدم" کے لائق ایڈیٹر نے پیش کیا تھا کہ وہ بھی کعبہ میں! لکھنؤ اردو کا گہوارہ طفلی نہیں بلکہ اس کا عشرت کدہ شباب رہا ہے لیکن وقت کی بات ہے جس چیز پر ہم کو ناز تھا۔ جو ہمارے لئے گرمیٔ محفل کے سامانوں میں نہیں بلکہ شرط زندگی تھی آج سرے سے اس کا وجود ہی معرض خطر میں ہے اگر ہندی نے

---

[1] میں یہ لکھ رہا ہوں دفعتہً "ہندی لٹریری کانفرنس" کی خبر آئی جسکی پہلی نشست میں صرف ایک رئیس نے دس ہزار دیدئے لیتا مد کے لحاظ سے اسے ناگری پرچارنی سبھا کا تخت رواں سمجھئے!

رفتہ رفتہ ہاتھ پانوں نکالے تو یہ ایسا ہی ہوگا جیسے وضعدار بیویوں میں بڑے پائچوں کی جگہ خوش ادائی سے کھوئے جاتے ہیں۔ گاڑھے گزی کی ساریوں کو رواج دیا جائے جیسے دیہات کی کثیف عورتیں نصف ساق تک لپیٹ لیتی ہیں۔

منھ پر آئی ہوئی بات رکتی نہیں۔ اور میں سلسلۂ گفتگو میں آپ سے جانے کیا کیا کہنا چاہتا ہوں۔ خاص کر اس خیال سے کہ چیاؤں آواز کی رسائی نہیں تحریر مقاصد دلی کی وکیل بن سکتی ہے۔ مختصر یہ کہ یاران وطن نے اردو کو لنگوٹی بندھوا دی ہوتی لیکن کثرت یاس کبھی امید کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔ دفعتہً واقعات نے کروٹ لی اور اردو جو کل تک کسمپرسی حالت میں تھی آج شاہی دائرہ نظر میں ہے جھونپڑوں کی رہنے والی محلوں کا خواب! بات بنتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ اس غیر متوقع اعزاز کے ساتھ اس کی آبرو کا نباہ جیسا بار بار کہہ چکا ہوں ہمارے نوجوانوں کے ہاتھ میں ہے۔ اس کی چلتی ہوئی تدبیر یہ ہے کہ جدید تالیفات سوا جو پڑھنے کے لائق ہوں حکمائے ادب کی تصنیفات ایک ایک کرکے پیش نظر رکھئے جس طرح صوفیہ کو تزکیۂ نفس کے لئے ریاضات شاقہ کے سلسلہ میں بہتیرے مقامات طے کرنے پڑتے ہیں۔ آپ کے وظائف عمل کے لئے "عناصر خمسہ"[1] کے اچھروں پر نظر کا ایک دفعہ جالینا کافی ہوگا۔ اسی لئے سب سے پہلے آپ کو "فلسفۂ عشق" یعنی "شعر العجم" کی چاٹ پر لگانا چاہتا ہوں۔ یہ تو فرائض ہوئے نوافل میں "معارف" ورد ماہوار

---

[1] میری غرض آزاد، سرسید، نذیر احمد اور حالی و شبلی کی تصنیفات سے ہے۔ متاخرین میں یہی ارواح قدسیہ ہیں جن کو موجودہ لٹریچر کی خلاقی میں جہاں تک طبقۂ اعلیٰ کا تعلق ہے سب سے زیادہ دخل ہے۔

ناگزیر سا ہے اور یہ شبلی سوسائٹی سب سے پہلی اور ضروری خصوصیت ہوگی۔
آج کل کے دور سر فروشی میں کیا سات کروڑ میں سات لاکھ نہیں، سات ہزار نہیں، سات سو رضاکار "فدایان سخن بھی نہیں مل سکتے جن کی زندگی کا بہترین تخیل "معشوقۂ ادب" کی پرستش کے سوا کچھ نہیں جس کا حسن افسردہ سفارشی ہے کہ بے التفاتی کی جگہ گرمجوشی سے پیش آئے۔ یہ جہاں چاہنے والے کے گلے کا ہار بننے کو تیار ہے ہر شخص کے قابو میں آنے والی چیز نہیں اس پاکیزہ دوشی کے ساتھ جدت یہ ہے کہ بوڑھی ہونے والی نہیں یعنی شراب کی طرح جتنی پرانی ہو با کیف ہوتی ہے۔ اسے بہار بے خزاں سمجھئے۔ اس سے زیادہ آپ کے جذبات کی رعایت کیا ہوگی۔

کل کی بات ہے مسلمان اپنے ادب (لٹریچر) کے سب سے زیادہ دلدادہ تھے۔
یہ جذبہ متوارث آپ نے کہاں کھویا۔ کیا یہ آپ کی عزت نفس پر حرف لانے والی بات نہیں کہ "انجمن ترقی اردو" اور "دار المصنفین" کی ٹکسالی (اسٹینڈرڈ) تصنیفات کی دو چار جلدیں بھی سال میں نہیں نکل سکتیں اور گرد خوردہ اوراق الماریوں کی چھاتی کا بوجھ رہتے ہیں دنیا کی تاریخ میں آپ کوئی قوم دکھا سکتے ہیں جس نے مانگے تانگے کی نہیں اپنی مادری زبان سے بے نیاز رہ کر کبھی ترقی کی ہو۔ ترقی تو خیر مجھے کہنا چاہیئے دنیا میں باقی رہی ہو ان نکات کو آپ مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں۔ ضرورت جو کچھ ہے یہ ہے کہ آنکھیں کھول کر دیکھئے۔ وقت کا فتویٰ کیا ہے۔ ضائعات کی تلافی گو آسان نہیں۔ لیکن تریاق غلط کاری کو آزما تو دیکھئے۔ اس گئی گذری حالت میں بھی اگر آپ دل پر رکھ لیں تو اپنی گذشتہ روایات کا زندہ کرنا بڑی بات نہیں۔

ذوق علمی شراب کا سا چسکا ہے کہ ایک دفعہ جہاں منہ لگی پھر نہیں چھوٹتی

میں آپ کے لئے اسے حلال کئے دیتا ہوں - خود شوق کیجئے اور اپنے اپنے حلقوں کے اثر میں اس مذاق کو چمکائیے صرف شرط یہ ہے کہ ایک کے ہو رہیئے - اور اس طرح اس مشغلہ کو چھوڑیئے کہ اخبار بھی کہہ اُٹھیں :—

خدا سر دے تو سودا دے تری زلف پریشاں کا
جو آنکھیں ہوں تو نظارہ ہوا ہے گلستاں کا

"خیام" کا "شبلی" ایڈیشن جب شائع ہوگا، ہوگا اس کے الفاظ یاد رکھیئے کہ زندگی آج اور صرف آج کا نام ہے -

"شبلی سوسائٹی" کے مقاصد کی باقاعدہ تفصیل اس کا نظام ترکیبی اور وہ جزئیات جن سے "خیام کلب" کی طرح ارکان سوسائٹی ادبی اخوت کی سلک رشیمی میں منسلک ہو سکیں "حیدر آباد کی بزم ادب کے لائق افراد کا موضوع آئندہ ہوگی

(معارف ۱۹۱۸ء)

حیدرآباد کی بزمِ ادب

پیارے ایڈیٹر! میں نے نہایت افسوس کے ساتھ ان مناقشات کو دیکھا، جس کا سلسلہ ایک عرصہ سے جاری ہے۔ اور مجھے خوف ہے کہ بعض نادان دوستوں کی وجہ سے ریاست کے اعزاز کو غیر ذمہ دار اشخاص کی لائق نفرت جنبش قلم سے نقصان پہنچیگا۔

آج کل بیرونی دنیا پر یہ اثر پڑ رہا ہے کہ اگر کسی نے وہاں کہہ دیا کہ "طائر شب رنگ" کان لے گیا تو ایک دم سے نگاہیں فضائے آسمان پر اٹھ جاتی ہیں۔ لیکن پاس کے پاس دست شوق اپنے اپنے کانوں کا جائزہ نہیں لیتے۔

مسٹر عبدالماجد پر جو لے دی رہی۔ وہ قطع نظر اس کے قومی بدنصیبی کی ایک نمایاں مثال ہے اس کا ایک رخ تاریک یہ بھی ہے کہ سوسائٹی کے اونچے طبقات کو علمی مذاق سے ایک حد تک ناآشنا ثابت کیا جائے۔ لگاؤ بجھاؤ کا اثر اسی وقت ہوتا ہے۔ جب سننے والے میں مادۂ اجتہادی کی کمی ہو۔ یعنی وہ تشکیل رائے پر قادر نہ ہو ورنہ ظاہر ہے کہ ایک یا چند آواز مخالف کوے کی کائیں کائیں سے زیادہ باوقعت نہیں ہے۔

ماجد صاحب کا سوا اس کے کچھ قصور نہیں کہ انھوں نے فلسفہ کی ایک شاخ یعنی "نفسیات" پر جو کچھ لکھا خالی الذہن ہو کر لکھا۔ بیشک ایک ایسی قوم میں جو مذہب سے علحدہ کر کے کسی چیز کے دیکھنے کی عادی نہ ہو یہ ایک نئی آواز تھی لیکن

لیکن بیسویں صدی میں بھی اگر عقلیات کو ہم خارجی متاثرات سے آزاد نہ کرسکے تو یہ ایسی ہی غلطی ہوگی جیسی خلفائے عباسیہ کے وقت میں مسلمانوں سے اس سے پہلے ہو چکی ہے۔

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ مسلمانوں نے اپنے عہد زریں میں بھی عقلیات پر خالص علمی حیثیت سے توجہ نہیں کی یا اس قدر کم توجہ کی کہ اس کا ہونا نہ ہونے کے برابر ہے۔ میں متکلمین کی جدت آمیز نکتہ آفرینیوں سے ناواقف نہیں ہوں لیکن جن عقائد و خیالات کی بنیاد پر تمام تر جذبات پر ہے ان کی تردید یا تائید دلائل عقلی سے کہاں تک ہو سکتی تھی جس طرح عقل ان کی تخلیق میں بے بس تھی اسی طرح ان کے کسی حصہ کو زائل نہیں کر سکتی تھی۔ یہ وہ نازک نکتہ ہے جو آج تک کسی کی سمجھ میں نہ آیا لحاف کے جھول کی طرح کچھ استر سے لیا اور کچھ ابرہ سے۔ اور دونوں کو کھینچ تان کر برابر سرابر کر دیا۔ مذہب اور فلسفہ کی تطبیق اسی اصول پر کم و بیش ہوتی رہی کہا جاتا ہے کہ مسلمان اپنے وقت میں عقلیات پر مٹے ہوئے تھے۔ لیکن تاریخ بتائے گی کہ مذہب کے مقابلہ میں ان کے لئے فلسفہ کا کیا درجہ تھا؟ برا نہ مانئے تو میں کہوں گا بس اتنا ہی جتنا لونڈی کا بیوی کے مقابلہ میں ہوا کرتا ہے۔ لونڈی بانکی ترچھی اور نئی نئی جو بن پر آئی ہوئی لیکن پھر بھی نوخیز تھی۔ بڑی بی کے چہرے کی جھریوں نے جو بیکار نہیں جا سکتی تھیں، قدامت کی بات رکھ لی اور لونڈی کو ہمیشہ دب کر رہنا پڑا۔ یہ نکتہ آرائی نہیں بلکہ واقعہ تاریخی ہے کہ علمائے اسلام نے مذہب سے علیحدہ ہو کر کبھی عقلیات پر نظر نہیں ڈالی یعنی وہ علم کے اس حصہ کو بیکار کہتے تھے جو کسی نہ کسی حیثیت سے کھینچ تان کر نقلیات قرآنی کے تحت میں نہ آ جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ فلسفہ کو نہ ہی تسلط سے کبھی آزاد نہ کر سکے اور جیسا کہ میرے ایک لائق دوست کا خیال ہے علم کلام کی بھول بھلیاں میں پھنس کر

رہ گئے۔ یہی وہ نکتہ ہے جسکی فرو گذاشت نے ہم کو فلسفہ سے حقیقی معنوں میں قطعاً محروم رکھا اور آج جبکہ زندگی کی کشمکش اور بقائے حیات کے لیے حکیات سے ہماری بیگانہ وشی خود کشی کا مرادف ہو رہی ہے۔ ہمارے ابتدائی اسباق پر کفر کا اطلاق ہوتا ہے کسی الحکمہ الکتاب کی طرف سے نہیں کسی مجمع العلماء کی طرف سے نہیں۔ یا دش بخیر! موجودہ "شیخ الاسلام دکن" کی طرف سے نہیں بلکہ ایک بازاری پریس کی طرف سے جس کا وجود ریاست کے لئے ریاست کے مختلف طبقات کے لیے بلکہ خود اس کے لئے باعث شرم ہے۔

کسی بات کا نہ جاننا چنداں لائق اعتراض نہیں لیکن یہ بھی جاننا کہ وہ نہیں جانتا ایسا جہل مرکب ہے جو کسی طرح لائق معافی نہیں۔ "فلسفہ اجتماع" کے مصنف نے کسی مذہبی موضوع پر قلم آزمائی نہیں کی ہے۔ بلکہ فلسفہ کی ایک شاخ یعنی علم النفس سے اردو لٹریچر کو پہلے پہل مانوس کیا ہے ایسا دقیق موضوع ہے جس پر خود یورپ میں باوصف عقلی ترقیات کے معلومات کا سرمایہ محدود ہے "ڈاکٹر لیبان" غالباً پہلا شخص ہے جس کی حکیمانہ موشگافیوں نے نفسیات کو ایک مستقل فن کی حیثیت سے جلوہ گر کیا۔ اور آئندہ میرا خیال ہے اس کی نقش آرائیاں جہاں تک انسان کے قوائے ذہنی کا تعلق ہے تاریخ انسانی کا رخ پھیر دیں گی۔

لیکن یہاں میں فلسفہ اجتماع پر تنقید کرنے نہیں بیٹھا ہوں! میری غرض صرف یہ ہے کہ اس میں مذہب اور پیشوایان مذہب کا جو کچھ ذکر آیا ہے وہ محض نفسیاتی حیثیت سے اور لائق مصنف نے دنیا کے بڑے بڑے آدمیوں کے ساتھ مختلف پہلوؤں سے بانیان مذہب کے مظاہر نفسی پر نظر ڈالی ہے جس سے ان کی دماغی فوقیت کے راز کی عقدہ کشائی منظور ہے۔ بہر حال اس کے لئے مجھ کو مصنف کی طرف سے معذرت (اپالوجی) کی

ضرورت نہیں کسی فلسفیانہ تصنیف میں اگر چشم سخن مذہب کی طرف بھی کچھ اشارے کرے تو دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اظہار خیال کے سلسلہ میں مذہب اور بانی مذہب کا ذکر جن الفاظ میں آیا ہے ان میں مستشرقانہ حیثیت سے کافی سنجیدگی اور ادب ملحوظ رکھا گیا ہے یا نہیں میری غرض ایسے لب ولہجہ سے ہے جو دنیا کے کسی مذہب کے لئے ناموزوں نہ ہو۔ اور جس میں مصنف کے ذاتی عقائد (خیالات) کی جھلک کا کوئی شائبہ نہ پایا جاتا ہو۔ مصنف کی طرف سے اس اصول کی خفیف سے خفیف خلاف ورزی، عام احساسات کے مقابلہ میں دراصل ایک متعلمانہ سبک ظرفی ہوگی اور میں یہ فیصلہ جہاں تک کتاب زیر بحث کا تعلق ہے اہل نظر پر چھوڑتا ہوں۔

اغیار دکن کو مایوسی ہوگی کہ گردن زدنی ماجد کی بریت میں گراں وزن علمائے ملک کو فتوے شائع کرنے پڑے۔ لیکن اگر آپ یہ فرمائیں کہ "ضمیر متکلم کے گلے پر چھری" تو میں اپنی مجتہدانہ رائے (اب بھی) پیش کرنا چاہتا ہوں: یعنی:—

"کوئی مسلم کسی حالت میں کافر ہو ہی نہیں سکتا"۔

اس خیال کی رفعت و وسعت دیکھئے۔ اغیار تنگ نظری کے ساتھ سطح خاک ہی پر رہے اور میں کہاں پہونچا۔ جہاں فرشتوں کے پر جلتے ہیں۔ تیرہ سو برس کے دفتر کا خلاصہ ایک فقرہ ذرا ماجد کے کفر کی شان دیکھئے گا:

آئیے میں آپ کو ایک زبردست کافر ادبی کا پتہ دیتا ہوں جو بہ لحاظ فن ماجد کا ہم ردیف ہے میری غرض پروفیسر "عیاری" سے ہے جو علوم قدیمہ کے ساتھ علوم عصریہ کا بھی عالم ہے اور اس قدر قابل قدر ہے کہ اگر قوم زندہ ہوتی تو "فلک نما" کے ایک گوشہ میں نہ سہی کسی زاویۂ علمی (اکیڈیمی) کی زینت بڑھا رہا ہوتا۔ اے میرے حسن ظن کی فراط

نہ سمجھے گا۔ میں ان کے معرکتہ الآرا تالیفات کو اس وقت پیش کرنا نہیں چاہتا۔ صرف ایک ادھ مضمون کو لیتا ہوں جو "تصورات کلیہ" اور "مادیت" پر انھوں نے لکھا ہے اور جو میرے خیال میں فتوحات ادب میں سرفہرست ہونے کے لائق ہے۔ یہ اس شخص کی رائے ہے جس کے دائرہ نظر سے اردو لٹریچر کا کوئی حصہ جو جاننے کے لائق ہے باہر نہیں ہے۔ یہ ایک فقرہ معترضہ تھا۔ مجھے سلسلۂ جان میں باوصف کوشش اختصار ابھی کچھ اور لکھنا ہے۔

اس طوفان بے تمیزی میں سب سے بڑی حق تلفی جو قوم کی ہو رہی تھی وہ انجمن ترقی اردو کے کارنامہ پر پانی پھیرنا تھا۔ مسلمانوں کی یہی ایک انجمن ہے جس سے اردو لٹریچر کی ترقی نہ سہی اس کی زندگی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ قوم کی عام بے التفاتی معلوم ہے سوسائٹی کے کسی طبقہ کو اپنی زبان سے عملی دلچسپی نہیں ہے۔ ایسی حالت میں مولوی عبدالحق مختلف موانع کے ساتھ جس طرح کام چلا رہے ہیں ان ہی کا ظرف ہے۔ اگر خدانخواستہ یہ سلسلہ بھی نہ رہا تو ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک سناٹا ہوگا اور تحرکات میں جب کوئی چیز باقی نہیں رہے گی تو کون کہہ سکتا ہے اس کے نتائج آئندہ کیا ہونگے مولوی عبدالحق اس لائق تھے کہ اگر علی گڑھ کی "مرکزیت" کا کوئی مفہوم ہوتا تو ہم خود ان کو ستانہ کرتے۔ یعنی یہ کہیں سے وقف اغیار ہونے کی چیز نہیں ہے۔ اردو کے جو کچھ وہ خدمات کر رہے ہیں ناانصافی ہوگی۔ اگر اس کا اعتراف نہ کیا جائے۔

میں نے ایک زمانہ میں ان کو نہایت سختی سے ٹوکا تھا۔ اور ایک یورپین مستشرق کے مشورے سے ان امور کی طرف ان کو توجہ دلائی تھی جو اردو کی ترکیب و ترویج کے مقدمات اساسی تھے مثلاً میرا خیال ہے کہ سب سے پہلے ایک اردو لغت کی ضرورت ہے اس سے میری غرض لغات المتعلم سے ہے یعنی مجید چیمبرس کا پیمانہ چاہتا ہوں ویبسٹر کا نہیں۔

"امیر اللغات" اور "فرہنگ آصفیہ" کی ناکامی کا راز یہی ہے کہ ایک دم سے بڑا پیمانہ اختیار کیا گیا
اسی طرح ہم کو لغات الاصطلاحات کی سخت ضرورت ہے۔ محاورات اور مترادفات کو بھی
علیحدہ علیحدہ اسی ذیل میں رکھئے جس طرح انگریزی کی تکمیل بغیر "لیٹن" اور "گریک" کے
نہیں ہو سکتی۔ اردو کے لئے عربی فارسی ناگزیر ہی ہیں۔ کم سے کم اردو کے اغراض کیلئے
ہم کو فارسی اور عربی لغات کو بھی نئے سر سے ترتیب دینا ہے۔ انجمن نے حال میں جس قدر
ترجمے شائع کئے ہیں ان میں "تاریخ اخلاق یورپ" ایک قیمتی اضافہ ہے تاہم وہ اپنی
ادبی تبلیغ میں قاصر رہے گی۔ اگر تدوین لغات کے بار گراں سے سبکدوش نہ ہو سکی۔
میں دار المصنفین کو اس سلسلہ سے علیحدہ رکھنا چاہتا ہوں جو اپنے مختص النوع
عالمانہ مشاغل کے لحاظ سے "خاصہ کی چیز" (کلاسیکل) ہے اس کا تخیل اس قدر اونچا
ہے کہ میں نہیں جانتا کہ بحیثیت موجودہ قوم کا دماغی افق کہاں تک اس کا ساتھ دے سکے
گا لیکن جس سطح فائقہ پر وہ لٹریچر کو لانا چاہتا ہے اس کا اقتضائے اضطراری یہ ہے کہ
مذاق عام کی رعایت سے کوئی دوم درجہ کی حرکت نہ کی جائے۔ تاریخ الاسلام، قصص
الاسلام، لغات الاسلام، ادب العرب، شعر العرب، ادب الہند، شعر الہند، دائرۃ
المعارف (اردو انسائیکلو پیڈیا) اور جانے کیا کیا "یک مرد، ہزار سودا" بہتیری چیزیں
ہیں جن کو آج ملک میں رفقائے دار المصنفین کے سوا کون ہاتھ لگا سکتا ہے متوکلین ادب
دل و دماغ صرف کر سکتے ہیں۔ لیکن ضرورت ہے "الہ دین چراغ زر پاش" کی حیدر
آباد یا بھوپال کے جواہر خانوں میں نہ سہی قوم کا کوئی گھر اس سے خالی نہیں! یہ خواب
پورا ہو یا نہ ہو مگر حصول آرزو کی حسرت بھی لذت سے خالی نہیں یہ کیا کم ہے کہ ذکر تو آگیا
آخر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ انجمن اردو کے خواب شیریں کی سب سے بڑی تعبیر

"عثمانیہ یونیورسٹی" ہو سکتی ہے۔ یہی یونیورسٹی اگر قاعدے سے چل نکلی تو آئندہ مسلمانوں کا پیمانۂ تقدیر ہوگی۔ انجمن اور دارالتراجم اسی یونیورسٹی کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ایک طرف حیدرآباد کا جامعہ مشرقی مسلمانوں کا بڑے سے بڑا تخیل ہے جس کی اس دنیا میں ان کو امید ہو سکتی ہے۔ دوسری طرف ان منتخب افراد کی (جو یونیورسٹی کے ارکان اساسی ہیں۔ اور جنہوں نے اپنی زندگیاں ایک شریفانہ مشغلہ کے لئے وقف کر رکھی ہیں) دل شکنی اور تذلیل بے سبب کے لئے اغیار کی پوری قوت صرف ہوتی رہی۔

آج ایک معمولی مہمان بھی آجاتا ہے تو اخلاق و شائستگی کا اقتضا یہ ہے کہ اس سے اچھی طرح پیش آئے۔ قوم کے ہونہار بچے جن کے بچپن کی لوریاں حیدرآباد کے حوصلہ افزا روایات رہے ہیں اور جن کے لئے دولت آصفیہ " خواب طفلی اور آرزوئے شباب" کی حیثیت رکھتی ہے کس قدر مایوس کن اثرات میں گھرے ہوئے ہیں۔ مشرقی اخلاق اور اس کے عوائد رسمیہ کا اقتضا تو کچھ اور تھا، خاص کر جب دارالتراجم کے افراد شاہی مہمان کی حیثیت رکھتے ہوں۔

شرر اور ظفر علی خاں گویا گھڑی سوار گئے اور واپس آئے۔ آج کل کے دور حریت میں فرمانروائے وقت کی مرضی کے خلاف کوئی خارجی مخالفت ایک غیر آئینی حرکت تھی۔ جس پر "جو مشتے کہ بعد از جنگ" کی طرح کف افسوس ملنا ہے۔

کل کی بات ہے علامہ نذیر احمد۔ حالی و شبلی دربار آصفیہ کے وظیفہ خوار تھے، لیکن کبھی ان کی متفقہ قوت سے کام نہیں لیا گیا۔ ورنہ آج کم سے کم "قاموس الاسلام" کی ضخیم جلدوں کے لئے ہماری نگاہیں یورپ کی طرف نہ اٹھتیں۔

اس فروگذاشت کی تلافی تو اب ہو چکی ہے۔ لیکن موجودہ وسائل سے بھی بہت کچھ کام لیا جا سکتا ہے بشرطیکہ کام لینے والوں میں سلیقہ ہو۔ اور انجمن اور دارالتراجم کے اعزاز نفس کے خلاف کسی کو غیر ضروری جنبش لب کا موقعہ نہ دیا جائے۔ بہ حفظ مراتب دونوں نظامات ادب (انسٹیٹیوشن) کی وفاداری کی بہترین ضمانت ہوگا۔ اور دنیا آگے چل کر دیکھ لے گی کہ "عثمانیہ یونیورسٹی" جو شہرت کے اعتبار سے آج بچہ بچہ کی زبان "صحیفۂ دکن" کے گھر کا گھروندا نہیں ہے کہ بنتا اور بگڑتا رہتا ہے۔ یہاں سید راس مسعود کی نسبت کچھ لکھنا نہیں چاہتا۔ ان کا درجہ اس سے بہت ارفع ہے کہ دوم درجہ کی خلقت ان کے مقابلہ میں مخاطب کیا جائے۔ اس لئے اغیار کے خیالات و مقالات کا نظر انداز کرنا ان کے لائق ادب جد امجد کی سنت کی پیروی ہوگی۔ علی گڈھ کے گہوارہ ادب کا آغوش شفقت ان کے لئے ہمیشہ کھلا ہوا ہے جہاں وہ اونچے سے اونچے پیمانہ پر مشغلہ علمی جاری رکھ سکتے ہیں جس کے وہ بالطبع شائق ہیں۔

(مشرق۔ ۱۹۱۸ء)

حالیؔ و شبلیؔ کی معاصرانہ چشمک

جدت موضوع چاہتی تھی کہ جہاں تک ہماری آخری بزم کا تعلق ہے اس لپیٹ میں کوئی چھوٹنے نہ پائے لیکن افسوس ہے کہ مواد ترکیبی کی کمی نے زیادہ پھیلنے کا موقع نہ دیا اور "چشمک" کا دائرہ اطلاقی خالص حالی و شبلی کی شوخی قلم سے آگے نہیں بڑھتا لیکن میں ضمناً اوروں کا انداز طبیعت (کیرکٹر) بھی دکھاؤں گا۔ اور بکھرے ہوئے موتیوں کو جہاں جہاں سے ہاتھ آئیں گے سلسلہ بیان میں پروتا جاؤں گا۔

سرسید کی "بزم ادب" بچے کھچے پرانے لائق پرستش بزرگوں کا گویا نچوڑ تھی لیکن جس طرح خیمہ کے ساتھ طنابیں اکھڑ جاتی ہیں ان کے رفقا بھی ایک ایک کرکے آگے پیچھے ہم سے رخصت ہوتے گئے۔ ان کی نکتہ سنجیاں اور روشن خیال بوڑھے غمزدے اور لطائف و ظرائف قدیم اسلامی سوسائٹی کے تبرکات تھے جن سے ہمیشہ کے لئے ہاتھ دھو بیٹھے اور اب ان اصحاب کی تعداد بھی کم رہی ہے جنہوں نے جا جایا نقشہ پچھلے پہر کا خواب اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

ان میں سے ہر فرد اپنے دائرہ کا مالک تھا اور مستقل ہستی رکھتا تھا۔ آج "وقار الملک" اور "محسن الملک" کی یادگار میں چند سطریں بھی کوئی لکھنے والا نظر نہیں آتا اور "رجال العصر" کے سلسلہ میں ان کی ضمنی کیفیت ان کا بہترین حق ہے جو ہمارے ہاتھوں ان کو مل سکتا ہے۔ میں ان دونوں لائق افراد کی زندگی کا وہ رخ دکھانا نہیں چاہتا جس کے لحاظ سے

کبھی یہ سالار جنگ اعظم کے نفس ناطقہ بنے ہوئے تھے۔ محسن الملک کے اس کارنامہ کو یاد دلانا چاہتا ہوں، جب ان کے قیام لندن میں وزیر انگلستان کو اعتراف کرنا پڑا کہ ہندوستان میں اتنا بڑا اعالی دماغ موجود ہے اسی طرح دونوں صاحبوں کی سیاسی اور قومی خدمات بھی میرے موضوع کے لئے حیثیت اضافی رکھتے ہیں لیکن یہ بات بھولنے کے لائق نہیں ہے کہ جہاں تک سرسید کی ادبی تبلیغ کا تعلق ہے یہ دونوں گویا ان کے دست و بازو تھے۔ سر سید کے ساتھ محسن الملک کی نوک جھونک ادبی راز و نیاز جس کا ایک خاکہ مراسلات دلچسپ میں دکھایا گیا ہے اور جس کے عالمانہ اور سخن گسترانہ شواہد "مرحوم تہذیب الاخلاق" کے سیزدہ سالہ فائل میں بکثرت ملیں گے فتوحات ادب کا بہترین سرمایہ ہیں جن پر مستقلاً اظہار خیال کی ضرورت ہے۔ میرے موضوع کے صفحات محدود میں ان کے پھیلانے کی گنجائش نہیں۔ یہاں صرف چشم سخن کے اشارہ پر قناعت کرنی ہوگی۔

بہرحال کس کس کو یاد کروں محسن الملک۔ وقار الملک، چراغ علی، ذکاء اللہ نذیر احمد، حالی و شبلی وغیرہ وغیرہ سبھی سجائی محفل تھی جو دیکھتے دیکھتے درہم برہم ہوگئی۔ "سرسید کی بزم ادب" ایسا وسیع موضوع ہے کہ اگر مولوی وحید الدین سلیم نے اپنی عمر ضائع نہ کی ہوتی اور سرسید اور ان کے رفقاء کے ساتھ جو وابستگی انکو رہی ہے اور جس کے آثار "معارف" کے نقش اولی میں بافراط موجود ہیں۔ وہ افسانہ یاران کہن کی حیثیت سے ایک ضخیم الاوراق اور نہایت دلچسپ کتاب تیار کر سکتے تھے اگر یہ صحیح ہے کہ کسی شخص کی اخلاقی فوقیت کا راز دراصل اس کی پاکیزہ سوسائٹی میں مضمر ہوتا ہے تو "سیر الصحابہ" کی طرح علی گڈھ کی یہ آخری بزم ادب ہمارے لئے وقت کی چیز اور

نتیجہ خیز رہتی۔

خیر! ان تصریحات کے بعد اصل موضوع کی طرف لوٹیے۔ سرسید نے ہمیشہ معاصرین ادب کی حوصلہ افزائی کی۔ ان کی با اثر شخصیت خاموش تصرف کے ساتھ دوسروں کی قلب ماہیت کرتی رہتی تھی۔ شبلی نے "مولویت" علی گڑھ میں پہنچ کر چھوڑی ان کے خیالات کی کایا پلٹ، مذاق تصنیف اور وسیع النظری غرض یہ جو کچھ ہوئے سرسید کے دامن تربیت کا اثر تھا۔ شبلی نے المامون کا دوسرا ایڈیشن جب شائع کیا ہے تو سرسید نے جس خلوص کے ساتھ اس پر دیباچہ لکھا وہ آج بھی ان کی شرافت ادبی کا پتہ دیتا ہے۔ اسی طرح حالی کی نیچرل شاعری خیالات کے لحاظ سے سرسید کے فیض صحبت کی ممنون ہے ابھی یہ فیصلہ باقی ہے کہ حالی کی روش جدید نے پروفیسر آزاد کی ڈالی ہوئی داغ بیل یعنی ان کے نتائج فکر سے کہاں تک فائدہ اٹھایا۔ جن کو تاریخی حیثیت سے کم سے کم اولیت کا شرف حاصل ہے مختصر یہ کہ متاخرین ادب کے ساتھ سرسید کا درجہ مشاسبہ صرف مربیانہ تھا۔ اس لئے ایسی ایسی باوقار ہستی سے چشمک تو غیر اس کی کثرات بھی مشکل ہاتھ آئیں گی۔

پروفیسر آزاد اس قدر بلند خیال اور استادانہ دل و دماغ رکھتے تھے کہ ان کے ہاں بھی جہاں تک معاصرین کا تعلق ہے "چشمک" کا گزر نہیں۔ ایک واقعہ دلچسپ اہل ذوق کی ضیافت طبع کے لئے لکھتا ہوں۔ لاہور میں پہلی دفعہ جب ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ ہوا تو پروفیسر آزاد زندہ تھے۔ گو دماغ کسی حد تک متاثر ہو چکا تھا۔ نذیر احمد ملنے کے لئے گئے۔ حالی اور غالباً شبلی بھی ساتھ تھے۔ نذیر احمد کا لکھا ہوا رسالہ جو چھپا ہوا ان کے ہاتھ میں تھا۔ آزاد رسالہ کی طرف متوجہ ہوئے تو نذیر احمد نے یہ کہہ کر آگے بڑھا دیا

کہ ایک نظر دیکھ لیجئے۔ کانفرنس میں پیش کرنا ہے۔ آزاد فوراً قلم سنبھال کر بیٹھ گئے اور کانٹ چھانٹ شروع کردی۔ نذیر احمد آزاد کی اس بے تکلفی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ جوش محبت سے آنکھیں نم ہوگئیں۔ ان کو قدرتی طور پر یہ خیال آیا کہ ابھی ان کے دائرہ میں ایک شخص ایسا موجود ہے جو ایک "بوڑھے بچہ" کی مشق سخن پر نظر ثانی کرسکتا ہے۔

حالی بھی آزاد کی استادی کا لوہا مانتے تھے۔ ان کی مخلصانہ عقیدت کیشی کے لئے وہ تقریظ و تنقید دیکھئے جو "آب حیات" اور "نیرنگ خیال" پر حالی نے لکھی ہے اور جس میں ضمناً یہ طے کردیا ہے کہ نیچرل شاعری دراصل آزاد کی صنعت فکر کا نقش اولین اور ان کی اولیات میں محسوب ہونے کے لائق ہے۔ حالی لکھتے ہیں:۔

”نظم و نثر میں بہت کچھ لکھا گیا اور لکھا جا رہا ہے۔ یعنی لٹریچر کے رقبہ کا طول و عرض بڑھ گیا لیکن اس کا ارتفاع جہاں تھا وہیں رہا یعنی اخلاقی سطح بہت اونچی نہیں ہوئی لیکن آزاد کی پاکیزہ خیالی اور خوش بیانی نے یہ کمی پوری کردی "نیرنگ خیال" کی بہت کچھ داد دی ہے کیونکہ آزاد کے قلم نے پہلے پہل جذبات انسانی کی تجسیم و تشخیص کی۔ اور معقولات کی تصویریں محسوسات کی شکلوں میں کھینچی ہیں اور خصائل انسانی کے نظری خواص ایسے موثر اور دلکش پیرایہ میں بیان کئے ہیں جن سے اردو لٹریچر اب تک خالی تھا“

شبلی بھی آزاد کا ادب کرتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے آزاد اردوئے معلی کا ہیرو ہے اس کو کسی سہارے کی ضرورت نہیں وہ اصلی معنوں میں ایک زبردست انشا پرداز ہے۔ تاہم ایک ہلکی سی چشمک دیکھئے!

”ہندوستان کے سب سے بڑے انشا پرداز نے نیرنگ خیال میں جہانگیر کی یہ تصویر کھینچی ہے“ اس کے بعد ایک۔ اور بادشاہ آیا جو اپنی وضع سے ہندو راجہ معلوم ہوتا تھا

وہ خود نشہ میں چور تھا۔ ایک عورت صاحب جمال (نورجہاں) اس کا ہاتھ پکڑے آتی
تھی۔ اور جدھر چاہتی تھی پھراتی تھی۔ وہ جو کچھ دیکھتا اس کے نور جمال سے دیکھتا تھا
اور جو کچھ کہتا تھا اس کی زبان سے کہتا تھا۔ اس پر ہاتھ میں ایک فرد کاغذ کا تھا
اور کان پر قلم دھرا تھا۔ یہ سوانگ دیکھ کر سب مسکرائے مگر چونکہ دولت اس کے
ساتھ ساتھ تھی اور اقبال آگے آگے اہتمام کرتا آتا تھا اس لئے بدمستی میں ہنسی ہوتا جب
نشہ سے آنکھیں کھلتی تھیں تو کچھ لکھ بھی لیتا تھا۔

"تزک جہانگیری" کے ریویو میں شبلی فرماتے ہیں "آؤ دیکھیں اس جھوٹ میں کچھ
سچ بھی ہے؟ ہمارے انشاپرداز نے جہانگیر سے کبھی کبھی ہوش میں تصنیف کا کارنامہ
بتایا ہے وہ اس کتاب "تزک جہانگیری" ہے۔ اس کے بعد شبلی نے جو کچھ لکھا
ہے ناقدانہ اور سخن گسترانہ ہے" یعنی بے ضرر چشمک کی ایک خوبصورت مثال ہے
جو عنوان زیر بحث کے تحت میں آسکتی ہے۔

"شعر العجم" جب زمانہ میں لکھی جا رہی تھی میں نے شبلی کو توجہ دلائی کہ آزاد کی
تالیف موعود پر نگاہ رکھئے گا۔ جو موضوع مشترک پر نکلنے والی ہے وہ مجھے میرا مطلب
"سخندان فارس" سے ہے ایک دوست کو لکھتے ہیں۔

"آزاد کا سخندان فارس حصہ دوم نکلا۔ سبحان اللہ! لیکن الحمد للہ میرے
شعر العجم کو ہاتھ نہیں لگایا ہے"۔

مجھے تحریر فرماتے ہیں، "آزاد کی کتاب آئی، جانتا تھا کہ وہ تحقیق کے میدان کا مرد
نہیں، تاہم ادھر ادھر کی گپیں بھی ہانکتا۔ یہ تو وحی معلوم ہوتی لیکن خدا کا شکر ہے کہ گیارہ
نمبر تک اس نے میری سرحد میں قدم نہیں رکھا۔ بارھویں میں یہ میدان میں اترا ہے لیکن

زور پہلے صرف ہو چکا تھا، پرہی سرسری چکر لگا کر نکل گیا۔"

میں نے لکھا "میری غرض سخندان فارس سے نہیں ہے۔ بلکہ آزاد کے تذکرہ شعراسے تھی" اس پر تحریر فرماتے ہیں "میں آزاد کی طرف سے بالکل مطمئن ہو گیا تھا۔ لیکن آپ نے پھر ڈرا دیا۔ مجھ کو پہلے سے معلوم ہوتا تو اس مضمون پر ہاتھ نہ ڈالتا۔ یہ جزئیات جو دکھا رہا ہوں خارج از موضوع نہیں ہیں۔ ان سے یہ پتہ چلے گا کہ شطرنج کی اصطلاح میں لبادا ادب کے یہ شاطر مہرے آپس میں کس طرح گتھے ہوئے تھے

"نذیر احمد" بھی تنقیص پسند نہیں تھے ان کی لے دے زیادہ تر سرسید پر رہتی تھی۔ لیکن اس طرح کہ

"وہ کہیں، اور سنا کرے کوئی"

خلوص تھا کہ حرف حرف سے ٹپکا پڑتا تھا۔ طبیعت میں منقولانہ رنگ غالب تھا۔ اس لئے شروع شروع سرسید کے اجتہادات سے ان کو جھجک سی تھی۔ جو رفتہ رفتہ گئی اور اس طرح گئی کہ سرسید کے عقیدت کیشان باصفا میں یہ کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ اور اس پر فخر کرتے تھے۔ یہ فراخدلی جس کے شواہدان کے لٹریچر میں کثرت سے نظر آئیں گے سرسید تک محدود نہ تھی۔ اور وں کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔ ایک آدھ واقعہ استشہاداً سنیئے۔

علی گڑھ کے اسٹریچی ہال میں کانفرنس کی مقتدر جماعت کا اجلاس ہے اطراف ملک سے پڑھے لکھے اور ذی وقار لوگ آ آ کر جمع ہوئے ہیں۔ خطیبانہ بلند آہنگی کے سلسلے میں ایک آدھ ذیول کو یا ہوتی ہے۔ "میں نے کسی زمانہ میں عربی اچھی پڑھی تھی۔ اب تو ایسا ذہول ہو گیا کہ "مولوی شبلی" ایک صیغہ پوچھ بیٹھیں تو بغلیں جھانکنی پڑیں" ان نظر دل کا

نکلتا تھا کہ اس زمانہ کے مولوی شبلی جو نئے نئے علی گڈھ آئے تھے۔ ہزاروں نگاہوں کے نقطۂ شامی بنے ہوئے تھے۔ اور یہ ان کی قابلیت کا پہلا اعتراف تھا جس کا اثر بجلی کی طرح ہال کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوڑ گیا۔

اسی طرح نذیر احمد لکچر سے پہلے کبھی کبھی اپنی نظم سنایا کرتے تھے ایک موقع پر فرماتے ہیں۔

"جس طرح یحییٰ پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی منادی کرتے تھے کہ میرے بعد مجھ سے ایک بہت بڑا پیغمبر آنے والا ہے اسی طرح میری نظم گویا ندائے عام ہے میرے بعد مولوی الطاف حسین حالی اپنی نظم پڑھیں گے۔ اور میں اپنے پندار میں ان کی نظم کی رونق کا باعث ہوتا ہوں" اخلاقاً ایک ہم عصر کی شاعرانہ برتری کے اعتراف کا یہ کتنا بلیغ اور خوبصورت پیرایہ ہے

اب میں نفس مطلب سے قریب ہوتا جاتا ہوں۔ یہاں تک صرف بیانات اضافی تھے۔ اصلی کام حالی و شبلی کو باہم ٹکرانا ہے لیکن ترتیباً پہلے یہ دیکھئے کہ حالی نے شبلی کی نسبت جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس میں چشمک کا کوئی عنصر موجود ہے یا نہیں؟ "معارف" میں نامہ حالی و شبلی کا سلسلہ کچھ عرصہ سے جاری ہے ان خطوں میں حالی و شبلی کو جس خلوص اور حسن اشتیاق سے یاد کرتے ہیں ان کی ایک ایک تصنیف کا جس شوق و ذوق سے نام گناتے ہیں وہ بھی اس آرزو کے ساتھ کہ کوئی کتاب ان کی لائبریری کے آغوش میں جگہ پانے سے رہ نہ جائے۔ اخلاص کی آخری حد ہے خط دیر میں ملتا ہے تو کہتے ہیں "اس قدر مدت کے بعد عنایت نامہ کے ورود نے میری آنکھوں کے ساتھ وہی کیا جو پیراہن یوسف نے چشم یعقوب کے ساتھ کیا تھا"۔ جس خط کو دیکھئے وردِ

محبت اور ایک خاص طرح کی صدق مقالی جو بڑے بوڑھوں کا حصہ ہوتی ہے، لفظ لفظ سے ٹپکتی ہے۔ شبلی کے پاؤں کا واقعہ پیش آتا ہے تو گھبرا کر ان کے فرزند رشید یعنی "حامد شبلی" سے خیر و عافیت دریافت کرتے ہیں اور باوصف اس کے کہ آنکھ نے جواب دیدیا ہے قویٰ میں باقتضائے سن عام اضمحلال ہے پھر بھی اعظم گڈھ کے سفر کی آمادگی ظاہر کرتے ہیں یہاں تک کہ "الندوہ" میں شبلی کے احباب کی رباعیات دیکھ کر حالی کو خیال آتا ہے کہ وہ مولینا (شبلی) کے زمرۂ احباب میں ہونے کا فخر حاصل کریں۔ اس لئے ایک رباعی موزوں کر کے بھیجتے ہیں۔ کہ "الندوہ" کے کسی آیندہ نمبر میں اسے بھی جگہ دیدی جائے گا۔

"سیرۃ النعمان" جب شائع ہوئی تو حالی نے اس پر ریویو لکھا۔ فرماتے ہیں "انھوں نے (یعنی شبلی نے) اپنی ہر ایک پہلی تصنیف میں جس بلندی پر آپ کو دکھایا ہے اس کے بعد کی تصنیف میں ان کی لیاقت اور روشن دماغی اس سے بلند تر منظر پر جلوہ گر ہوتی ہے۔ اور جہاں تک میری نگاہ پہنچی ہے "سیرۃ النعمان" کو ان سب سے اعلیٰ منظر پر پاتا ہوں" کتاب کی ترتیب، اصول استنباط، اور طرز اجتہاد کے لحاظ سے شبلی کو حالی نے فاضل ادیب، محقق اور اگر منظور کریں تو منشی اور شاعر کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور دکھایا ہے کہ جس طرح حسن تناسب اعضا کا نام ہے سیرۃ النعمان میں روایت و درایت کی تطبیق اور جس موزوں طریقہ پر رائے اور قیاس سے کام لیا گیا ہے اس طریقہ استدلال سے فلسفۂ مذہب کی بنیاد قائم ہوتی ہے اور مصنف (یعنی شبلی) نے اپنی فضیلت اور لیاقت پر سے بہت سے پردے اٹھا دیئے ہیں۔"

شبلی "دستۂ گل" ہدیتہً بھیجتے ہیں تو حالی جواباً لکھتے ہیں:-

"کوئی کیونکر مان سکتا ہے کہ یہ اس شخص کا کلام ہے جس نے سیرۃ النعمان، الفاروق اور سوانح مولانا روم جیسی مقدس کتابیں لکھی ہیں۔ غزلیں کیا ہے گویا شراب دو آتشہ ہے جس کے نشہ میں خمار چشم ساقی بھی ملا ہوا ہے۔ غزلیات حافظ کا جو حصہ محض رندی اور بے باکی کے مضامین پر مشتمل ہے ممکن ہے کہ اس کے الفاظ میں زیادہ دلربائی ہو مگر خیالات کے لحاظ سے تو یہ غزلیں اس سے بہت زیادہ گرم ہیں۔

آپ کہیں گے کہ ان مسلسل انکشافات میں سوائے بہکی ہوئی باتوں کے مقصود اصلی یعنی "چشمک" کا اب بھی پتہ نہیں۔ لیکن میں عرض کر چکا ہوں کہ میں اصلی نکتہ سے قریب تر ہوتا جاتا ہوں۔ اصولاً اخلاق کے ساتھ تھوڑی سی کج ادائی بھی ہو تو زیادہ اجاگر ہوتی ہے جو آنکھیں روشنی کی عادی ہوتی ہیں ان کو تاریکی گراں گزرتی ہے اسی طرح نفس انسانی کا رخ روشن اس کے دوسرے رخ کو زیادہ نمایاں کر دیتا ہے اس لئے میری اضافی تشریحات بیکار نہیں ہیں۔ بہرحال اظہار خلوص کی حد ہو چکی۔ کچھ اصل موضوع یعنی چشمک کی مثالیں لیجئے۔

"حیات جاوید" میں ایک موقعہ پر حالی فرماتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کی حمایت کے جوش میں "سرسید" کے قلم سے بعض مواقع پر ایسے الفاظ نکل گئے ہیں کہ ترجموں کی غرض سے سوسائٹی قائم کرنے کو وہ اپنی غلطی تسلیم کرتے تھے۔ اور اسی بنا پر شمس العلماء مولانا شبلی نے مسلمانوں کو گزشتہ تعلیم میں اس غلطی کا جس کو سرسید ۶-۷ برس پہلے ایجوکیشن کمیشن میں تسلیم کر چکے تھے ذکر کیا ہے اور اس بنا پر کہ مغربی علوم و فنون کا دیسی زبان میں ترجمہ ہونا ممکن نہیں ہے۔ سائنٹفک سوسائٹی قائم کرنے کو سرسید کی ایک غلطی قرار دیا ہے اور اپنے اس دعویٰ پر کہ ترجمہ ممکن نہیں زیادہ تر وہی دلیلیں جو خود سرسید نے بعض مواقع

پر بیان کی تھیں پیش کی ہیں"۔

حالی کہتے ہیں کہ اگر مولینا (یعنی شبلی) کی یہ اصلی رائے ہوتی تو ہم کو اس سے تعرض کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن چونکہ انھوں نے خود سرسید کے بعض بیانات سے یہ رائے استنباط کی ہے اس لئے ہم کو سرسید کے خیالات کا اصل منشا ظاہر کرنا ہے۔ حالی نے ایک ایک کرکے اعتراضات کی تردید کی ہے اور نہایت تفصیل کے ساتھ دکھایا ہے کہ شبلی کے اعتراضات[۱] کا زیادہ تر حصہ خود سرسید کے خیالات سے ماخوذ ہے" چشمک کی یہ پہلی مثال ہے جس میں حالی کی حیثیت نسبتی اقدامی نہیں بلکہ دفاعی ہے اور جس میں ناقدانہ اظہار خیال کے سوا درپردہ کوئی چوٹ نہیں ہے

یہاں تک تو آپ نے دیکھا کہ حالی و شبلی کے ساتھ کیا رنگ تھا' لیکن یہ شراب تیز ہوا چاہتی ہے اب یہ دیکھئے کہ شبلی کے خیالات و مقالات کا جہاں تک خوش صفات حالی کا تعلق ہے کیا حال ہے۔ شبلی نے ابھی "المامون" نہیں لکھی ہے یا لکھی ہے لیکن لکھنے سے پہلے حیات سعدی پیش نظر ہے ایک عزیز کو لکھتے ہیں" ایک کتاب حال میں مولوی حالی صاحب نے لکھی ہے اور مجھ کو تحفہ بھیجی ہے" شیخ سعدی کی نہایت دلچسپ محققانہ سوانحعمری ہے میں نے بے اختیار اس کو تمہارے لئے پسند کیا۔ اور مولوی حالی صاحب کو لکھ دیا ہے کہ وہ تمہارے نام بھیج دیں۔ واقعی بے مثل ہے اور تم کو اپنے پاس رکھنا نہایت ضروری ہے لیکن یہ دیکھنا ہے کہ شبلی صاحب خود تصنیفات کے مالک ہوئے تو حالی کے ساتھ یہ حسن ظن کہاں تک قائم رہا؟

---

[۱] جس مضمون کا حوالہ حالی نے دیا ہے رسائل شبلی کے طبع جدید میں اسکے دو ٹکڑے ہو گئے ہیں یعنی قدیم تعلیم اور تراجم جدید معلومات کے اضافہ کے ساتھ وہ حصہ نکال ڈالا گیا ہے جس میں سرسید پر کچھ اعتراضات تھے۔

"سوانح مولانا روم" میں شبلی یوں اظہار خیال کرتے ہیں۔ تمام اہل تذکرہ متفق ہیں کہ جن لوگوں نے غزل کو غزل بنایا وہ "سعدی" "عراقی" اور مولینا "روم" ہیں اس لحاظ سے مولینا کے دیوان پر ریویو کرتے ہوئے ہمارا فرض تھا کہ سعدی اور عراقی سے ان کا موازنہ کیا جاتا تینوں بزرگوں کے نمونے دکھائے جاتے۔ اور ہر ایک کی خصوصیات بیان کی جاتیں اور چونکہ مولینا ہمارے پیر ہیں اس لئے مذاق حالی کے موافق خواہ مخواہ بھی ان کو ترجیح دی جاتی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسا کرنا واقعہ نگاری کے فرائض کے بالکل خلاف ہے۔"

اگر تھوڑی دیر کے لئے بھی یہ مان لیا جائے کہ شبلی کا روئے سخن "حیات سعدی" یا "یادگار غالب" کی طرف ہے۔ تو "چشمک" کی یہ نہایت ہی چبھتی ہوئی مثال ہوگی جو ناظرین کے سامنے پیش کی جاسکتی ہے لیکن ایک نکتہ سنج پوچھ سکتا ہے کہ کیا یہی طریقہ نمایاں طور پر "موازنۂ انیس و دبیر" میں ایک کافی حد تک "شعر العجم" میں اختیار نہیں کیا گیا۔ "کلیات خسرو" جس کی تہذیب و ترتیب بزعم ملی گڑھ آج کل کے سرکہ ادب میں پیش پیش ہے۔ اور جس میں تنقید کے سلسلہ میں معاصرانہ کلام کا موازنہ کیا گیا ہے کہاں تک واقعہ نگاری کے "مذاق حالی" سے بے نیازی کا دعویٰ کر سکتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آیا حالی اس نکتہ کے سمجھنے سے قاصر تھے؟

"چشمک" کی دوسری مثال لیجئے۔

"تذکرۂ گلشن ہند" کے حاشیہ میں شبلی لکھتے ہیں۔ مولوی حالی صاحب نے اپنے دیوان کے مقدمہ میں لکھنؤ کی شاعری میں صرف نواب مرزا شوق کی مثنویوں کا اعتراف کیا ہے لیکن چونکہ ان کے نزدیک شعرائے لکھنؤ سے ایسی فصاحت اور سلاست کی توقع نہیں ہو سکتی اس لئے اس کی وجہ یہ قرار دی کہ نواب مرزا نے خواجہ "اثر" کی مثنوی دیکھی تھی۔

اور اس کا طرز اٹھایا تھا۔ یہ اشعار مثنوی کے ہیں۔ اس کا فیصلہ خود ناظرین کر سکتے ہیں۔
کہ یہ مثنوی نواب مرزا کا ماخذ اور نمونہ ہو سکتی ہے"

اسی طرح جیسا کہ دیباچہ "گلزار نسیم" کے حاشیہ ذیل میں تصریح کی گئی ہے شبلی نے
لائق "چکبست" کو لکھا تھا کہ گلزار نسیم کی تنقید میں مولینا حالی نے سخت بے رحمی اور نا انصافی
سے کام لیا ہے"۔

پس اس کے متعلق خود کچھ لکھنا نہیں چاہتا۔ مولوی عبدالحق کے ذمہ دار قلم سے ٹپکی
ہوئی بیا ہی جس طرح پھیلی ہے ایک نظر دیکھنے کے لائق ہے جس طرح ناممکن ہے کہ کسی
ٹکسالی (اسٹینڈرڈ) کتاب پر ان کا مقدمہ نہ ہو۔ یہ بھی ناممکن ہے کہ کسی نہ کسی حیثیت سے
حالی کی پاسداری میں یہ شبلی پر چوٹ نہ کرتے ہوں۔ یعنی "چشمک" کے جراثیم ان کے مقدمات
میں اس کثرت سے ملیں گے کہ یہ امران کے لٹریچر کے خصائص کا ایک جزو ہو گیا ہے پس
یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ موقع کی تاک میں رہتے ہیں اور اظہار خیال سے کبھی نہیں چوکتے
لیکن میں اگر غلطی نہیں کرتا تو یہ جو کچھ لکھتے ہیں نکتہ سنجانہ لکھتے ہیں یعنی شبلی کی تنقیص مقصود
بالذات نہیں ہوتی۔

یہاں تک تو چشمک کی طرف نرم مثالیں تھیں یعنی تلخ گولیاں غلاف شکر ہیں۔
اب ذرا قوی تر شواہد لیجئے۔ مناقب عمر بن عبدالعزیز کے ریویو کے سلسلہ میں شبلی
فرماتے ہیں۔

"سوانح نویسی کے فرائض میں سے جو بڑا فرض مصنف سے رہ گیا وہ تنقید ہے
یعنی مصنف نے اپنے ہیرو کی خوبیاں دکھائی ہیں اس کے کسی قول و فعل پر نکتہ چینی نہیں کی،
لیکن یہ اس زمانہ کے تمام سوانح نگاروں کا انداز ہے"۔

اسی سلسلہ میں ارشاد ہوتا ہے :-

"مصنفین اسلام آج کل کے فریب دہ طریقوں سے بالکل آشنا نہ تھے۔ آج کل کی سوانح نگاری کا انداز یہ ہے کہ حقیقت نگاری کے ظاہر کرنے کے لئے ہیرو پر نکتہ چینی کی جاتی ہے لیکن اس طرح کہ محاسن نہایت وسعت اور عمومیت کے ساتھ ہر پہلو سے دکھائے جاتے ہیں۔ پھر نہایت کمزور اور ضعیف الفاظ میں ایک آدھ اعتراض بھی کر دیئے جاتے ہیں جس سے دراصل مداحی کو اور قوت دینی مقصود ہوتی ہے کیونکہ اس سے یہ ظاہر کرنا منظور ہوتا ہے کہ مصنف نے واقعہ نگاری کے لحاظ سے کسی واقعہ کو چھپانا نہیں چاہا ہے اور اس لحاظ سے ممدوح کی چھوٹی سے چھوٹی برائی کا بھی ذکر کر دیا ہے، ورنہ ایسے محاسن اور خوبیوں کے مقابلہ میں ایک ذرا سی برائی بالکل نظر انداز کرنے کے قابل تھی۔ یہ طریقہ ہماری زبان کے سوانح نگاروں نے یورپ سے سیکھا ہے۔ اردو کی اعلیٰ سے اعلیٰ سوانح عمریوں کا یہی انداز ہے لیکن یہ طریقہ قدیم سے بہت زیادہ قابل اعتراض بلکہ خطرناک ہے قدیم طریقہ صرف سکوت کا مجرم تھا لیکن موجودہ طریقہ درحقیقت خیانت اور خدامی ہے جو واقعہ نگاری سے بمراحل دور ہے۔"

یقیناً ناظرین سمجھ گئے ہوں گے کہ شبلی کا اونے سخن کس طرف ہے۔ اردو اعلیٰ سے اعلیٰ سوانح عمری سے ممدوح کا مقصود کیا ہے؟ شیش محل میں بیٹھ کر اوروں پر پتھر پھینکنا ایک خوش ادائی سہی لیکن کیا دانائی بھی ہے؟ اس کا جواب صفحات زیر تحریر میں مل جائے گا۔ لیکن جلدی نہ کیجئے۔ اور سنیئے "مآثر رحیمی" کے ریویو میں ارشاد ہوتا ہے۔

"اس کتاب میں تمام خوبیوں کے ساتھ یہ بہت بڑا عیب ہے کہ "خانخانان"

کی خوبیاں ہی خوبیاں گنائی ہیں، نکتہ چینی کا نام نہیں، حالانکہ آج کل کے مذاق کے موافق سوانح عمری اور لائف کی یہ ضروری شرط ہے لیکن اس طریقہ کو ہم آج کل کے پُر فریب طریقہ سے زیادہ پسند کرتے ہیں۔ جس میں راست نویسی اور تنقید کا بہت کچھ دعویٰ کر کے بھی سوانح عمری کے بجائے مناقب کی کتاب نکلی جاتی ہے اور کوئی عیب اور وہ بھی خفیف کر کے لکھا جاتا ہے۔ تو اس غرض سے کہ محاسن کے یقین کرانے کے کام آئے یعنی جب عیب نہیں چھپایا ہے تو محاسن کیوں غلط لکھے ہوں گے۔ بہتر سے بہتر سوانح عمری جو ہماری زبان میں لکھی گئی ہے اس طریقہ کی عمدہ مثال ہے۔ ابھی اور دیکھئے۔

موازنۂ انیس و دبیر میں اسی خیال کا اعادہ یوں کیا گیا ہے۔

"ہمارے زمانہ میں جو سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں ان میں باوجود دعویٰ آزادی کے تنقید اور جرح سے بالکل کام نہیں لیا گیا۔ اور اس کا یہ عذر کیا جاتا ہے کہ ابھی قوم کی یہ حالت نہیں کہ تصویر کے دونوں رُخ اس کو دکھائے جائیں۔ لیکن عذر کرنے والے خود اپنی نسبت غلطی کر رہے ہیں۔ جس چیز نے ان کو اظہار حق سے روکا ہے۔ وہ ایشائی شخص پرستی ہے جس کا اثر رگ و پے میں سرایت کر گیا ہے اور عذر کرنے والوں کو خود اس کا احساس نہیں ہوتا۔ اس غلامانہ شخص پرستی سے ایک بڑا ضرر یہ ہے کہ جو لوگ ان اکابر کی تقلید کرتے ہیں ان میں ہزاروں ایسے ہوتے ہیں۔ جن کو خود نیک و بد کی تمیز نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ اچھی باتوں کے ساتھ اکابر کی غلطیوں کی بھی تقلید کرنے لگتے ہیں اور سلسلہ در سلسلہ تمام قوم میں اس کا اثر پہنچ جاتا ہے۔"

اخلاقی حیثیت سے مولانا کی نگاہ جس نکتہ پر بار بار پڑتی ہے اس کے اہم نتائج سے کون انکار کر سکتا ہے آپ دیکھیں گے ابھی تک اظہار خیال پر ایک نقاب پڑا ہے مگر یہ نقاب اس قدر رہ گئی ہے کہ باریک تاروں سے

چھن چھن کر چشمک کی شوخیاں آپ کے ذوق پر پردہ دری کو اکسا ئیں گی لیکن ذرا ٹھہرئے۔ اس کا حسن عریانی دیکھنے کے لائق ہے۔ یعنی اس وقت تک تعریحات کی جگہ صرف اشارات وکنایات تھے۔ اب صاف صاف سمجھئے بشبلی کہتے ہیں:۔

"حیات جاوید" میں مولینا حالی نے "سید صاحب" کی ایک رخی تصویر دکھائی ہے۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ کسی کے مصائب دکھانے تنگ خیالی اور بدطینتی ہے لیکن اگر یہ صحیح ہو تو موجودہ یورپ کا مذاق اور علمی ترقیاں سب برباد ہو جائیں پھر ایشیائی شاعری میں کیا برائی ہے سوائے اس کے کہ وہ محض دعویٰ کرتے تھے۔ واقعات کی شہادت پیش نہیں کرتے تھے بہر حال "حیات جاوید" کو مدلل مداحی سمجھتا ہوں"۔

اس پر بھی تسکین نہیں ہوتی، ایک دوست کو پھر لکھتے ہیں:۔

"اختلاف آراء بھی کیا چیز ہے "حیات جاوید" کو میں لائف نہیں سمجھتا بلکہ کتاب المناقب سمجھتا ہوں۔ اور وہ بھی غیر مکمل خیر الناس فیما یعشقون مذاھب"

یہاں یہ دلچسپ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "آج کل کا پرفریب طریقہ سوانح نگاری" جو شبلی کے خیال میں ایک طرح کی خیانت اور مداحی ہے اور جس پر یار دیار نہایت بیچینی کے ساتھ زور دیا گیا ہے دراصل حالی کی ایجاد ہے۔ یا شبلی کی تصنیفات بھی اس دائرہ میں آجاتی ہے تاریخ تنقید کا یہ ایک نہایت نازک نکتہ ہے جس پر مولینا سے اگر مزید روشنی ڈالی ہوتی تو دنیائے ادب کے لئے ایک جدید انکشاف ہوتا۔

اسی طرح حالی کی یہ صنعت گری جہاں یورپ کے طرز تحریر سے ماخوذ بتائی گئی ہے شبلی یہ بھی فرماتے ہیں کہ اس پُر فریب طریقہ سے جو ایشیائی شاعری سے ملتا

جلتا ہے "موجودہ یورپ کا مذاق اور علمی ترقیاں سب برباد ہو جائیں گی"۔ لٹریچر کی طرف سے مولانا کی اس فی الوقت دقیقہ رسی اور جوش التفات کا شکریہ، لیکن ایک نکتہ داں یہ سوال کر سکتا ہے کہ جس خطرے کا احتمال ظاہر کیا گیا ہے اس کے لحاظ سے مغربی زبان کی کوئی سوانح عمری ایسی دکھائی جا سکتی ہے جس میں محاسن کے ساتھ معائب ابھار کر دکھائے گئے ہوں۔ کم سے کم جتنی مستند کتابیں سیرۃ (لائف) کی حیثیت سے انگریزی زبان میں لکھی گئی ہیں وہ ڈاکٹروں کے دائرہ نظر میں ہوں گی لیکن افسوس ہے کہ "حیات جاوید" کی طرح کسی کتاب سے مولینا کی توقعات پوری ہوتی معلوم نہیں ہوتیں۔ یعنی ان میں ایسے مستقل ابواب نہیں ملتے جن میں یکے از اقوام جرائم پیشہ یا "باب الاشرار" کے عنوان سے کسی شخص کے حفظا غیب کا غیر ضروری خاکہ اڑایا گیا ہو۔

ایک ادیب معارضہ بالمثل کی حیثیت سے پوچھ سکتا ہے کہ ملحافظ فن حالی کے جس اختصار کی طرف نیک نیتی سے شبلی کا ذہن منتقل ہوا ہے خود ان کی تصنیفات میں یہ رعایت کہاں تک ملحوظ رکھی گئی ہے یعنی المامون، سیرۃ النعمان، الفاروق اور الغزالی میں انسانی کمزوریاں کس حد تک ابھار کر دکھائی گئی ہیں اس کا جواب مجھے خوف ہے غیر امید افزا ہوگا۔ کیا یہ علم النفس کی حق تلفی نہیں ہے جو ایک نکتہ سنج مورخ کے قلم سے ہو سکتی ہے کیونکہ عظمت خود "ملک کے سب سے بڑے مورخ" کے خیال کے مطابق واقعات کو بدل نہیں سکتی۔

بہر حال یہ کہا جا سکتا ہے کہ "حیات جاوید" کے بے حالی کی طرف سے اعتذار (اپالوجی) کی بالکل ضرورت نہیں ایک شریف نے ایک شریف تر انسان کی ہمدردانہ سرگزشت

لکھی اور آشنائے فن ہو کر لکھی۔ اور یہی اونچے سے اونچا معیار تحریر ہے جو ایمان بالغیب کی حیثیت سے یورپ کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے۔

یہ غلطی ہے کہ "حیات جاوید" کا رئیس التذکرہ فرشتہ نہیں تھا انسان تھا لیکن اس کے اخلاقی اوصاف اس کی اضطراری لغزشوں پر جنھیں انسانی کمزوری سمجھیے غالب تھے۔ یہی مابہ الامتیاز ہے جس کی بنا پر سوانح نگار کسی بڑے سے بڑے شخص کو دنیا کے سامنے پیش کر سکتا ہے۔ سرسید کی کمزوریاں جن کی بے نقابی پر شبلی کو اس قدر اصرار ہے اور جن کے اظہار میں حالی نے صرف بے دردی سے کام نہیں لیا، دراصل سرسید کی زندگی کے وہ عناصر ہیں جن کے بغیر انسانی اخلاق کی تکمیل ناممکن ہے لیکن اس قسم کی اخلاقی تصریحات کا بے ضرورت پھیلانا اور تنقیصی پہلو کا اس طرح نمایاں کرنا کہ اصلی محاسن دب دبا جائیں بالکل ایسا ہی ہوگا جس طرح "ندوہ" کے آخری مناقشات کو شبلی کی ادبی زندگی سے وابستہ کیا جائے جس پر مولینا کا سوانح نگار کبھی راضی نہیں ہوگا اور جسے شبلی کی علمی نفسیت (سائیکولوجی) سے دراصل کوئی تعلق نہیں ہے۔

یہ غور طلب ہے کہ "غالب" کی طرح "شبلی" کی افراط خودداری معاصرانہ کمالات کے اعتراف میں فیاض نہیں ہے شبلی نے "الکلام" لکھی لیکن سرسید کا نام تک نہ آیا۔ حالانکہ سرسید پہلے شخص ہیں جنھوں نے دور جدید میں مذہب کو معقولات عصریہ سے تطبیق دینے کی کوشش کی اور یہ امر بلا اختلاف ان کی اولیات میں محسوب ہونے کے لائق ہے ہم کو مصر کے مذہبی لٹریچر کی اوقات معلوم ہے اس لیے مصطلح جبہ و دستار کی فضیلت اسے اگر قطع نظر کر لیجیے تو سرسید اور ان کے رفقا نے جو کچھ لکھ دیا ہے مشکل ہے اس پر کچھ اضافہ ہو سکتا ہے اور سرسید کے اختراعی دماغ اور ان کے زبردست اجتہاد کا اتنا بڑا انکار نامہ ہے کہ عدم اعتراف دراصل

لٹریچر کی خوش ظرفی ہوگی۔ میں یہاں اس بحث کو چھیڑنا نہیں چاہتا کہ عقائد کو جو محض ذاتی چیزیں ہیں معقولات سے بغرانا جن پر ہمارے متکلمین کو اس قدر ناز ہے۔ دراصل کہاں تک "گول خانہ میں چوکھٹی چیز" کا مصداق ہے میرا منشا صرف یہ ہے کہ اس موضوع پر جو کچھ اس وقت لکھا گیا یا آئندہ لکھا جائیگا وہ محض سرسید کے قلم کی آواز بازگشت ہوگی۔ یہ دلچسپ سوال ابھی باقی ہے کہ حالی کے ہیرو کے ساتھ شبلی کو اس قدر چشمک کیوں ہے کیا یہ جامع حیثیات شخصیت شبلی کے ناموران اسلام کا رنگ پھیکا کرنے والی ہے؟ یا جس طرح ایک خوبصورت عورت دوسری پرکالۂ آتش کو دیکھ نہیں سکتی" دراصل جذبۂ رشک اس کی تہہ میں ہے ملک کے ایک بہت بڑے فاضل کی رائے کے مطابق سرسید کے بعد اگر اردو میں کوئی قلم اٹھا سکتا ہے تو وہ حالی ہیں اور اس میں کچھ شک نہیں کہ حالی نے سرسید کی صرف کثیر الاوراق لائف نہیں لکھدی بلکہ یہ اردو لٹریچر میں ایسا اضافہ ہے جو حالی کی ذات پر ختم ہو گیا لیکن کیا "شعر العجم" کے مصنف کو بھی اس پر رشک کرنا چاہئے اس کا جواب آگے چل کر تاریخ دیگی نہ جاننا کبھی کبھی جاننے سے زیادہ باکیف ہوتا ہے اس لئے سردست میں اس لطف کو کھونا نہیں چاہتا۔

لیکن شعر العجم کے ساتھ جو ایک ذوقی چیز ہے میری بڑھی ہوئی حسن عقیدت اس موازنہ کو جائز نہیں رکھے گی اس لئے حیات جاوید کے مقابلہ میں شبلی کی صرف ان تصنیفات کو رکھئے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے جنس مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں آجکل کی عوائد رسمیہ (ایٹی کیٹ) کی نظر اگرچہ شائستہ سوسائٹی میں موازنۂ اوصاف کو جائز نہیں رکھتیں۔ لیکن مصنفین کے دماغوں کی [illegible] فن تنقید کا ایک مستحسن گستاخانہ فرض ہے جس سے قطع نظر نہیں کیا جاسکتی اسلئے چشمک کے وہ عقدہ ہائے سربستہ جن میں حالی کے مقابلہ میں لائق عزت شبلی کا پہلو کچھ دبا ہوا سا ہے کھلے ہوئے راز کی حیثیت سے پیش کئے گئے ہیں۔

(حاشیہ اگلے صفحہ پر ہی)

قبل اسکے کہ میں اسے ختم کروں ایک فقرہ معترضہ بار طبیعت ہو رہا ہے جس سے اسی سلسلہ میں نپٹ لینا چاہتا ہوں چشمک کے متعدد نظائر جہانتک گنجائش تھی بہم پہنچائے گئے ہیں وراثت طبیعی کے اثر سے اسکا سلسلہ اور بڑھتا ہے ایک ادبی علمی کا نوجوان سید الطائفہ جسے آگے چل کر نظام ادبی کا ایک قوی تر عنصر ہونا ہے ایک غیر متعلق تصنیف کے سلسلہ میں یوں اظہار خیال کرتا ہے

اوپر میرے مخاطب صحیح وہ حضرات ہیں جو تنقیص و تنقید میں امتیاز نہیں کر سکتے یا کرنا نہیں چاہتے۔ نہ جاننا جہل چنداں لائق اعتراض نہیں لیکن یہ بھی نہ جاننا کہ نہیں جانتے (جہل مرکب) قطعاً لائق معافی نہیں۔ ایک بیباک نے حال میں لکھا تھا کہ شعر العجم براؤن کی "لٹریری ہسٹری آف پرشیا" کا سرقہ ہے شاید کہنا یہ منظور ہو کہ براؤن کی کتاب سے ماخوذ ہے لیکن غریب کو معلوم نہیں کہ براؤن نے فارسی شاعری کی تاریخ نہیں لکھی بلکہ در اصل وہ اسلامی لٹریچر کی دماغی تاریخ ہے ایران سے جو تعلق ہے یہ ہے کہ براؤن ان مصنفین کو الگ کر دیا گیا ہے جو اسلام کے وسیع دور میں خاک عجم سے وقتاً فوقتاً اٹھتے رہے۔ اس میں شعرا کا ذکر ضمناً آیا ہے وہ بھی تاریخی حیثیت سے ذوقی اور جذباتی حیثیت سے نہیں کہ براؤن کے بس کی بات نہیں تھی شعر العجم کا موضوع بالکل جدا گانہ ہے ہماری زبان پر فلسفہ، "ارتقا" در جانے کیا کیا سوچے سمجھے اس بری طرح چڑھ گیا ہے کہ خیر سے معلومات تو کچھ اضافہ ہوا نہیں لیکن ان الفاظ کی رہی سہی آبرو بھی جاتی رہی جس ملک میں تنقید عالیہ (ہائر کریٹی سیزم) کا مفہوم صحیح اچھے خاصے پڑھے لکھے نہ سمجھ سکتے ہوں میں نہیں جانتا شعر العجم کی نزاکتیں کس طرح ان کے ذہن میں داخل کی جائیں۔ مجبوراً میں اسی گناہ کا مرتکب ہوتا ہوں جس سے اوروں کو باز رکھنا مقصود ہے اور مجھ کو کہنا پڑتا ہے کہ شعر العجم تذکرۃ الشعرا نہیں بلکہ جہاں تک شاعری کی ماہیت کا تعلق ہے اسکی ارتقائی تاریخ ہے (دیکھئے ارتقا نا پایا ہی گیا)

جس طرح ماضی حال کا باپ اور مستقبل کا دادا ہے بعینہٖ دنیائے ادب میں بھی یہی ترتیب عمل جاری ہے۔ متقدمین نے متوسطین اور متوسطین نے متاخرین پیدا کئے بالفاظ غیر سعدی حافظ، فردوسی اور خیام جس زمانہ میں پیدا ہوئے اور جو کچھ ہوئے اسی زمانہ میں ان کا ہونا ناگزیر سا تھا۔ اسی طرح ان کے کلام کی عصری خصوصیات (باقی اگلے صفحہ پر)

قطعات تاریخ طبع کتاب ہذا

نیتجہ فکر رسا عالیجناب معلی القاب نواب حاجی سید محمد جعفر علیخاں صاحب بہادر
رئیس اعظم شمس آباد ضلع فرخ آباد

قطعہ

امسال پس شوہر انہ مرضی بانو لیس
مطبوع شد این نسخہ محبوب دل مہدی

در عیسوی و ہجری اے ماہر فن حاجی
میگوئے ہمیں سالش ہر عجوب دل مہدی

۵۸۲ ۱۳۴۱ھ

سنہ ۱۹۲۳ء

قطعہ

مطبوع[۱] ہوا ریاض[۲] مہدی
فردوسی طبع یوں ہے گلچیں

غنچہ نقطے ہیں پھول الفاظ
تاریخ ہے "گلشن مضامین"

سنہ ۱۳۴۱ھ

ملنے کا پتہ :- سلطان بک ڈپو کالی کمان حیدر آباد

۱ہ "مطبوع" ذو معنیین ہے۔
۲ہ "ریاض" جمع روضہ ہے مگر شعراء میں واحد مستعمل ہے۔

مولوی نذیر احمد بھی اس گناہ کے مجرم ہیں جس قلم نے مرآۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح ابن الوقت اور ایامیٰ لکھنے میں زندگی بسر کی ہو" وہ الفرائض، اجتہاد ترجمہ قرآن امہات الامۃ کے لئے سنجیدگی عبارت، متانت کلام اور ثقاہت بیان کہاں سے لائیگا مقصود یہ ہے کہ مذہبی کتابوں اور بزرگان دین کی تاریخ کے لئے سنجیدگی چاہئے شوخ اور ظریفانہ عبارات اور سخیف محاورات موزوں نہیں

یہ مولوی نذیر احمد کون ہیں؟ وہی جن کا تصنیفی نام عوام میں "ڈپٹی نذیر احمد" ہے! آہ آقائے اردو علامہ نذیر احمد ایل، ایل ڈی جو ملک میں السنہ مشرقیہ کا سب سے بڑا ادیب تھا۔ جسکی عربیت اس پایہ کی تھی کہ سخت سے سخت منحرف بھی اس کا لوہا مانتے تھے اور اس کے تبحر علمی سے مرعوب رہتے تھے جس نے اردو سی کم مایہ زبان کو اپنے خاص طرز ادا اور زور فصاحت سے ایسا کر دیا کہ آئندہ دنیا اس پر ادب العالیہ (کلاسیکس) کا اطلاق کرے گی جن کی طبیعت میں قدرت نے عربی کا مذاق اسلئے رکھا تھا کہ وہ عرب کے صحیفۂ آسمانی کا قالب بدل سکے، پہلے ترجمہ قرآن کا یہ رنگ تھا۔

"مستی نکالیتاں اور مکر کرتیاں چھپ کر"

اب وہ سستہ رفتہ اور فصیح اردو کا ایسا مرقع ہے جس پر انشا پردازی ناز کر سکتی ہے۔ نذیر احمد نے مراۃ العروس کے سوا اگر کچھ لکھا ہوتا جب بھی ان کے کمال انشا پردازی کے ثبوت کیلئے یہ اکیلی کتاب کافی تھی ہم کو یاد رکھنا چاہئے کہ وہ اس وقت ایک گراں پایہ مصنف تھے جب ہمارے لائق ادیب

دراصل انکے کمال اجتہاد سے زیادہ وراثت ادبی کے قدرتی نتائج ہیں شعر العجم نے اسی طلسم کی عقدہ کشائی کی ہے لیکن یہ باتیں ابھی نصف صدی کے بعد ہماری سمجھ میں آئیں آئینگی اسوقت تک اس کتاب پر اظہار خیال ملتوی رہتا تو اچھا تھا۔ شبلی تو کیا برادن کا خاکہ [illegible] ہیں گے لیکن ایک صاحب نے علی گڈھ میں بیٹھ کر ڈنکے کی چوٹ شاعری پر جس جامعیت کے ساتھ اظہار خیال کی ٹھہرائی "ایڈیٹر معارف" کے سنجیدہ قلم کو اعتراف کرنا پڑا کہ گویا شعر العجم ہے ایک چھونے سے لفظ کے زہر کو دیکھیگا جس کا تریاق سینکڑوں دفتر میں بھی نہیں ہو سکتا۔

بزرگوں میں بہتروں نے قلم ہاتھ میں نہیں لیے تھے۔ رہی ان کی ظرافت جوان ہی کا حصہ ہے اور
جیسے آپ کھانے میں نمک سمجھیے۔ ادب میں لٹریچر کے چہرے کا تبسم کہوں گا جو نئی تحقیقات کے مطابق
صرف خوش ادائی نہیں بلکہ اخلاقی پاکیزگی کے ساتھ کامل صحت کی دلیل ہے۔
صرف ایک مثال لیجیے۔ نزول قرآن کے سلسلہ میں نذیر احمد اپنے فصیح لکچر میں ایک جگہ کہتے ہیں:
"جن دنوں قرآن نازل ہوا ہے وہ ایک وقت تھا کہ عربی لٹریچر کے جوبن پر ایک بہار آ رہی
تھی لوگوں میں یہ مادہ ایسا برسر ترقی تھا کہ کوئی متنفس مذاق شعری سے خالی نہ تھا یہ تو عربی زبان
کے عروج کا زمانہ تھا یوں بھی عرب کو اپنی بولی پر بلا کا ناز تھا۔ انھوں نے اپنے سوا دوسروں کا
نام رکھا تھا "عجم" یعنی گونگے یا جن کو بات کرنے کا سلیقہ نہیں ایسے لوگوں سے کیسی ہی اچھی بات
کہی جاتی مگر وہ ہوتی حلیہ فصاحت سے عاری تو ان کے کان پر جوں بھی نہ چلتی بس ضرور تھا
کہ اسی داؤ سے ان کو پچھاڑا جائے جوان کو خوب دارد تھا یعنی "فصاحت" قرآن نازل ہوا۔
تو جو لوگ اپنے وقت کے "سرسید" "محسن الملک" "سید محمود" اور حالی و شبلی تھے سب کے چھکے
چھوٹ گئے"!
یہی بلاغت ہے کہ جس کی بنا پر کہا گیا ہے کہ انشا پرداز کا ایک فقرہ ہزاروں علمی
اور تاریخی اوراق پر بھاری ہوتا ہے اور یہی تصرفات ہیں جن کے لحاظ سے ایک ادیب
کو بڑے سے بڑے فلسفی اور مورخ پر ہمیشہ ترجیح رہے گی۔
یہی بلاغت تھی جس نے کسی زمانہ میں "حیدرآباد دکن" کے بیمار کو نذیر احمد کا شیدائی
بنا رکھا تھا۔ "سرسالار جنگ اول اسٹیٹ ڈنر میں طلائی قابوں کا دور چل رہا ہے چھری کانٹوں
کی جھنکار ہو رہی ہے دفعتاً سرکاری ڈاک کے آنے کی اطلاع ہوتی ہے ارشاد ہوتا ہے نذیر احمد
کی منشی ملاحظت ہوتو تو پیش کی جائے۔ ایک منٹ کے بعد ملتی الفقہ صاحب کے ہاتھ میں

ایک کاغذ ہوتا ہے برقی روشنی کی جگمگاہٹ میں شائق ادب امیر الامرا کی نگاہ نقوش حرفی پر دوڑ رہی ہے اور چہرے پر رہ رہ کر کیفیت طاری ہوتی ہے جیسے تبسم زیر لب کی ہلکی لہریں کہئے نذیر احمد کے خوان ادب کا یہ لقمۂ تر تھا جس سے شاہی میز بھی بے نیاز نہ رہ سکی لیکن اب یہ ہمارے گلے میں پھنسنے لگا ہے جیسے ہم اگلنا چاہتے ہیں مگر بے نمکی روایات سابقہ کے لحاظ سے کچھ پھیک نہیں معلوم ہوتی۔ ادب چاہتا ہے ان کا کمال انشا پردازی غیر شائستگی جنبش لب سے ہمیشہ بے نیاز رہے گا۔

آخر میں مجھے ایک نکتہ صاف کرنا ہے یعنی حالی کے ساتھ شبلی کی چشمک کے جو شواہد پیش کئے گئے ہیں۔ ان سے کوئی صاحب یہ نہ سمجھیں کہ شبلی کو حالی سے خلوص نہیں تھا شبلی حالی کو ہمیشہ عزت کے ساتھ یاد کرتے تھے فرمایا کرتے تھے کہ جب تک مواد تحریری نہ ہو میں ایک قدم بھی چل نہیں سکتا مگر حالی کی نکتہ آفرینی اس کی محتاج نہیں ان کی دقیق رس اور نکتہ سنج طبیعت بسی جگہ سے مطلب نکال لاتی ہے جہاں ذہن بھی منتقل نہیں ہوتا۔ اور یہ کہاں اجتہاد کی دلیل ہے۔ پانوں کے واقعہ کے بعد شبلی کو حالی نے دفور جوش میں جو رباعی لکھ کر بھیجی تھی اور جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے شبلی "الندوہ" میں مولٰنا حالی کی ذرہ نوازی" کے عنوان سے یوں رقمطراز ہیں:۔

مولانا کا میری نسبت ایسے خیالات ظاہر کرنا محض ان کی ذرہ نوازی ہے وہ میرے احباب میں شامل ہونے کا ننگ گوارا فرماتے ہیں لیکن میری عزت یہ ہے کہ مجھ کو اپنے نیازمندوں کے زمرہ میں شامل ہونے کی اجازت دیں۔ اب چند ہی ایسی صورتیں باقی رہ گئیں جن کو دیکھ کر قدما کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ خدا ان بزرگوں کا سایہ قائم رکھے۔"

بہر حال "چشمک" جو کچھ تھی ادبی حیثیت سے تھی۔ نجی کے تعلقات دونوں صاحبوں کے اتنے ہی خوشگوار تھے جتنے باوصف اختلاف وکلائے مقدمہ کے اجلاس سے باہر ہوا کرتے ہیں ان

چند صفحوں میں خصائص نفسی کے مختلف رخ سامنے آگئے ہیں۔ ورنہ میری غایت محض تنقیط ادب یعنی احباب کی دماغی تفریح کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس حیثیت سے اردو لٹریچر میں غالباً یہ ایک نیا مضمون[1] ہے

(معارف ۱۹۱۹ء)

---

[1] اس مضمون میں جس قدر اقتباسات لئے گئے ہیں ان کے لئے اردو لٹریچر کے عناصر خمسہ (سرسید، آزاد، نذیر احمد، حالی اور شبلی) کا پورا دفتر پیش نظر تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ سلسلہ اقتباس میں میں نے صفحات متعلق کے حوالے محفوظ نہیں رکھے۔ ختم کرنے کے بعد اس کا خیال آیا۔ اب یہ ایک دردسری تھی جسے کسی طرح گوارا نہیں کرسکا تاہم میں یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اس پیوندکاری میں میں نے کہیں سے کوئی تصرف یا اضافہ نہیں ہے۔ اور جس قدر اجزا جہاں جہاں سے لئے گئے ہیں، علامات اقتباس میں بجنسہ پیش کر دیئے گئے ہیں جن میں کوئی گھٹ بڑھ نہیں ہونے پائی ہے۔

اردو کے ایک نامور ادیب کی وفات

(نوشتہ :- جناب مولوی عبدالماجد صاحب بی۔اے، مولف "فلسفۂ جذبات")

ہر زبان کے بعض ادیب (انشاپرداز) ایسے ہوتے ہیں جن کا رقبۂ تحریر گو محدود و مختصر ہوتا ہے، تاہم ان کا وجود اس زبان و ادب کے لیے مایہ ناز ہوتا ہے۔

ایم مہدی حسن (افادی الاقتصادی) کے نام کے ساتھ آج "مرحوم" لکھتے ہوئے قلم کا جگر شق ہوا جاتا ہے۔ اسی قبیل کے بزرگوں میں تھے۔ شاید ابھی تک بہت کم لوگوں کو اطلاع ہو کہ اردو کا یہ نامور ادیب ۲۱ر نومبر ۱۹۲۱ء کو ہمیشہ کے لیے اس جہان فانی سے رخصت ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیہِ رَاجِعُونَ،

مرحوم نے کوئی مستقل تصنیف یا تالیف اپنی یادگار نہیں چھوڑی ہے۔ ایک زمانہ میں جرمن مستشرق وان کریمر کی تاریخ اسلام کا اردو ترجمہ شروع کیا تھا۔ اور کچھ اجزا مخزن (لاہور) میں شائع کیے تھے مگر تمام کرنے کی نوبت نہ آئی۔ مرحوم کی تصنیفی زندگی کی کل کائنات وہ چند مضامین ہیں جو وقتاً فوقتاً صلائے عام (دہلی) نقاد (آگرہ) علی گڑھ منتھلی، اور معارف اعظم گڑھ وغیرہ میں تحریر فرمائے تھے۔ ان مضامین کا مجموعہ گو حجم میں قلیل ہے لیکن ادبیت میں اسی نسبت سے ممتاز و بلند ہے۔

جناب، مہدی، ادب و انشا کا ایک غیر معمولی ذوق سلیم لے کر آئے تھے سرکاری ملازمت کے ہجوم افکار میں بھی ان کا ذہن جدید الفاظ و جدید تراکیب کی وضع و تراش میں

لگا رہتا تھا۔ فارسی، اور اردو کے پاکیزہ لٹریچر کے عاشق تھے ان کا کتب خانہ
ان تینوں زبانوں کے بہترین لٹریچر کا عطر تھا۔ اردو لٹریچر انشا میں کسی کے پیرو نہ تھے خود
ایک مخصوص طرز (اسٹائل) کے موجد تھے جو بظاہر ان ہی کے ساتھ ختم بھی ہو گیا۔

قاموس الاسلام، فلسفہ حسن و عشق، نقد شعر العجم، حالی و شبلی کی معاصرانہ چشمک
شبلی سوسائٹی، ادب اردو کے عناصر خمسہ وغیرہ ان کے مضامین ادب اردو کا مذاق صحیح
رکھنے والوں کی نظر میں ایک مستقل زندگی رکھتے ہیں جو وقتی مقبولیت و ہنگامی گرمجوشی
سے بلند و برتر ایک شئے ہے، اردو لٹریچر نویسوں کی صف اول میں عموماً ایسے حضرات نکلیں گے
جنہوں نے اپنا اصل موضوع تحریر تاریخ یا فلسفہ یا موعظت رکھا ہے اور ادب سے
محض حاشیے کا کام لیا ہے لیکن مرحوم مہدی خالصتہً ادب کے شیدائی تھے ان کی تحریریں
اس شئے کا نمونہ ہوتی تھیں جس کے لئے انگریزی میں بھی کوئی موزوں لفظ موجود نہیں، البتہ
فرنچ میں اسے "بل لیٹر" کہتے ہیں۔ اردو میں خود مہدی مرحوم سے ادب عالیہ کہتے تھے۔

مرحوم اردو کے تمام مشاہیر مصنفین سے تعلق ارتباط رکھتے تھے مولانا شبلی کے
ساتھ یہ تعلق خاص طور پر گہرا تھا ادھر سے بھی ان کے ساتھ دلی شیفتگی تھی۔ فرمایا کرتے
تھے کہ نثر لکھنے والوں میں ادبی حیثیت سے کوئی مہدی کے پاسنگ برابر بھی نہیں ایک
مکتوب میں ان کے ایک مضمون کی داد ان لفظوں میں دیتے ہیں۔

"کاش شعر العجم کے مصنف کو ایسے دو فقرہ بھی لکھنے نصیب ہوتے (مکاتیب
شبلی جلد ۲، صفحہ ۲۵۹)

ایک دوسرے مکتوب میں ان کے ایک مضمون کا ذکر فرماتے ہیں۔
"مضمون دیکھا، نیچے مہدی حسن کے دستخط تھے حیرت ہوتی کہ یہ وہی مرزاپوری دوست

ہیں یا نذیر احمد و آزاد کی دو روحوں نے ایک قالب اختیار کیا ہے۔ کئی دن تک دیکھتا رہا

احباب کو دکھلاتا رہا۔" (ص ۲۲۸)

جو لوگ مولانا شبلی کے معیار نقد کی بلندی سے واقف ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ ان کے قلم سے ایسی ادا کا نکلنا کتنی بڑی بات ہے۔

مزاج میں لطافت و نفاست حد سے زیادہ تھی۔ کاغذ، کتاب، لباس، غذا ہر شے اعلیٰ سے اعلیٰ چاہتے تھے۔ بیش قیمت سوٹ پر خفیف سی شکن بھی گوارا نہ ہوتی تھی۔ کتاب خریدتے تو اس کی جلد بندی میں وہ اہتمام کرتے جو خود مصنف سے بھی نہ بن پڑتا۔ آمدنی کا بیشتر حصہ ان ہی تکلفات کی نذر ہو جاتا۔ مکان کی ایک ایک چیز خوش سلیقگی و نفاست کا نمونہ ہوتی تھی۔ ارباب ذوق کے لئے ان کے مضامین سے بھی بڑھ کر قیمتی ان کے خطوط ہوتے تھے۔ ایک ایک سطر ادب و انشاء کی جان ہوتی تھی۔ اپنی بصیرت و علم کے مطابق کہہ سکتا ہوں کہ دور موجودہ کے ادیبوں میں شاید بلا استثناء کسی کے بھی خطوط اس قدر دلچسپ و پر لطف نہیں ہوتے تھے جن خوش نصیبوں سے سلسلہ مراسلت قائم تھا وہ شوق و اشتیاق کے ساتھ جدید مکتوب کے منتظر رہتے۔ اور پچھلے گرامی ناموں سے ہفتوں لطف اندوز ہوا کرتے۔

وطن گورکھپور تھا، زیادہ تر الہ آباد میں ملازم رہے۔ اب ادھر کئی سال سے ضلع کانپور کی ایک تحصیل میں تحصیلدار تھے۔ انگریز افسر نے انگریزی دانی کی بارہا داد دی، جرمنی کے شاہزادہ ولیعہد جب سیاحت کے لئے ہندوستان وارد ہوئے تو الہ آباد میں ان کے قیام وغیرہ کے انتظامات میں مرحوم مہدی نے بھی کام کیا۔ اور حسن خدمت و خوش سلیقگی کے اعتراف میں ایک طلائی تمغہ بھی جرمن شہزادہ کے ہاتھ سے پایا۔

صحت کا بہت خیال رکھتے تھے۔ بیمار شاذونادر ہی ہوتے تھے۔ گذشتہ اگست میں
بیمار ہوئے سوء تنفس و ورم جگر تجویز ہوا۔ ستمبر سے لکھنؤ میڈیکل کالج میں علاج کے لئے
مقیم ہوئے۔ درمیان میں طبیعت بہت سنبھل گئی تھی۔ ۱۶ ر نومبر کو یعنی وفات سے چھ روز
پیشتر میں ملا تھا۔ اس وقت بہت افاقہ تھا۔ البتہ ضعف بے انتہا تھا حسب معمول
خندہ روئی و زندہ دلی کے ساتھ مختلف ادبی، قومی، ذاتی معاملات پر گفتگو فرماتے
رہے۔ معارف و دار المصنفین کے حالات تفصیل سے پوچھتے رہے۔ مولینا سید سلیمان
مولوی عبدالسلام، مولوی عبدالباری ایک ایک کے حالات بڑے اشتیاق سے
دریافت کئے۔ دوران گفتگو میں کہا کہ "بعد صحت سب سے پہلے اعظم گڈھ ہی کا قصد کرونگا۔"
اس وقت یہ کسے خبر تھی کہ ایک ہفتہ کے اندر سفر آخرت درپیش ہو جائے گا۔
عمر پچاس کے اندر تھی اور صورۃً چالیس سے زائد نہیں معلوم ہوتے تھے۔ امید
تھی کہ پنشن کے بعد ساری فرصت اردو ادب کی خدمت گذاری میں صرف کریں گے۔
قبل اس کے کہ یہ فرصت نصیب ہو، خود کشمکش حیات ہی سے فرصت حاصل ہو گئی
آہ! جس وقت یہ خیال آتا ہے کل تک جو جسم زیبائش و آراستگی کی تصویر تھا اور جس کی
ایک ایک سانس لطافت و نفاست کی عطر بیزیوں میں بسی ہوئی تھی وہ آج ایک تیرہ و تار
گڈھے میں ایک مہیب تودہ خاک کے نیچے دبا پڑا ہوا ہے تو ہم غافلوں کا بھی دل عبرت
سے لرز جاتا ہے۔
لیکن نہیں! جو اس وقت زیر زمیں ہے وہ تو مہدی کا اترا ہوا محض ایک جامۂ
کثیف ہے اور خود مہدی اپنے جوہر لطیف کے ساتھ گلگشت جناں میں مصروف ہے۔
مرنے والے مہدی الوداع! اور ایک نامعلوم مدت کیلئے الوداع! تیری

زندہ دلی، تیری بذلہ سنجی، اور تیرا خلوص، زندگی میں دوسروں کے لیئے سامان لطف وانبساط تھا۔ مرنے کے بعد تیری نیکیاں، تیری خوبیاں، اللہ کا فضل وکرم تیرے حق میں آیہ رحمت و مایۂ انشراح ثابت ہوں۔

صورت از بے صورتی آمد بروں
باز شد اِنّا الیہ راجعون؁

(منقول از ہمدم لکھنؤ)

قطعات تاریخ رحلت

نتیجہ طبع وقاد جناب معلی القاب نواب حاجی سید محمد جعفر علیخاں صاحب بہادر
رئیس اعظم شمس آباد ضلع فرخ آباد

لا تقنطوا من رحمۃ اللہ ۔ انہ رحیم و ودود

۳۱ ۵۶۶ ۹۰ ۴۵۳ ۶۶ ۶۵ ۲۵۸ ۲۰

۱۰۰۶ سنہ ۱۳۴۰ھ ۳۳۴

قطعہ

نثار اردو شوخ طبع وخوش مزاج ۔ شیریں زباں، معجز بیاں، دانائے فن
بست ربیع اولیں امسال شد ۔ زیب جناں، رنگیں سخن، مہدی حسن

۱۰۴۱۹ ۳۰ ۲ ۷ ۱۱۸۵۹

سنہ ۱۳۴۰ھ

قطعہ

نثار اردو نکتہ رس پاکیزہ دل عالی دماغ ۔ شیریں زباں معجز بیاں، دانائے فن نیکو اساس
بست ربیع اول و ماہِ نومبر بست و یک ۔ زیب جناں رنگیں سخن، مہدی حسن معنی شناس

۱۲۳ ۱۰۴۰ ۱۷۷ ۵۸۱

سنہ ۱۳۴۰ ۵۸۱ ۔ سنہ ۱۹۲۱ء

افادات مہدی